خاتونِ اسلام

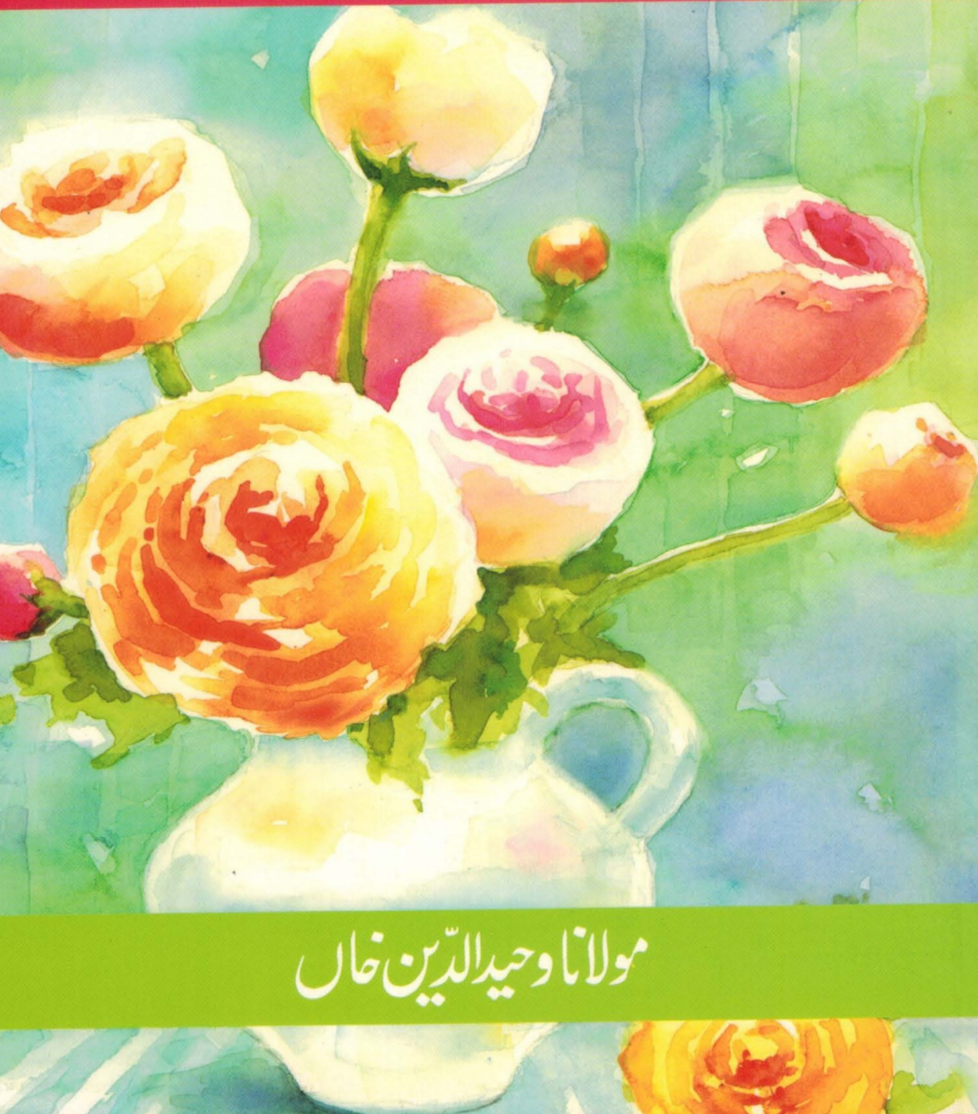

مولانا وحید الدّین خاں

خاتونِ اسلام

مولانا وحید الدین خاں

Khatoon-e-Islam
By Maulana Whiduddin Khan
First Published in 1987
Reprinted 2024

This book is copyright free and royalty free. It can be translated, reprinted, stored or used on any digital platform without prior permission from the author or the publisher. It can be used for commercial or non-profit purposes. However, kindly inform us about your publication and send us a sample copy of the printed material or link of the digital work.

Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
e-mail: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
e-mail : info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

دیباچہ 7

باب اوّل

ایک جائزہ 14
چند مثالیں 16
ایک عملی ضرورت 20
عورت کے بارے میں توہمات 21
تجرد کا معاملہ 26
فطرت کا نظام 29
قانونِ توازن 31
انحراف کا نقصان 33
مرد اور عورت کا مسئلہ 35
مرد اور عورت کا فرق 39
بنیادی فرق 44
عورت کی بے بسی 48
ایڈز کی لعنت 54
عورت معاشرہ میں 62
عورت کا درجہ اسلام میں 64
عورت جدید تہذیب میں 66
غیر فطری مساوات 67
عریانیت کا مسئلہ 71
بے قیدی کے نتائج 74
کم سِن مجرمین 75
مغربی عورت 79
فطرت کا فیصلہ 105
فطرت سے جنگ 108
چند مثالیں 111
شادی نہ کرنا غلطی 111
اچھی بیوی بنو 113
ناکامی کا اعتراف 114
صرف مسائل پیدا ہوئے 115
لذتیت کا انجام 117
خودکشی کرلی 118
مجھ سے دور رہو 120
شہرت بوجھ بن گئی 121
میدانِ عمل سے محرومی 122
جاپان کی مثال 125
تہذیب جدید کے نتائج 127
اُلٹی طرف سفر 128
مایوسی کا شکار 132
دردناک انجام 136
مصنوعی مسائل 139
مناکحت نہ کہ مسافحت 141

غیر فطری مساوات کا نتیجہ 145

جدید عورت کی مظلومی 148

ایک حدیث 151

پاکبازی کی اہمیت 152

مصنوعی اولاد کا مسئلہ 154

غلطی کا اعتراف 157

مغربی شادیوں کا انجام 158

آبادی کا مسئلہ 160

سرپرستی سے محروم 160

خاتون سنگر کی موت کے بعد 163

فطرت سے دور ہو کر 164

بے قیدی کا تجربہ 168

خاتون لیڈر کا اعتراف 169

دو مثالیں 174

ناقابل اعتماد کردار 176

ایک مثال 177

اجرتی ولادت 181

ترقی کے بجائے تنزل 182

باب دوم

قرآن وحدیث 186

آیات 186

احادیث 188

مومنہ کی صفات 195

تقسیم کار کا اصول 196

ایک آیت 197

خواتین اسلام کی مثال 201

عورت کا احترام 204

احادیث 207

جدید تحقیقات 209

چیف جسٹس کا ریمارک 211

خلاصہ 213

خط وکتابت 215

عورت کا درجہ 218

عہدِ زندگی 219

ہر حال میں خیر ہے 220

عورت مرد سے زیادہ قابلِ احترام 220

اظہار خیال کی آزادی 221

گھر سنبھالنا کم تر درجہ کا کام نہیں 222

معاشرہ کی تعمیر میں عورت کی اہمیت 223

عورت کی حاکمیت 224

عورت کی گواہی 227

اضافی خصوصیت نہ کہ فضیلت 228

نادانی کا کلمہ 230

خواتینِ اسلام 232

دو خواتین 233

بہترین رفیقہ حیات	236
کامل آزادی	238
تقسیم کار	239
علم اور خاتون	242
اسلامی حوصلہ	243
جنّت کے لیے صبر	244
میدان عمل میں	245
عورت کا مقام	247
عورت ہر میدان میں	248
خدا کی مدد	250
گھر کے باہر	253
عورت کا مقام	254
تجربہ کی زبان میں	256
باب سوم	
زوجین کے حقوق	266
شریکِ حیات	268
دینِ فطرت	269
عورت کے مقابلہ میں مرد کی حیثیت	269
مہر	270
نفقہ	271
حسن سلوک	272
عورت کی ذمہ داریاں	273
اطاعت	274
راز کی حفاظت	275
گھر کا انتظام	276
بہترین عورت	277
ظاہر سے زیادہ باطن کو دیکھنا	278
متوازن تعلیم	280
نکاح وطلاق	284
طلاق کا حکم	285
طلاق کی دو صورتیں	286
ایک واقعہ	289
متاع کا مطلب	290
مزاجِ شریعت	291
طلاق کے بعد	292
تہذیب جدید کا مسئلہ	294
ہندستان کا تجربہ	300
جہیز کے بارے میں	301
فاطمہ کا جہیز	302
چند ضروری سامان	303
اصل عطیہ	304
سنّتِ رسول نہیں	305
مہر کا مسئلہ	307
مہر معجّل	308
مہر مؤجّل	310
فقہاء کی رائے	311

زیادہ مہر نہیں	312
غیر افضل طریقہ	314
صحابہ کی شادی	315
غلط رواج	317
پردہ کا حکم	319
اضافۂ مترجم	327
تجرباتی تصدیق	330
کامیاب ازدواجی زندگی	333
دو مثالیں	334
یقینی حل	336
غیر مشترک نظام	340
ذہنی مسائل	341
تعدّدِ ازواج	344
تعداد کی نابرابری	345
عورت کی رضامندی	348
مسئلہ کا حل نہ کہ حکم	351
غیر قانونی تعدد ازواج	352
اسلامی طریقہ	353
خلاصۂ کلام	355
حرف آخر	356
اصل مسئلہ باشعور بنانا	357
تاریخ ساز کارنامہ	359
معیار کی غلطی	363

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

انگریز مستشرق ایڈورڈ ولیم لین (1876-1801ء) نے قرآن کے منتخب حصوں کا انگریزی ترجمہ تیار کیا تھا۔ یہ ترجمہ پہلی بار لندن سے 1843 میں چھپا۔ اس ترجمہ کے ساتھ ایک دیباچہ شامل تھا۔ اس دیباچہ میں فاضل مترجم نے اسلامی تعلیمات کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کا تباہ کن پہلو عورت کو حقیر درجہ دینا ہے:

> "The fatal point in Islam is the degradation of woman." (Edward William Lane, *Selections from Kuran*. London 1982. p. XC [Introduction])

یہ بات اتنی عام ہوئی کہ ہر شخص بے تکلف اس کو دہرانے لگا۔ اس بیان پر اب تقریباً ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں مگر ابھی تک لوگوں کے یقین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہندستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر وائی وی چندر اچوڑ نے محمد احمد — شاہ بانو کیس میں1975 میں جو فیصلہ دیا ہے اس میں بھی اس بیان کو اس طرح بے تکلف دہرایا گیا ہے جیسے کہ وہ کوئی مسلّمہ حقیقت ہو۔

عورت کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو درجہ گرانے (degradation) سے تعبیر کرنا اصل بات کو بگاڑ کر پیش کرنا ہے۔ عورت کے بارے میں اسلام کا کہنا یہ نہیں ہے کہ وہ مرد سے کم ہے۔ اسلام کا کہنا صرف یہ ہے کہ عورت مرد سے مختلف ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مقابلے میں فرق کا معاملہ ہے، نہ کہ ایک کے مقابلے میں دوسرے کے بہتر ہونے کا:

"Not better, but different."

ایک ڈاکٹر اپنے مریض سے کہتا ہے کہ — آنکھ تمہارے جسم کا نہایت نازک حصّہ ہے۔ تم اپنی آنکھ کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کر سکتے جو، مثال کے طور پر، تم اپنے ناخن کے ساتھ

کرتے ہو۔ اپنی آنکھ کے معاملہ میں تم کو زیادہ محتاط رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر کی اس ہدایت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ناخن کے مقابلہ میں آنکھ کو کمتر درجہ دے رہا ہے۔ بلکہ وہ ناخن کے مقابلے میں آنکھ کے فرق کو بتا رہا ہے۔

عورت اور مرد کے بارے میں اسلام میں جو قوانین ہیں، وہ سب اسی اصولی حقیقت پر مبنی ہیں کہ عورت اور مرد دو الگ الگ صنفیں ہیں۔ تخلیقی اعتبار سے دونوں کے اندر قطعی فرق پائے جاتے ہیں۔ اس لیے خاندانی اور سماجی زندگی میں دونوں کا دائرۂ عمل ایک نہیں ہوسکتا۔ جب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی بناوٹ کے اعتبار سے فرق ہے تو ان کے درمیان عمل کے اعتبار سے بھی لازماً فرق ہونا چاہیے۔

عورت کے بارے میں یہی تمام آسمانی مذاہب کا نقطہ نظر رہا ہے۔ پچھلی ہزاروں برس کی تاریخ میں کبھی اس پر شبہ نہیں کیا گیا۔ دورِ جدید میں آزادیِ نسواں کی تحریک (Women's Liberation Movement) نے پہلی بار دنیا میں یہ ذہن پیدا کیا کہ عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں اور دونوں کو ہر میدان میں بالکل یکساں کام کے مواقع ملنے چاہئیں۔

یہ تحریک سب سے پہلے برطانیہ میں اٹھارھویں صدی میں اٹھی۔ اور اس کے بعد پورے یورپ اور امریکہ میں پھیل گئی۔ میری وولسٹون کرافٹ (Mary Wollstonecraft) نے 1792ء میں ایک کتاب چھاپی جس کا نام تھا:

A Vindication of the Rights of Women

اس کتاب کا خلاصہ یہ تھا:

> "Women should receive the same treatment as men in education, work opportunities, and politics and that the same moral standards should be applied to both sexes." (*Encyclopedia Britannica*, X/733)

تعلیم، روزگار اور سیاست کے میدان میں عورتوں کو وہی مواقع ملنے چاہئیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ ایک ہی اخلاقی معیار ہونا چاہیے جو دونوں صنفوں پر منطبق کیا جائے۔ اس بات کو اتنے زور وشور کے ساتھ اٹھایا گیا کہ ہر طرف اس کا غلغلہ برپا ہو گیا۔

مرد اور عورت دونوں اس میں یکساں طور پر شریک تھے۔ حتی کہ عورت اور مرد کے درمیان نابرابری کی بات کرنا پس ماندگی کی علامت قرار پایا۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ فکر ساری دنیا میں چھا چکا تھا۔ اب اسی کے مطابق قوانین بنائے گئے۔ اسی کے مطابق ہر شعبہ مردوں کی طرح عورتوں کے لیے کھول دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

مگر عملاً یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے۔ تقریباً دو سو سالہ جدوجہد کے بعد بھی اب تک عورت کو مرد کے برابر کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ عورت آج بھی تمام شعبۂ حیات میں اسی طرح پیچھے ہے جس طرح وہ آزادیِ نسواں کی تحریک سے پہلے پیچھے تھی۔ اس تحریک کا عملی نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ عورت گھر سے باہر آ گئی۔ وہ ہر جگہ مردوں کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔ عورت نے اپنی نسوانیت کھو دی مگر اس کی قیمت میں اس کو وہ چیز نہیں ملی جس کے لیے اس نے اپنی نسوانیت کھوئی تھی۔ یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے برابر مقام۔

آزادیِ نسواں کی تحریک کی اس مکمل ناکامی نے دوبارہ لوگوں کو اس مسئلہ کی تحقیق پر آمادہ کیا۔ ساری دنیا میں خالص سائنسی انداز میں اس کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ آخر کار یہ ثابت ہوا کہ عورت اور مرد کے درمیان تخلیقی فرق ہے۔ یہی تخلیقی فرق وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر عورت کو زندگی کے شعبوں میں مرد کے برابر درجہ نہ مل سکا — عورت کے بارے میں دینی نقطۂ نظر کو جھوٹے فلسفوں نے مشتبہ بتایا تھا، سائنس کے حقائق نے دوبارہ اس کو ثابت شدہ بنا دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ عورت اور مرد کے بارے میں دینی نقطۂ نظر ہی صحیح نقطۂ نظر ہے، اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ آج بھی لوگ اسی پرانی بات کو دہراتے

ہیں۔آج بھی اسلام پر یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ اس نے عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔

ہندستان میں حکومت کے خرچ پر یہ اسکیم شروع کی گئی ہے کہ مجاھدین آزادی (freedom fighters) کی آوازوں کو ریکارڈ کرلیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں ان کے خیالات کو ان کی اپنی آوازیں سن سکیں۔اس سلسلہ میں مسٹر ایس ایم جوشی کے انٹرویو کا خلاصہ اخبارات میں آیا ہے جن کی عمر ریکارڈنگ کے وقت 72 سال ہوچکی تھی۔انھوں نے اپنے انٹرویو میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک اخبار (ٹائمس آف انڈیا، 6 اپریل 1976) کے الفاظ میں یہ تھی:

> "The Shariat of the Muslims and the Manusmriti of the Hindus—followed by both the communities for centuries—were equally and socially reactionary."

مسلمانوں کی شریعت اور ہندوؤں کی منوسمرتی جس کو دونوں فرقے صدیوں سے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یکساں طور پر اور سماجی طور پر رجعت پسند ہیں۔

اس طرح کی باتیں جو آج بھی بڑے پیمانہ پر کہی جارہی ہیں، ان پر جھنجھلانے کے بجائے ہمیں ان کے سبب پر غور کرنا چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ عورت اور مرد کے فرق کے بارے میں جدید نظریہ ابھی تک صرف علمی تحقیق ہے، وہ ابھی تک فکری انقلاب نہ بن سکا۔اس دنیا کا قاعدہ ہے کہ کوئی نقطۂ نظر خواہ وہ کتنا ہی مدلل ہو، وہ لوگوں کے درمیان اس وقت تک عمومی قبولیت حاصل نہیں کرتا جب تک اس کو فکری انقلاب کا درجہ نہ دے دیا جائے۔

پچھلے زمانے میں جو انبیاء آئے۔ان میں سے ہر نبی توحید کو دلائل کے اعتبار سے ثابت شدہ بناتا رہا۔اس کے باوجود یہ ممکن نہیں ہوا کہ شرک کا خاتمہ ہو اور توحید کو عمومی غلبہ حاصل ہو جائے۔ یہ دوسرا کام صرف اس وقت ہوا جب کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے

اصحاب اٹھے اور اللہ کی خصوصی مدد کے ذریعہ توحید کی حقانیت کو فکری انقلاب کے درجہ تک پہنچا دیا۔

اسی طرح موجودہ زمانے میں بھی ایک فکری انقلاب درکار ہے۔ علم جدید نے اس کے حق میں استدلالی بنیاد فراہم کر دی ہے۔ اب ضرورت یہ ہے کہ اہلِ دین اس مہم کو آگے بڑھائیں اور اس کے حق میں ضروری جدوجہد کرکے اس کو عالمی فکری انقلاب کے درجہ تک پہونچا دیں۔ اگلی سطروں کا مقصد یہی ہے کہ لوگوں کو اس تاریخی جدوجہد کے لیے اٹھنے پر آمادہ کیا جا سکے۔

وحید الدین

19 ستمبر 1976

باب اوّل

ایک جائزہ

سر جیمز جینز (1877-1946) کی ایک کتاب ہے جس کا نام انھوں نے پُراسرار کائنات (The Mysterious Universe) رکھا ہے۔ یہ موجودہ کائنات کی صحیح ترین تعبیر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری محدود عقل کی نسبت سے پوری کائنات ایک پُراسرار کائنات ہے۔ انسان اپنی عقل سے صرف قیاسات قائم کرسکتا ہے، وہ اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔

کائنات کی اسی پراسراریت نے قدیم زمانے میں وہ چیز پیدا کی جن کو اب خرافات (Myths) کہا جاتا ہے۔ انسان نے محض قیاس وگمان کے تحت بہت سے فرضی عقیدے بنا لیے۔ یہ قیاسات بڑھتے رہے یہاں تک کہ پوری انسانیت پر چھا گئے۔

ہر زمانے میں انسان کا ایک نظامِ عقائد ہوتا ہے۔ اسی نظامِ عقائد کے مطابق اس کی سوچ اور اس کے عمل کا نقشہ بنتا ہے۔ قدیم زمانہ میں عقائد کا یہ نظام اوہام وخرافات (Myths) پر قائم تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں پہلی بار انسان کا نظامِ عقائد بدلا اور اوہام کے بجائے حقائق کو اہمیت دی جانے لگی۔ یہ انقلاب اسلام کے زیر اثر ہوا۔

یہ اوہام کائنات کی توجیہ کے لیے وجود میں آئے۔ خداؤں نے کس طرح آسمانوں، زمین، نباتات اور جانوروں اور انسانوں کو پیدا کیا۔ انسانی اداروں اور عالمی نظام کی خدائی اصل کیا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کے خدائی ضابطے کیا ہیں۔ ان بنیادی سوالوں کے جواب کے لیے توجیہی اوہام وجود میں آئے۔ مثال کے طور پر مرد اور عورت کے درمیان کشش اور اس کے نتیجے میں شادی کا ادارہ وجود میں آنا۔ اس کی توجیہ اس فرضی قصہ سے کی گئی کہ ابتداء میں مرد ہی واحد مخلوق تھا۔ اس کے بعد وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا— ایک مرد اور دوسرے

عورت۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں تاکہ اپنی ابتدائی وحدت کو دوبارہ حاصل کرسکیں۔ ارسٹوفین نے جنسی کشش کے اسی نظریہ کو اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ بائبل کے باب پیدائش میں بھی یہی نظریہ مشہور افسانہ کی صورت میں بیان ہوا ہے کہ آدم کے جسم سے ایک پسلی نکالی گئی اور اسی سے ان کی بیوی حوّا بنائی گئیں۔ اور چوں کہ عورت کو مرد کے اندر سے نکالا گیا ہے، مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیتا ہے اور اپنی بیوی سے مل جاتا ہے تاکہ دونوں دوبارہ ایک جسم ہوجائیں:

Myths were developed to account for the cosmos. How did the gods bring heavens, earth, plants, beasts and men into existence? What is the divine origin of human institutions and of the ecumene? What divine process is responsible for prosperity or failure? To explain such basic questions etiological (origin or causal) myths were developed. For example, the attraction between man and woman (and the consequent institution of marriage) is explained by the myth that primeval man was one creature, subsequently divided into two parts, male and female, which are attracted to one another to regain their pristine unity. Aristophanes expresses this theory of sexual attraction in Plato's Symposium. Genesis has the same theory in the familiar myth that a rib, taken out of Adam, was fashioned into Eve; and precisely because woman was taken out of man, man forsakes his father and mother to cleave unto his wife so that they become "one flesh". (Gen. 2:23-24)

(*Encyclopedia Britannica,* 1984. V- 12, pp. 919-20)

چند مثالیں

یہاں ہم دو مثالیں نقل کرتے ہیں۔ اس سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اوہام وخرافات میں اور علم میں کیا فرق ہے۔ نیز یہ کہ اوہام وخرافات کے قدیم دور کو ختم کرکے نیا دور لانے کا کام اصلاً اور اولاً جس نے انجام دیا وہ اسلام ہے۔

ہماری دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس کو گرہن کہا جاتا ہے کبھی سورج کو گرہن لگتا ہے اور کبھی چاند کو۔ موجودہ زمانے میں اس کے فلکیاتی اسباب معلوم کرلیے گئے ہیں۔ مگر قدیم زمانے میں انسان اس کی حقیقت سے ناواقف تھا۔ اس لیے اس نے فرضی قیاس کے تحت عجیب عجیب نظریے قائم کرلیے۔ مثلاً قدیم چین کے لوگوں کا خیال تھا کہ گرہن کا سبب ایک آسمانی اژدہا ہے۔ جب کبھی سورج گرہن لگتا تو چینی لوگ سمجھتے کہ سورج کو ایک بہت بڑا اژدہا نگل رہا ہے۔ اس کے بعد ساری آبادی اس کے ساتھ مل کر آخری ممکن حد تک شور کرتی تاکہ وہ سورج کو بچاسکے اور وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے:

> When an eclipse occurred, the Chinese thought that the sun was being swallowed by a huge dragon. The whole population joined in making as much noise as possible to scare it away. They always succeeded! (Iain Nicolson, *Astronomy,* London, 1970. p. 7)

گرہن ختم ہونے کا مقرر وقت ہوتا ہے۔ وہ آخرکار اپنے وقت پر ختم ہو جاتا ہے۔ شور کرنے والے لوگ جب دیکھتے کہ کچھ دیر کے بعد گرہن ختم ہو گیا تو وہ سمجھتے کہ وہ ان کے شور کرنے کی وجہ سے ختم ہوا ہے۔ چنانچہ اگلے گرہن کے موقع پر وہ مزید یقین کے ساتھ شور کرنے میں لگ جاتے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اسلام آیا۔ مگر اسلام نے سورج گرہن کے بارے میں زمانے

کے بالکل خلاف وہ بات کہی جو آج کی تحقیقات کے عین مطابق قرار پاتی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحبزادے کا نام ابراہیم تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں شوال 10 ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ روایات میں آتا ہے کہ جس روز ابراہیم کا انتقال ہوا۔ اسی روز سورج گرہن واقع ہوا۔ قدیم قوموں میں سورج گرہن کے بارے میں عجیب عجیب اعتقادات تھے۔ ایک عقیدہ یہ تھا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کسی بڑے آدمی کی موت پر واقع ہوتے ہیں۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ جس دن پیغمبر کے صاحبزادے ابراہیم کا انتقال ہوا اسی دن سورج گرہن پڑا تو مدینہ میں کچھ لوگوں نے کہا کہ ابراہیم کی موت کی وجہ سے یہ سورج گرہن ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کیا اور اس کی حقیقت بیان فرمائی:

فَخَطَبَ النَّاسَ، فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ، لاَ يَنْخَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلاَ لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمْ ذَلِكَ فَادْعُوا اللَّهَ وَكَبِّرُوا، وَصَلُّوا وَتَصَدَّقُوا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1004)۔

آپ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔ آپ نے اللہ کی حمد کی اور اس کی تعریف بیان کی۔ پھر فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانی ہیں۔ ان میں گرہن کسی شخص کی موت اور اس کی زندگی کی وجہ سے نہیں لگتا۔ پس جب تم اس کو دیکھو تو اللہ کو پکارو، اور اس کی تکبیر کرو اور صلوٰۃ وسلام بھیجو اور صدقہ کرو۔

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: هَذِهِ الآيَاتُ الَّتِي يُرْسِلُ اللَّهُ، لاَ تَكُونُ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلاَ لِحَيَاتِهِ، وَلَكِنْ يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ، فَإِذَا رَأَيْتُمْ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ، فَافْزَعُوا إِلَى ذِكْرِهِ وَدُعَائِهِ وَاسْتِغْفَارِهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1059، صحیح مسلم، حدیث نمبر 912)۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نشانیاں جو اللہ بھیجتا ہے وہ کسی شخص کی موت یا زندگی کے سبب سے نہیں ہوتیں۔ بلکہ اللہ ان کے ذریعہ سے اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ پس جب تم ایسی چیز دیکھو تو اللہ سے ڈر کر اس کا ذکر کرو اور اس سے دعا کرو اور اس سے استغفار کرو۔

اس قسم کے بے بنیاد اوہام وخرافات کو تاریخ میں پہلی بار اسلام نے ختم کیا۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے جو تاریخ کی کتابوں میں حسب ذیل طریقہ سے آیا ہے:

رُوِينَا مِنْ طَرِيقِ ابْنِ لَهِيعَةَ، عَنْ قَيْسِ بْنِ الْحَجَّاجِ، عَمَّنْ حَدَّثَهُ قَالَ: لَمَّا افْتُتِحَتْ مِصْرُ أَتَى أَهْلُهَا عَمْرَو بْنَ الْعَاصِ - حِينَ دَخَلَ بُؤُونَةُ مِنْ أَشْهُرِ الْعَجَمِ - فَقَالُوا: أَيُّهَا الْأَمِيرُ، لِنِيلِنَا هَذَا سُنَّةٌ لَا يَجْرِي إِلَّا بِهَا. قَالَ: وَمَا ذَاكَ؟ قَالُوا: إِذَا كَانَتِ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ لَيْلَةً خَلَتْ مِنْ هَذَا الشَّهْرِ، عَمَدْنَا إِلَى جَارِيَةٍ بِكْرٍ مِنْ أَبَوَيْهَا، فَأَرْضَيْنَا أَبَوَيْهَا، وَجَعَلْنَا عَلَيْهَا مِنَ الْحُلِيِّ وَالثِّيَابِ أَفْضَلَ مَا يَكُونُ، ثُمَّ أَلْقَيْنَاهَا فِي هَذَا النِّيلِ. فَقَالَ لَهُمْ عَمْرٌو: إِنَّ هَذَا مِمَّا لَا يَكُونُ فِي الْإِسْلَامِ، إِنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا قَبْلَهُ. قَالَ: فَأَقَامُوا بُؤُونَةَ وَأَبِيبَ وَمِسْرَى وَالنِّيلُ لَا يَجْرِي قَلِيلًا وَلَا كَثِيرًا، حَتَّى هَمُّوا بِالْجَلَاءِ، فَكَتَبَ عَمْرٌو إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ بِذَلِكَ، فَكَتَبَ إِلَيْهِ: إِنَّكَ قَدْ أَصَبْتَ بِالَّذِي فَعَلْتَ، وَإِنِّي قَدْ بَعَثْتُ إِلَيْكَ بِبِطَاقَةٍ دَاخِلَ كِتَابِي، فَأَلْقِهَا فِي النِّيلِ. فَلَمَّا قَدِمَ كِتَابُهُ أَخَذَ عَمْرٌو الْبِطَاقَةَ فَإِذَا فِيهَا: مِنْ عَبْدِ اللَّهِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ إِلَى نِيلِ أَهْلِ مِصْرَ، أَمَّا بَعْدُ، فَإِنْ كُنْتَ إِنَّمَا تَجْرِي مِنْ قِبَلِكَ فَلَا تَجْرِ، وَإِنْ كَانَ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ هُوَ الَّذِي يُجْرِيكَ، فَنَسْأَلُ اللَّهَ

تَعَالَى أَنْ يُجْرِيَكَ. قَالَ: فَأَلْقَى الْبِطَاقَةَ فِي النِّيلِ فَأَصْبَحُوا يَوْمَ السَّبْتِ، وَقَدْ أَجْرَى اللّٰهُ النِّيلَ سِتَّةَ عَشَرَ ذِرَاعًا فِي لَيْلَةٍ وَاحِدَةٍ، وَقَطَعَ اللّٰهُ تِلْكَ السُّنَّةَ عَنْ أَهْلِ مِصْرَ إِلَى الْيَوْمِ (البداية والنهاية، ج 10، ص 97)۔

ابن لہیعہ نے کہا کہ قیس بن حجاج نے ایک صاحب سے سنا ہوا یہ واقعہ بیان کیا کہ جب مصر فتح ہوا تو اس کے باشندے حضرت عمرو بن العاص کے پاس آئے اور وہ وہاں امیر تھے۔ جب عجمی مہینوں میں سے بوونہ کا مہینہ آیا تو انھوں نے کہا کہ اے امیر، ہمارے اس دریائے نیل کے لیے ایک رواج ہے، وہ اس کے بغیر نہیں بہتی۔ انھوں نے پوچھا وہ کیا ہے۔ اہل مصر نے کہا کہ جب اس مہینہ کی بارہ راتیں گزر جاتی ہیں تو ہم ایک ایسی کنواری لڑکی کا قصد کرتے ہیں جو اپنے ماں باپ کے درمیان اکیلی ہو۔ پھر ہم اس کے ماں باپ کو راضی کرتے ہیں اور اس کو زیور اور کپڑا پہناتے ہیں جو سب سے اچھا ممکن ہو۔ پھر ہم اس کو دریائے نیل میں ڈال دیتے ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص نے ان سے کہا کہ اسلام میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اسلام اپنے سے پہلے کی چیزوں کو ختم کر دیتا ہے۔

پھر اہلِ مصر بوونہ کے مہینہ میں رکے رہے مگر دریائے نیل میں پانی نہیں آیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ارادہ کیا کہ اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے آئیں۔ اب عمرو بن العاص نے اس کی بابت حضرت عمر بن الخطاب کو لکھا۔ حضرت عمر نے ان کو لکھا کہ جو تم نے کیا صحیح کیا۔ اور میں اپنے اس خط کے ساتھ تمھارے لیے ایک پرچہ بھیج رہا ہوں تم اس کو نیل میں ڈال دو۔

جب خلیفہ کا خط پہونچا تو حضرت عمرو بن العاص نے پرچہ کو لے کر اسے کھولا تو اس میں لکھا ہوا تھا:

خدا کے بندے عمر امیر المومنین کی طرف سے مصر والوں کے دریائے نیل کے نام،
امابعد، اگر تو خود اپنی طرف سے جاری ہوتا تھا تو تو نہ جاری ہو۔ اور اگر اللہ واحد وقہار تھا
جو تجھ کو جاری کرتا تھا تو ہم اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تجھ کو جاری کردے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص نے یہ پرچہ دریائے نیل میں ڈال دیا۔
لوگوں نے اگلے دن صبح کو دیکھا تو اللہ نے نیل کو جاری کردیا تھا۔ ایک ہی رات
میں اس کے اندر 16 ہاتھ اونچا پانی آ گیا اس سال اللہ نے مصر والوں سے اس
رواج کو ختم کردیا اور وہ اب تک ختم ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج 10، ص 97)

ایک عملی ضرورت

قدیم زمانے میں خرافات (myths) اور توہمات (superstitions) کے رواج نے تمام معاملات میں انسان کے نقطہ نظر کو غیر حقیقی بنا رکھا تھا۔ عورتوں کے معاملہ میں ایک مزید سبب بھی شامل ہو گیا۔

انسانی معاشرہ کی جو مختلف ضرورتیں ہیں ان کو وسیع تر تقسیم میں دو ضرورتیں کہا جاسکتا ہے۔ ایک گھر کے اندر کا کام۔ اور دوسرے گھر کے باہر کا کام۔ گھر انسانی معاشرہ کی ابتدائی بنیاد ہے۔ یہیں آدمی کو سکون کے لمحات ملتے ہیں۔ یہیں کسی قوم کی اگلی نسل تیار ہوتی ہے۔ گھر ہی معاشرہ کی وہ اکائی ہے جس کی بہت سی تعداد کے ملنے سے معاشرہ بنتا ہے۔ گھر نہیں تو انسانی معاشرہ بھی نہیں۔ جس طرح اینٹ کی درستگی پوری عمارت کی درستگی ہے، اسی طرح گھر کی درستگی پورے معاشرہ کی درستگی ہے۔

تاہم کام کی ان دونوں قسموں کی نوعیت الگ الگ ہے۔ گھر کے اندر کے کام نرم و نازک کام ہیں۔ گھر کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے انفعالی صلاحیتیں زیادہ مفید ہیں۔ اس کے برعکس، باہر کے کام کے لیے فعال صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ باہر کے کام کو انجام

دینے کے لیے زیادہ سخت جسم اور زیادہ طاقتور اعصاب کی ضرورت ہے۔ انسانی تمدن کے بقا اور ترقی کے لیے یہ دونوں ہی قسم کی صلاحیتیں ضروری ہیں۔ چنانچہ قدرت نے اسی کے لحاظ سے مرد اور عورت کی دو الگ الگ جنسیں پیدا کی ہیں۔ اس نے عورت کے اندر انفعالی صلاحیتیں زیادہ رکھی ہیں تاکہ وہ گھر کے اندر کے کام سنبھالے۔ اور اسی طرح مرد کے اندر فعال صلاحیتیں زیادہ رکھی ہیں تاکہ وہ گھر کے باہر والے کام کی ذمہ داری اٹھا سکے۔

زندگی کی تنظیم میں اس حکمت کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر صنف کو وہی کام دیا جائے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے تو زندگی کا نظام نہایت درست اور متوازن رہے گا۔ لیکن اگر اس حکمت کو ملحوظ رکھے بغیر زندگی کی تنظیم کی جائے تو زندگی کا نظام غیر متوازن ہو کر رہ جائے گا اور بربادی کے رخ پر چل پڑے گا۔

قدیم زمانے میں بہت سی قومیں اس حکمت کو سمجھ نہ سکیں۔ انھوں نے دیکھا کہ مرد معاشی شعبوں کو سنبھالتا ہے۔ وہ جنگ و مقابلے کے وقت قوم کا دفاع کرتا ہے۔ وہ تمام محنت طلب کاموں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ مرد برتر مخلوق ہے اور عورت کم تر مخلوق — قدرت نے مرد اور عورت کے درمیان فرق کو برائے ضرورت رکھا تھا، انھوں نے اس فرق کو برائے فضیلت سمجھ لیا۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ مرد کے مقابلے میں عورت کا درجہ گرا دیا گیا اس کو مرد کے مقابلے میں حقیر سمجھا جاتا ہے۔

عورت کے بارے میں توہمات

عورتوں کا مرتبہ مردوں سے کم سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ معاشرہ میں حقیر قرار دی گئی۔ اس کو خاندانی جائیداد میں حصہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔ قانون کی نظر میں وہ اس قابل نہ رہی کہ اس کو وہ حق دیا جائے جو مردوں کو حاصل ہے۔ اس کو عملاً غلام کا درجہ دے دیا گیا۔ حتیٰ کہ

بعض انتہا پسند قبیلوں میں اس طرح کی مثالیں ملنے لگیں کہ ایک شخص کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے بچپن ہی میں اس کو مار کر زمین میں گاڑ دیا۔

انسان کا عام مزاج یہ ہے کہ اگر وہ کسی کو بڑا سمجھ لے تو اس کے بارے میں وہ فضیلت اور تقدس کی جھوٹی کہانیاں گھڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی چیز اس کے ذہن میں نیچے درجہ کی قرار پا جائے تو اس کے بارے میں وہ اپنے ذہن کو ایسے انسانوں کی صورت میں ظاہر کرتا ہے جس میں وہ چیز واقعاتی طور پر ذلیل اور حقیر دکھائی دینے لگے۔

یہی معاملہ عورت کے ساتھ پیش آیا۔ قدیم زمانے میں اکثر قوموں میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہوئیں۔ یہ کہانیاں سراسر جھوٹی تھیں مگر قدیم ماحول میں ان کو اتنا زیادہ رواج حاصل ہوا کہ لوگ ان کو حقیقت سمجھ کر ان پر یقین کرنے لگے۔ عورت کے بارے میں تحقیری کہانیاں ہر ملک اور ہر قوم میں پھیلیں۔ ان میں سے دو مشہور کہانیوں کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

ان جھوٹے افسانوں میں سے ایک وہ ہے جو قدیم یونانیوں اور ان کے اثر سے یورپ کی دوسری قوموں میں بہت مشہور ہوا۔ یہ افسانہ "پہلی عورت" کے بارے میں تھا۔ یعنی وہ ابتدائی عورت جو پہلی بار زمین پر آئی۔ اس پہلی عورت کے بارے میں طرح طرح کے افسانے گھڑے گئے جو زبان اور لٹریچر میں اس طرح پھیلے کہ لوگ ان کو حقیقت سمجھنے لگے۔

اس پہلی عورت کا نام پانڈورا (Pandora) تھا۔ پانڈورا ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔ سب کچھ دینے والا، مگر استعمال کے اعتبار سے یہ لفظ ایک برا مفہوم رکھتا تھا۔ یعنی ہر قسم کی خرابیاں دینے والا، مفروضہ کہانی کے مطابق ایک دیوتا پرومی تھیس (Prometheus) نے آسمان سے آگ چرائی اور اس کو زمین میں بسنے والے انسانوں تک پہونچا دیا۔ دیوتاؤں کے بادشاہ زیوس (Zeus) کو یہ بات ناپسند ہوئی۔ اس نے زمینی مخلوقات سے اس نعمت کو کالعدم کرنے کے لیے یہ تدبیر کی کہ اس نے ایک عورت بنائی

جس کا نام پانڈورا تھا۔ اس کے بعد اس نے اس پہلی عورت کو زمین پر بھیج دیا۔ زمین پر اس وقت ایم پی تھیس (Epimetheus) آباد تھا۔ اس نے پانڈورا کی ظاہری کشش سے متاثر ہو کر اس کو اپنی بیوی بنا لیا اور وہ اس کے ساتھ رہنے لگی۔ اس پہلی عورت کے ساتھ ایک باکس تھا جس کو فرضی طور پر پانڈورا کا باکس (pandora's box) کہا جاتا ہے۔ پانڈورا نے زمین پر قیام کرنے کے بعد ایک روز اپنا یہ باکس کھول دیا۔ اس باکس کے اندر ہر قسم کی برائیاں (Evils) بھری ہوئی تھیں۔ باکس کھلتے ہی تمام برائیاں زمین پر پھیل گئیں۔ اس کے بعد پھر یہ زمین کبھی برائیوں سے خالی نہ ہو سکی۔ (ملاحظہ ہو، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، اور کولنس انسائیکلو پیڈیا، تحت لفظ "Pandora")۔

اسی قسم کا افسانہ کسی قدر مختلف شکل میں یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان مشہور ہوا۔ یہ افسانہ خاتونِ اول حضرت حوّا کے بارے میں تھا۔ اس افسانہ کی اصل خود بائبل کے اندر شامل کر دی گئی۔ چنانچہ موجودہ بائبل میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان (آدم) کو بنایا۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے۔ لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کے پھل کو کبھی نہ کھانا۔ کیوں کہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔ اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا۔ اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا۔ اور خداوند خدا اس پسلی سے ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا۔ اور سانپ کل دشتی جانوروں سے چالاک تھا اور اس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ اس درخت کا پھل تم نہ کھانا۔ سانپ نے عورت سے کہا کہ درخت کا پھل کھانے سے تم ہرگز نہ مرو گے۔ عورت نے اس کے بعد اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر (آدم) کو

بھی دیا اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں۔ تب خداوند نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے۔ آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا۔ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ اور آدم سے اس نے کہا چوں کہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا۔ جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا۔ اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹ کٹارے اُگائے گی۔ (پیدائش، باب 2-3)

یہ قصہ بتاتا ہے کہ انسان اوّل (آدم) آرام کے ساتھ جنت میں تھے۔ وہاں سے ان کے نکلنے کا سبب جو چیز بنی وہ خاتون اوّل (حوّا) تھیں۔ حوّا کو سانپ (شیطان) نے بہکایا اور حوّا نے آدم کو بہکایا۔ اس طرح انسان اس ابتدائی گناہ (original sin) کا مرتکب ہو اجس میں ساری نسلِ انسانی شریک ہوگئی۔

یہ افسانہ یقینی طور پر بے بنیاد ہے۔ مگر وہ اتنا مشہور ہوا کہ نہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں میں بلکہ دنیا کی اکثر قوموں میں کسی نہ کسی طرح پھیل گیا۔ وہ زبان اور لٹریچر میں شامل ہو کر ہر طبقے کے لوگوں تک پہنچ گیا۔

قرآن نے جس طرح بائبل کی دوسری بہت سی تحریفات کی تصحیح کی ہے، اسی طرح اس نے بائبل کے اس تحریفی بیان کی بھی تردید کی ہے۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْآتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ۔ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي

لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ۔ فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُلْ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُبِينٌ۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ (7:20-23) یعنی پھر شیطان نے دونوں کو بہکایا تا کہ وہ کھول دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ تمھارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتہ نہ بن جاؤ یا تم کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے۔ اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ پس مائل کر لیا ان کو فریب سے۔ پھر جب دونوں نے درخت کا پھل چکھا تو ان کی شرم گاہیں ان پر کھل گئیں۔ اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو پکارا کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ انھوں نے کہا، اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

ان آیات میں دیکھیے، ہر موقع پر تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ ہر بات میں آدم و حوا دونوں کو یکساں طور پر برابر کے درجے میں شریک کیا گیا ہے۔ اس سے بالکل واضح ہے کہ شیطان نے ایک ساتھ دونوں کو بہکایا۔ دونوں بیک وقت شیطان کی باتوں سے متاثر ہوئے اور دونوں نے ایک ساتھ ممنوعہ درخت کا پھل کھایا، دونوں یکساں طور پر اس کے انجام سے دوچار ہوئے۔ پھر اللہ نے دونوں کو برابر کے درجے میں ذمہ دار ٹھہرایا اور دونوں سے یکساں حیثیت میں خطاب کیا۔

تجرد کا معاملہ

اسلام سے پہلے تقریباً تمام مذاہب میں تجرد کو پارسائی کا اعلیٰ معیار سمجھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ بھی وہی تھی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ عورتوں کو حقیر اور گناہ کا سرچشمہ سمجھنے کی وجہ سے یہ ہوا کہ عورتوں کو اپنی زندگی میں شامل کرنے والا شخص لوگوں کی نظر میں کم تر ہو گیا۔ اس کے برعکس، وہ شخص لوگوں کی نظر میں مقدس بن جاتا تھا جو تجرد کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہو۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں:

> "Celibacy has existed in some form or another through-out man's religious history and has appeared in virtually all the major religious traditions of the world"
>
> (*Encyclopedia Britannica*, 3/1040)

> تجرد کسی ایک یا دوسری شکل میں انسان کی پوری مذہبی تاریخ میں موجود رہا ہے۔ عملی طور پر وہ دنیا کے تمام بڑے مذہبوں میں پایا جاتا رہا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984) کے مقالہ تجرد (Celibacy) میں تفصیل سے دکھایا گیا ہے کہ کس طرح تمام مذاہب اس سے متاثر رہے ہیں۔

تجرد کا خاص مقصد یہ ہے کہ مذہبی شخصیتوں میں تقدس کی شان پیدا کی جائے۔ مذہبی شخصیت کو روحانی طور پر خود کفیل ہونا چاہیے، جب کہ عورت کے ساتھ تعلق بتاتا ہے کہ اپنی تکمیل کے لیے وہ اپنے سے باہر بھی کسی چیز کا محتاج ہے۔ ابتدائی مذاہب کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ ان کے یہاں بھی مذہبی شخصیتوں کے لیے عورت کے ساتھ ازدواجی تعلق ممنوع تھا۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کا روحانی تزکیہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد کو جو مذہبی لٹریچر تیار ہوا اس میں زور و شور کے ساتھ دکھایا گیا کہ تجرد کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کی اخلاقی اور روحانی ترقی ہوتی ہے۔ اس لیے جو لوگ اخلاقی اور روحانی ارتقار چاہتے ہیں وہ نکاح نہ

کریں اور اگر ان کا نکاح ہو چکا ہے تو بیوی سے جنسی تعلق مطلق طور پر چھوڑ دیں۔ جنسی عمل کو مذہب کا سب سے بڑا دشمن سمجھا گیا۔ عورتوں کے لیے بھی سب سے اونچا روحانی تصور یہ تھا کہ وہ ساری عمر کنواری رہیں اور اسی حال میں مر جائیں۔ قدیم رومی مذہب میں فلسفیوں اور مذہبی لوگوں کے بارے میں اعلیٰ تصور یہ تھا کہ وہ ہمیشہ مجرد زندگی گزارتے ہیں۔ ایسا ہی شخص آئیڈیل روحانی معلم بن سکتا ہے۔ جین مذہب کے مطابق عورت کو دیکھنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ یہی حال بدھزم اور دوسرے تمام مذاہب کا ہے۔ (ملاحظہ ہو، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، 1984، جلد 16، صفحہ 599)

تاریخ کی معلوم شخصیتوں میں پیغمبر اسلام پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے اپنے قول وعمل سے ان باتوں کی تردید کی۔ آپ نے بتایا کہ تقدس کی علامت تجرد نہیں، تقدس یہ ہے کہ آدمی بیوی بچوں کے درمیان ہو اور پھر بھی وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد پر قائم رہے۔ عورت زندگی کی بھلائی ہے، نہ کہ زندگی کی برائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف خود نکاح کیا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بار بار ترغیب دی کہ تم بھی نکاح کرو۔ حتی کہ ماضی کے تقدس کو توڑنے کے لیے آپ نے یہاں تک فرمایا کہ عورت کو میرے لیے محبوب بنایا گیا ہے: حُبِّبَ إِلَيَّ النِّسَاء (سنن النسائی، حدیث نمبر 3940)۔ قدیم زمانے میں عورت سے تعلق کسی مذہبی شخصیت کے لیے اتنی معیوب چیز سمجھی جاتی تھی کہ آپ اگر اس باب میں اتنا زیادہ زور نہ دیتے تو لوگ بدستور سابقہ رواج پر قائم رہتے۔

موجودہ زمانے کی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ تجرد کا نظریہ سراسر غیر فطری اور غیر واقعی نظریہ تھا۔ اس کے مقابلے میں اسلام کا تصور عین فطری اور عین مطابق حقیقت ہے۔ آج یہ ثابت ہو گیا ہے کہ انسان کے اندر جنسی اعضاء صرف جنسی عمل میں مددگار نہیں ہیں۔ بلکہ ان

کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے۔ وہ انسان کے اندر تمام عضویاتی، ذہنی، روحانی سرگرمیوں کو تیز تر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مخنث آدمی کوئی بڑا فلسفی یا بڑا سائنس داں نہیں بنا ہے۔ حتیٰ کہ وہ بڑا مجرم بھی نہ بن سکا۔ جنسی اعضاء کی اہمیت انسانی اعمال کے لیے بہت زیادہ ہے:

"The sexual glands have other functions than that of impelling man to the gesture which, in primitive life, perpetuated the race. They also intensify all physiological, mental, and spiritual activities. No eunuch has ever become a great philosopher, a great scientist, or even a great criminal. Testicles and ovaries possess functions of overwhelming importance."

(Dr. Alexis Carrel: *Man, The Unknown,* 1948, p. 91)

ماضی میں مذہب کے دائرہ میں عورت سے نکاح کو معیوب چیز سمجھ لیا گیا تھا۔ اسلام نے اس کے برعکس عورت کے ساتھ نکاح کے تعلق کو پسندیدہ چیز قرار دیا۔ جدید سائنسی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ پہلا ذہن فطرت کے خلاف تھا اور اسلام کا ذہن فطرت کے عین مطابق۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کی تعلیمات سراسر مبنی بر حقیقت ہیں۔

فطرت کا نظام

پتھر وغیرہ کو تراش کر اسٹیچو (مورت) بنانا ایک بہت پرانا فن ہے جس کو بت تراشی (sculpture) کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ زندہ انسان میں اور پتھر کی مورتوں میں ظاہری طور پر کافی مشابہت ہوتی ہے اب اگر کوئی شخص انسان کے معاملے کو اسٹیچو کا معاملہ سمجھ لے اور انسان کا مطالعہ فن بت تراشی کے تحت کرنے لگے تو ایسی حالت میں کیا ہوگا۔ یہ طریق مطالعہ بڑے عجیب و غریب نتائج پیدا کرے گا۔ تراشی ہوئی مورت کو کھانے اور پینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے ایسا عالم یہ فرض کرلے گا کہ انسان کے لیے بھی کھانے پینے کا انتظام کرنا ضروری نہیں ہے۔ ایک مورت کو مہینوں اور سالوں کے لیے کمرے میں بند کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایسا عالم انسان کو بھی ایک اندھیرے کمرے میں بند کردے گا اور اسے کوئی پریشانی نہ ہوگی خواہ سالوں تک بھی کمرہ کھولنے کی نوبت نہ آئے۔

سابق صدر مصر جمال عبد الناصر کے زمانے میں ایک منصوبے کے تحت پتھر کی ایک قدیم مورت ابوسمبل (Abu Simbel) کو اپنی جگہ سے ہٹانا تھا۔ یہ مورت 20 میٹر اونچی تھی اور پہاڑ میں جمی ہوئی تھی چنانچہ اس کو اس طرح ہٹایا گیا کہ 66-1964ء میں خصوصی مشینوں کے ذریعہ کاٹ کر اس کے کئی ٹکڑے کیے گئے۔ یہ ٹکڑے اس کی پرانی جگہ سے ہٹا کر دوسری محفوظ جگہ لائے گئے اور پھر دوبارہ جوڑ کر کھڑے کردیے گئے۔ اب مذکورہ عالم یہ بھی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے کسی منصوبہ کی تکمیل کے لیے انسان کے جسم پر بھی آرہ چلانا شروع کردے۔

بظاہر ایسا کوئی سنگ تراش (sculptor) دنیا میں موجود نہیں ہے۔ مگر ایک اور شعبۂ علم میں موجودہ زمانے میں اسی قسم کے ماہرین پیدا ہوگئے ہیں۔ وہ "انسان" کو اسٹیچو فرض کرکے اس کے ساتھ وہ سب کچھ کررہے ہیں جو صرف اسٹیچو کے ساتھ کیا جاسکتا

ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو موجودہ زمانے میں علم الانسان (Anthropology) کہا جاتا ہے۔ انتھراپالوجی کا علم انیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوا۔ اس کا مقصد انسانی سماج کا مطالعہ خارجی معلومات کی روشنی میں کرنا تھا۔ انھوں نے قدیم انسان کے حالات، اس کے عقائد، اس کی روایات اور اس کے مروجہ طریقوں (customs) کو جمع کیا اور ان کی روشنی میں انسان کے بارے میں رائیں قائم کیں۔

ان کے مطالعے کے دائرے میں قدرتی طور پر مذہب بھی آتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مختلف فرقوں اور قبیلوں میں موجود مذہب کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ ہر وہ رواج جو مذہب کے نام پر کہیں پایا جاتا تھا وہ سب انھوں نے اپنی فہرست میں اکٹھا کر لیا۔

اس طریق مطالعہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب ایک سماجی مظہر (social phenomenon) بن گیا۔ یعنی ایک ایسی چیز جو انسانی توہمات (myths) اور رواج (customs) اور سماجی حالات کے اثر سے بنتی ہے — مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک خدائی حکم تھا مگر انتھراپالوجی کے مخصوص طریق مطالعہ کے نتیجے میں وہ محض ایک انسانی رواج بن کر رہ گیا۔

اس طریق مطالعہ کا زبردست نقصان یہ ہوا کہ مذہب نے موجودہ زمانے میں اپنی اعتباریت (credibility) کھودی۔ وہ ایک غیر اہم چیز بن کر رہ گیا۔ مذہب ایک خدائی حکم کی حیثیت سے ایک ایسی چیز کی حیثیت رکھتا تھا جو اپنی ذات میں مستند ہو۔ جس کے بارے میں پیشگی طور پر یہ یقین کیا جاسکے کہ اس کا ہر بیان امر واقعی کا بیان ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اس کو بالکل درست سمجھ کر مان لیا جائے۔ اس کے برعکس، مذہب کو جب محض ایک سماجی مظہر (social phenomenon) مان لیا جائے تو اس کی ساری اعتباریت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی چیز بن جاتا ہے جس کو ناواقف انسانوں کے

رواج نے وضع کیا ہو، نہ کہ اس خدا نے جو ہر چیز سے براہِ راست واقف ہے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کیمسٹری (Chemistry) کی سائنس کو گھٹا کر کیمیا گری (Alchemy) کا درجہ دے دیا جائے یا فلکیات (Astronomy) کو فنِّ جوتش (Astrology) کے ہم معنی سمجھا جانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے بارے میں یہ طریقِ مطالعہ سراسر غلط ہے۔ اس طریقِ مطالعہ نے ایک حقیقی جزء کو غیر حقیقی جزء بنا دیا۔ اس نے ایک خدائی چیز کو ایک انسانی چیز کا درجہ دے دیا۔ مذہب کی حقیقت سمجھنے کے لیے قرآن کی اس آیت پر غور کیجیے:

أَفَغَيْرَ دِينِ اللهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (3:83)۔ یعنی، کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالاں کہ اسی کے تابع ہے وہ سب کچھ جو زمین اور آسمان میں ہے۔ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور اسی کی طرف لوگ لوٹنے والے ہیں۔

اس آیت کے مطابق مذہب عین وہی خدا کا دین ہے جو بالفعل ساری کائنات میں قائم ہے۔ خدا نے جس دین (یا قانون) کا پابند بقیہ دنیا کو بنا رکھا ہے، اسی کا پابند وہ انسان کو بھی بنانا چاہتا ہے اور اسی آفاقی قانون کا نام مذہب ہے۔

قانونِ توازن

اب دیکھیے کہ وہ کون سا دین (یا خدائی قانون) ہے جو خدا نے بقیہ کائنات میں نافذ کر رکھا ہے وہ قرآن کے لفظ میں میزان (balance) کا قانون ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (55:7-9)۔ یعنی، اور اللہ نے آسمان کو اونچا کیا اور

اس میں میزان رکھی کہ تم میزان میں تجاوز نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو انصاف کے ساتھ اور وزن میں کمی نہ کرو۔

"He raised the heaven on high and set the balance, that you might not transgress the balance. Give just weight and full measure."

کائنات کوئی ایک چیز نہیں وہ بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی تمام چیزیں متحرک ہیں۔ ایٹم سے لے کر شمسی نظام یا کہکشاں تک کوئی چیز ساکن نہیں۔ ان متحرک اجزاء کو صحیح کارکردگی پر باقی رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ہر ایک کے عمل کی ایک حد ہو، اور مختلف چیزوں کے درمیان صحیح ترین توازن وتناسب قائم رکھا گیا ہو۔ خدا نے چیزوں کو پیدا کرنے کے ساتھ ان کے درمیان باقاعدہ توازن بھی قائم کر دیا۔ اسی توازن کا دوسرا نام قانون فطرت (Law of Nature) ہے۔

اسی طرح انسانی دنیا بھی بہت سے افراد کا مجموعہ ہے، یہاں بھی ہر فرد متحرک ہے، ایسی حالت میں ضروری تھا کہ ہر ایک کی حد مقرر کر دی جائے۔ مختلف افراد کے درمیان وہ توازن قائم کر دیا جائے جو اس بات کی ضمانت ہو کہ فرد دوسروں کے لیے مسئلہ بنے بغیر اپنی تکمیل کرے گا۔ وہ دوسروں سے غیر ضروری ٹکراؤ کیے بغیر اپنا سفر جاری رکھے گا۔

یہی وہ قانونِ توازن ہے جو پیغمبروں کے ذریعہ انسان پر کھولا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں کہا گیا ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (57:25) ۔یعنی، ہم نے اپنے رسول کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ایک میزانِ مکتوب اتاری۔ اور اس کے حق میں دلائل بھی فراہم کیے تا کہ لوگ اس کی صداقت و واقعیت کا یقین کرسکیں اور پھر اپنی زندگی کو اس میزان (قانون عدل) کے مطابق ڈھالیں۔ کائنات کی بقیہ چیزوں کے لیے خدا کا جو قانون توازن ہے وہ ان کے اندر داخلی طور پر شامل ہے مگر انسان کے لیے وہ ایک خارجی کتاب میں لکھ کر اس کو دیا گیا ہے۔

انحراف کا نقصان

خدا کی اس میزان (قانون عدل) سے انحراف ہی کا نام بگاڑ ہے چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ نے زمین میں اپنے اصلاحی قوانین کے ذریعہ جو توازن قائم کر رکھا ہے اس میں فرق نہ کرو۔ ورنہ زمین میں فساد پیدا ہوجائے گا: وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (7:56)۔ یعنی اور زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد۔

کائناتی توازن کی ایک مثال زمین اور سورج کا فاصلہ ہے۔ زمین اور سورج کے درمیان تقریباً نو کروڑ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ حد درجہ متوازن ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ اگر یہ درمیانی فاصلہ نصف کے بقدر گھٹ جائے یعنی سورج ہماری زمین سے ساڑھے چار کروڑ میل کی دوری پر آجائے تو زمین پر اتنی سخت گرمی پیدا ہوگی کہ اس کی ہر چیز جل جائے گی، اور یہاں زندگی جیسی چیز کا وجود ناممکن ہوجائے گا۔

یہی معاملہ زمین کی جسامت کا ہے۔ زمین کا محیط اس وقت تقریبا 25 ہزار میل ہے۔ اگر یہ محیط نصف کے بقدر گھٹ جائے۔ یعنی وہ کم ہو کر ساڑھے بارہ ہزار میل ہوجائے تو اس کی کشش اتنی کم ہوجائے گی کہ زمین کی سطح پر ہمارا جماؤ ناممکن ہوجائے گا۔ اس کے برعکس، اگر زمین کا محیط دُگنا مقدار میں بڑھ جائے یعنی وہ 50 ہزار میل ہوجائے تو اس کی کشش اتنی زیادہ ہوجائے گی کہ تمام نمو پذیر چیزوں کی بڑھوتری (growth) رک جائے گی۔ انسان چوہوں کی مانند ہوجائیں گے۔ اور چوہے چونٹیوں کی مانند۔

زمین پر جو بے مثال توازن قائم ہے اس کی ایک عجیب مثال وہ ننھی مخلوقات ہیں جن کو کیڑے مکوڑے کہا جاتا ہے، یہ کیڑے مکوڑے انسان کی طرح پھیپھڑے نہیں رکھتے۔ وہ نالیوں کے ذریعہ سانس لیتے ہیں۔ جب یہ کیڑے بڑے ہوتے ہیں تو ان کی یہ نالیاں ان کے جسم کی نسبت سے نہیں بڑھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا انچوں سے زیادہ آگے نہیں بڑھتا۔ اپنے اس ڈھانچہ کی وجہ سے کبھی کوئی کیڑا بڑے سائز کا نہیں ہوا۔ اسی نظام نے کیڑوں کو اس سے روکا کہ وہ دنیا پر چھا جائیں۔ اگر یہ طبعی روک نہ ہوتا تو زمین پر انسان کا وجود ناممکن ہو جاتا۔ ایسے انسان کا تصور کیجیے جس کا مقابلہ ایسی بھڑ سے ہو جو شیر کے بقدر بڑی ہو یا ایک ایسی مکڑی جو بڑھ کر عظیم الجثہ جانور کی مانند ہو گئی ہو:

> “The insects which, unlike human beings, do not possess lungs, but breathe through tubes. When insects grow large the tubes cannot grow in ratio to the increasing size of the body of the insect. Hence there never has been an insect more than a few inches long with a slightly longer wing spread. Because of the mechanism of their structure and their method of breathing, there never could be an insect of great size. This limit in their growth held all insects in check and prevented them from dominating the world. If this physical check had not been provided, man could not exist. Imagine a man meeting a hornet as big as a lion or a spider equally large.”

(Man Does not Stand Alone, pp. 79-80)

بعض لوگوں نے دنیا کے اس نظام پر اعتراض کیا ہے۔ مثلاً ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ زمین کی کشش ضرورت سے زیادہ ہے۔ چنانچہ دس کیلو کا وزن لے کر چلنا بھی زمین کے اوپر مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر زمین کی کشش کم ہوتی تو ہم دس کیلو کا وزن بآسانی لے

کراس پر چل سکتے تھے۔ مگر یہ ایک نادانی کا اعتراض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی کشش کی وجہ سے زمین پر ہمارے مکانات ٹھوس چٹان کی طرح قائم ہوتے ہیں۔ اگر زمین کی کشش کم ہوتی تو ہمارے مکانات کاغذ کے گھروندوں کی طرح اِدھر اِدھر اڑنے لگتے اور زمین پر تہذیب کا قیام ناممکن ہو جاتا۔

خوش قسمتی سے کائنات کا نظام انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ورنہ کوئی صاحب زمین کی کشش گھٹا کر زمین کے اوپر انسانی نسل کے استحکام کو ناممکن بنا دیتے۔ کوئی صاحب اٹھتے اور زمین اور سورج کے فاصلہ میں تبدیلی کرتے اور پھر یا تو ساری زمین کو برف کی طرح ٹھنڈا بنا دیتے یا آگ کی بھٹی کی طرح گرم۔ اسی طرح کوئی صاحب کہتے کہ کیڑوں کی نالیوں کا موجودہ نظام ان کے اوپر ظلم ہے۔ اس لیے ایسا ہونا چاہیے کہ جسم کے ساتھ ان کی نالیاں بھی بڑھتی رہیں اور اس کے بعد یہ حال ہوتا کہ ساری زمین بھینسوں اور ہاتھیوں جیسے بھیانک کیڑوں سے بھر جاتی۔

انسان بقیہ کائنات میں اس قسم کا بگاڑ پیدا کرنے پر قادر نہ تھا، اس لیے وہ کائنات کے نظام میں تبدیلی نہ کر سکا۔ البتہ خود اپنی دنیا میں عمل کے لیے وہ آزاد تھا۔ اس لیے یہاں اس نے دل کھول کر ہر قسم کا بگاڑ پیدا کیا حتی کہ وہ صورت حال پیدا ہوگئی جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41)۔ یعنی خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا ان اعمال کے نتیجے میں جو انسان نے کیے ہیں۔

مرد اور عورت کا مسئلہ

اس سلسلے میں مرد اور عورت کے تعلقات کے مسئلہ کو لیجیے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق خدائی قانون میں تقسیم کار کے اصول پر قائم کیا گیا تھا۔ یعنی مرد باہر کا کام کرے اور عورت

گھر کے اندر کے کام کو سنبھالے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34)۔ یعنی مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد عورتوں کے اوپر حاکم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر کے نظام میں وہ تمام کام جن کے لیے فعال صلاحیت درکار ہے، وہ سب مرد کے ذمہ ہیں۔ مثلاً کمانا، دفاع کرنا، بیرونی معاملات کا انتظام کرنا، حکومت چلانا وغیرہ۔ مرد ان کاموں کے لیے فطری طور پر زیادہ موزوں ہیں۔ اس لیے یہ سب کام انھیں کے ذمہ کیے گئے ہیں۔ ''قوام'' کا لفظ تقسیم عمل کی حکمت کو بتاتا ہے، نہ کہ ایک صنف پر دوسرے صنف کے اِمتیازی مرتبہ کو۔

اس کے برعکس، گھر کے اندرونی نظام کو سنبھالنے کا جو کام ہے اس کے لیے منفعل صلاحیتیں درکار ہیں۔ یہ صلاحیتیں عورت میں زیادہ ہیں۔ اس لیے اس کو گھر کے اندرونی کاموں کا انچارج بنایا گیا ہے۔

اسی تقسیم کار پر ہزاروں سال سے زندگی کا نظام چل رہا تھا۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد پہلی بار وہ حالات پیدا ہوئے جب کہ یہ نظام ٹوٹنا شروع ہوا۔ قدیم زمانے میں کمانا نام تھا— شکار کرنے کا۔ کھیتی اور باغبانی کرنے کا، تجارتی سامان لاد کر بر و بحر کا مشکل سفر کرنے کا وغیرہ اس قسم کی پرمشقت کمائی صرف مرد ہی کر سکتے تھے، اس لیے عملاً اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہ تھی کہ مرد کمائیں اور عورتیں گھر کے اندرونی نظام کو سنبھالیں۔

مگر یورپ میں صنعتی انقلاب نے بے شمار نئے نئے کام پیدا کر دیے جن کو کرنا کسی نہ کسی درجہ میں عورتوں کے لیے بھی ممکن تھا۔ یورپ میں پردہ کا نظام پہلے بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ عورتیں دفتروں اور کارخانوں میں پہنچ کر کام کرنے لگیں۔ اس طرح دھیرے دھیرے یہ صورت حال ختم ہونے لگی کہ کمائی کا انحصار صرف مرد پر ہو اور عورتیں کچھ نہ کر سکیں۔ جب

عورتیں خود کفیل ہوئیں تو اسی کے ساتھ ان کے اندر یہ ذہن بھی پیدا ہوا کہ وہ مردوں کی پابندی سے نکلیں اور اپنے لیے آزاد اور مستقل زندگی بنائیں۔ اس طرح وہ تحریک پیدا ہوئی جس کو آزادیِ نسواں (Women's Liberation) کی تحریک کہا جاتا ہے۔ آزادیِ نسواں کی تحریک کے صنعتی انقلاب سے وابستہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ تحریک اولاً انھیں ملکوں میں شروع ہوئی جہاں سب سے پہلے صنعتی انقلاب آیا تھا۔ چنانچہ آزادیِ نسواں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ سب سے پہلے انگلینڈ میں شروع ہوئی۔ عورتوں کے لیے برابری کے حقوق کا مطالبہ کرنے والی پہلی قابل ذکر کتاب لندن سے چھپی جس کا نام یہ تھا:

A Vindication of the Rights of Woman by
Mary Wollstonecrft (1792)

امریکا میں صنعتی انقلاب دیر سے آیا۔ اس لیے امریکہ میں آزادیِ نسواں کی تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوسکی۔ صنعتی انقلاب کی ترقی کے ساتھ آزادیِ نسواں کی تحریک بھی ترقی کرتی رہی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں پہنچ کر وہ اپنے آخری کمال تک پہنچ گئی۔

آزادیِ نسواں کے علم برداروں کے دلائل کا خلاصہ یہ تھا کہ قدیم سماجوں میں عورت اور مرد کے درمیان جو فرق تھا اس کا سبب فطرت میں نہ تھا بلکہ سماج میں تھا۔ عورت ہر وہ کام کرسکتی ہے جو مرد کرتا ہے یا کرسکتا ہے۔ مگر قدیم سماجی حالات نے عورت کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ اگر یہ سماجی دباؤ ختم کردیا جائے تو عورت ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرے گی۔ وہ کسی اعتبار سے مرد کے پیچھے نہیں رہے گی۔

اس تحریک کو اب پورے دو سو برس ہو چکے ہیں۔ جدید ترقی یافتہ ممالک میں وہ اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوچکی ہے کہ وہاں وہ سماجی حالات باقی نہیں ہیں جو اس تحریک کے علم برداروں کے نزدیک عورت کی مساویانہ حیثیت کو حاصل کرنے میں رکاوٹ

تھے۔ ہر ملک میں برابری کے قوانین بنائے جا چکے ہیں قانون یا رواج کے اعتبار سے آج عورت کی راہ میں مطلق کوئی رکاوٹ باقی نہیں ہے۔ اس کے باوجود عورت ابھی تک مرد سے پیچھے ہے۔ وہ کسی بھی شعبہ میں مرد کی برابری حاصل نہ کرسکی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984) نے جدید معاشرہ میں عورت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اقتصادی میدان میں گھر سے باہر کام کرنے والی عورتیں بہت زیادہ تعداد میں کم تنخواہ والے کاموں میں ہیں۔ اوران کا درجہ سب سے نیچا ہے۔ حتی کہ عورتیں ایک ہی کام میں مرد سے کم تنخواہ پاتی ہیں۔ امریکا میں خاتون کارکنوں کی اوسط تنخواہ مردوں کے مقابلہ میں 20 فیصد ہے جاپان میں یہ اوسط 55 فیصد ہے۔ سیاسی طور پر عورتیں بہت بڑے پیمانے پر نمائندگی سے محروم ہیں۔ قومی اور مقامی حکومتوں میں نیز سیاسی پارٹیوں میں:

"In the economic sphere women who work outside the home are heavily concentrated in the lowest paying work and that having the lowest status. Women also earn less than men in the same kinds of jobs. The median pay of women workers in the U.S. was 60 percent that of men in 1982. In Japan the percentage of average pay was 55. Politically, women are greatly underrepresented in national and local government and in political parties."

(*Encyclopedia Britannica*, X/732).

آج قدیم طرز کی سماجی حدبندیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ ہر ملک میں برابری کے قوانین بن گئے ہیں۔ اس کے باوجود جدید عورت کو مرد کے مقابلہ میں بدستور کمتر درجہ حاصل ہے۔ وہ کسی بھی شعبہ میں مرد کے برابر درجہ حاصل نہ کرسکی۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ عورت اور مرد کی حالت میں فرق کی وجہ وہ نہ تھی جس کو آزادیِ نسواں کے علم برداروں نے سمجھ لیا تھا۔ اگر وہ وجہ ہوتی تو اب بیسویں صدی کے نصف آخر میں عورت کو کامل طور پر مرد کے برابر درجہ مل

جانا چاہیے تھا۔ جب ایسا نہ ہوسکا تو اب ہمیں اس کی توجیہ کے لیے کوئی دوسرا سبب تلاش کرنا ہوگا۔

یہ دوسرا سبب آج خود علم انسانی نے دریافت کرلیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دونوں صنفوں کے درمیان فرق سماجی حالات کی بنا پر نہ تھا بلکہ دونوں کی پیدائشی بناوٹ کی بنا پر تھا۔ اس کا سبب حیاتیات میں تھا، نہ کہ سماجی حالات میں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس سلسلے میں کافی تحقیقات ہوئی ہیں اور اب یہ بات آخری طور پر ثابت ہوچکی ہے کہ دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی اعتبار سے بنیادی فرق ہے اور جب تک یہ فرق باقی ہے، دونوں کی سماجی حیثیت میں بھی فرق باقی رہے گا۔

مرد اور عورت کا فرق

تاریخ کے ہر دور میں عورتیں، مردوں کے ماتحت رہی ہیں، حتی کہ آج بھی مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ صورت حال مکمل طور پر موجود ہے۔ نام نہاد آزادیِ نسواں تحریک کے مغربی علم بردار اب تک یہ کہتے رہے ہیں کہ یہ کوئی فطری تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ سماجی حالات (social conditioning) نے مصنوعی طور پر یہ فرق پیدا کر رکھا ہے۔ تاہم حال میں اس سلسلے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں انھوں نے اس مفروضہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

امریکا کے پروفیسر اسٹیون گولڈ برگ (Steven Brown Goldberg, d. 2022) نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے — ''نظام سرداری کی ناگزیریت'':

The Inevitability of Patriarchy: Why the Biological Difference Between Men and Women Always Produces Male Domination (New York, 1973)

مصنف کہتے ہیں کہ معاشرہ میں عورت مرد کے فرق کی وجہ حقیقتاً کوئی سماجی دباؤ نہیں ہے۔ بلکہ دونوں جنسوں میں بنیادی فطری فرق اس کا سبب ہے۔ اس کتاب کی اشاعت

کے بعد پروفیسر موصوف کو امریکا کی انتہا پسند خواتین کی طرف سے نہایت سخت خطابات ملے ہیں۔ مثلاً ”ظالم خنزیر“ اور ”مرد سادی“ (male sadist) وغیرہ۔

سادیت، کونت دی سادے (1740-1814ء) کی طرف منسوب ہے۔ اس سے مراد ایک قسم کی جنسی کجروی ہوتی ہے جس کے مبتلا کو اس میں لطف آتا ہے کہ وہ معشوق کو جسمانی تکلیف دے۔ ”مرد سادی“ کا مطلب یہ ہے کہ ایسا مرد جو عورت کے حق میں ظالم ہو۔

کتاب کی اشاعت کے بعد پروفیسر گولڈ برگ سے جب ”ڈیلی ایکسپرس“ کا نمائندہ ملا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: ”مساوات نسواں کی علم بردار خواتین مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تمام انسانی معاشروں میں مرد کا عمومی غلبہ (male dominance) صرف سماجی حالات کی وجہ سے نہیں ہوسکتا“۔

اس فرق کی زیادہ حقیقت پسندانہ توجیہ یہ ہے کہ اس کو مردانہ ہارمون (male hormone) کا نتیجہ قرار دیا جائے جو کہ ابتدائی جرثومہ حیات پر اس وقت غالب آجاتے ہیں جب کہ وہ ابھی رحمِ مادر میں ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ چھوٹے بچے چھوٹی بچیوں سے زیادہ جارح ہوتے ہیں اور یہ فرق عین اس وقت ظاہر ہوجاتا ہے جب کہ ابھی وہ سماجی حالات کے زیر اثر بھی نہ آئے ہوں۔

WOMEN ARE BORN SUBORDINATE

"It's a rough old world for women, as the feminists never cease to remind us. They blame centuries of social conditioning- a kind of conspiracy whereby men all over the world somehow contrive to keep women in a subordinate role. A much simpler, and more probable explanation is that universal male dominance stems not from social oppression but fundamental differences between the sexes. This is the view put forward by

professor Steven Glodberg of New York in his book. The inevitability of Patriarchy which has earned him some shrill abuse from feminissts in America (''Fascist Pig" and "Male Sadist" are two of the milder epithets), and has upset a few here too, since he arrived to launch the British publication. "The feminists hate me," Goldberg told me cheerfully. "I like to think their intense wrath stems from my inherent rightness. Putting it simply I believe that the universality of male dominance in all societies cannot be explained by social conditioning."

"But it can be explained by the male hormone testosterone which 'programmes' the infant male for a life of greater aggression and dominance while he is still in the womb. "That's why little boys are clearly more aggressive than little girls even before they've had a chance to be socially conditioned. "And in later life this same dominance means that men are far more ready to sacrifice holidays, health and family for the sake of their career." In truth the feminist case is none too strong. If it really were true that male dominance was due to social conditioning rather than these male qualities, then surely somewhere in the world at some time a society would have evolved in which women were dominant. None has. And even in societies like those behind the Iron Curtain which boast of sexual equality, one sex is obviously "more equal" than the other. You can see it in Russia's 62-strong council of ministers. Not one is a woman.

After a lifetime spent researching the diverse societies of the world than expert woman anthropologist Margaret Mead, who is commonly thought to be on the feminist side, has declared:

> "All the claims so glibly made about societies ruled by women are nonsense. We have no reason to believe that they ever existed.... Men have always been the leaders in public affairs and the final authorities at home."

Does that mean that men are better than women? Professor Goldberg wags a warning finger. 'Not better, but different. 'The male brain works differently from the female brain. In I.Q. tests with men and women of similar intelligence levels, the men tend to score higher on logicaland deductive problems, though the women will generally do better in verbal skills.

"Unquestionably women have greater emotional awareness even before they have children. Little girls are commonly more thoughtful and sensitive to parental moods than little boys."

Professor Goldberg's proposition is quite simply,that they are much less likely to get to the top—and all because of testosterone. The masculinisation of the brain by this hormone has been demonstrated conclusively by experiments on female rats and other animals "And we have now found the same thing with human beings." says Goldberg.

The professor concludes; "The central fact is that men and women are different from each other from the gene to the thought to act. These differences flow from the biological natures of man and woman."

Women who deny their natures and covet a state of second-rate manhood are forever condemned to argue

against their own juices. The experience of men is that there are few women who can out-fight them and few who can out-argue them, but when a woman uses feminine means she can deal with any man as an equal. In this and every other society men look to women for gentleness, kindnes and love The basic male motivation is protection of women and children. "The feminist cannot have it both ways: if she wishes to sacrifice all this, all that she will get in return is the right to meet men on male terms. She will lose."

(*Daily Express,* London, July 4, 1977)

مساواتِ نسواں کے علَم برداروں کا مقدمہ، خالص علمی اعتبار سے زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ مرد کا غلبہ سماجی حالات کی وجہ سے ہے، نہ کہ پیدائشی خصوصیات کی وجہ سے، تو یقیناً کبھی نہ کبھی دنیا کے کسی خطہ میں ایسا معاشرہ ضرور بنتا جس میں عورتوں کو غلبہ حاصل ہوتا۔ جب کہ پوری معلوم تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ اشتراکی معاشرہ میں بھی ایسا نہیں ہے جو جنسی مساوات کا سب سے بڑا علَم بردار ہے۔ روس کی وزارتی کابینہ میں 62 وزرا شامل ہیں۔ مگر ان میں کوئی ایک بھی خاتون ممبر نہیں۔

علم الانسان کی ماہر خاتون ڈاکٹر مارگریٹ میڈ، جو خود بھی مساواتِ نسواں کی تحریک سے تعلق رکھتی ہیں، انھوں نے ساری عمر مختلف انسانی معاشروں کا مطالعہ کیا ہے، تاہم وہ لکھتی ہیں:

"ایسے تمام دعوے جن میں زور شور کے ساتھ ایسے معاشروں کا انکشاف کیا گیا ہے جہاں عورتوں کو غلبہ حاصل تھا، بالکل لغو ہے۔ اس قسم کے عقیدہ کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ہر دور میں مرد ہی امور عامہ کے قائد رہے ہیں۔ اور گھر کے اندر بھی اعلیٰ اختیار ہمیشہ انھیں کو حاصل رہا ہے۔"

پروفیسر گولڈ برگ کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مرد عورتوں سے بہتر (better) ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مرد عورتوں سے مختلف (different) ہیں۔ مرد کا دماغ اس سے مختلف طرز پر کام کرتا ہے جس طرح عورت کا دماغ کام کرتا ہے۔ یہ فرق چوہوں وغیرہ کے نر اور مادہ میں بہت واضح طور پر تجربہ کیا جا چکا ہے۔ کچھ عورتیں مستثنیٰ ہوسکتی ہیں۔ مگر وہ بہت معمولی اقلیت ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، رحمِ مادر سے لے کر سوچنے کی صلاحیت تک۔ یہ فرق دونوں کی حیاتیاتی نوعیت کے فرق سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ کسی قسم کے سماجی حالات سے۔ (ڈیلی اکسپریس، 4 جولائی 1977)

بنیادی فرق

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل (1944-1873) نے مذکورہ موضوع پر نہایت نفیس بحث کی ہے۔ وہ اس معاملہ کی حیاتیاتی تفصیلات پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

مرد اور عورت کے درمیان جو فرق پائے جاتے ہیں وہ محض جنسی اعضا کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، عمل یا طریقۂ تعلیم کی وجہ سے نہیں ہیں۔ وہ اس سے زیادہ بنیادی نوعیت کے ہیں۔ وہ خود نسیجوں کی بناوٹ سے پیدا ہوتے ہیں اور پورے نظام جسمانی میں خصوصی کیمیائی مادے کے سرایت کرنے سے ہوتے ہیں جو کہ خصیۃ الرحم سے نکلتے ہیں۔ ان بنیادی حقیقتوں سے بے خبری نے ترقیِ نسواں کے حامیوں کو عقیدہ تک پہنچایا ہے کہ دونوں صنفوں کے لیے ایک طرح کی تعلیم ایک طرح کے اختیارات اور ایک طرح کی ذمہ داریاں ہونی چاہئیں۔ باعتبار حقیقت عورت نہایت گہرے طور پر مرد سے مختلف ہے۔ عورت کے جسم کے ہر خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے۔ یہی بات اس کے اعضاء کے بارے میں بھی

درست ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کے بارے میں۔ عضویاتی قوانین بھی اتنا ہی اٹل ہیں جتنا کہ فلکیاتی قوانین اٹل ہیں۔ ان کو انسانی خواہشوں سے بدلا نہیں جا سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ان کو اسی طرح مانیں جیسے کہ وہ ہیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خود اپنی فطرت کے مطابق ترقی دیں، وہ مردوں کی نقل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تہذیب کی ترقی میں ان کا حصہ اس سے زیادہ ہے جتنا کہ مردوں کا ہے انھیں اپنے مخصوص عمل کو ہرگز چھوڑنا نہیں چاہیے۔

Woman Differs Profoundly from Man

"The differences existing between man and woman do not come from the particular form of the sexual organs, the presence of the uterus, from gestation, or from the mode of education. They are of a more fundamental nature. They are caused by the very structure of the tissues and by the impregnation of the entire organism with specific chemical substances secreted by the ovary. Ignorance of these fundamental facts has led promoters of feminism to believe that both sexes should have the same education, the same powers and the same responsibilities. In reality woman differs profoundly from man. Every one of the cells of her body bears the mark of her sex. The same is true of her organs and, above all, of her nervous system. Physiological laws are as inexorable as those of the sidereal world. They cannot be replaced by human wishes. We are obliged to accept them just as they are. Women should develop their aptitudes in accordance with their own nature, without trying to imitate the males. Their part in the progress of civilization is higher than that of men.

They should not abandon their specific functions."

(Dr. Alexis Carrel, *Man, The Unknown*, New York, 1949 p. 91)

انگریزی کے مشہور صحافی مسٹر خشونت سنگھ (1915-2014) نے پروفیسر آئی سنک (Hans Jurgen Eysenck, 1916-1997) کے حوالے سے اس سلسلہ میں جو لکھا ہے وہ قابلِ غور ہے۔

Why Women are Second-Rate

"As an ardent supporter of equal opportunities for women, I am constantly nagged by doubts about their creative ability. How is it that women have produced so few writers, poets, composers, artists of top calibre? How is it that even in professions which are traditionally regarded as theirs, e.g. cooking and dress designing, men beat them to the second place. All the famous chefs and dressmakers (even women's wear) are men. Hitherto I had accepted the sociologist's point of view that it was tradition and environment that militated against them. Somehow the sociological answer did not carry total conviction and I felt there was more than environment and lack of opportunity behind women's second-ratedness."

Professor H. J. Eysenck who invented the intelligence quotient (I.Q.) tests and pronounced that the black and brown races had a lower I. Q. than the white, has now proclaimed the same about women. Their genes make them what they are: from the time of conception their feminineness is programmed as in a computer. It is not,

as sociologists maintain, tradition or environment which makes a female child play with dolls while her brother plays with toy soldiers but her biological constitution. Even within the womb, the female develops a broader pelvis than the male. The broader the pelvis, the more feminine will its possessor be, says Eysenck. Males with broad pelvises tend to be feminine, passive, even homosexual. Females with narrow pelvises tend to be masculine, aggressive, even lesbian. Random sampling amongst your own acquaintances will confirm some of Eysenck's postulates. "Eysenck had earlier brought the wrath of the champions of racial equality on his head. Now women's libbers are out for his scalp with their rolling pins."

(*The Illustrated,* Weekly of India, April 2, 1978)

عورتوں کو مساوی مواقع دیے جانے کے ایک پُرجوش حامی کی حیثیت سے میں مسلسل طور پر ان کی تخلیقی صلاحیت کے بارے میں شبہ کا شکار رہا ہوں۔ ایسا کیوں ہے کہ عورتوں نے اعلیٰ درجہ کے ادیب، شاعر، آرٹسٹ اتنی کم تعداد میں پیدا کیے۔ ایسا کیوں ہے کہ ان شعبوں میں جو روایتی طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں، مثلاً طباخی اور لباس سازی، وہ مردوں کے مقابلے میں دوسرے درجہ پر ہیں۔ تمام مشہور طباخ اور لباس ساز مرد ہی ہیں (حتیٰ کہ عورتوں کے لباس کے بھی)۔

اب تک میں سماجی علما کے اس نقطۂ نظر کو مانتا رہا ہوں کہ یہ روایت اور ماحول ہے جس نے ان کے خلاف کام کیا ہے۔ مگر سماجی توجیہ سے مجھے پورا اطمینان نہ ہوسکا۔ میں محسوس کرتا رہا کہ ماحول یا مواقع کے فقدان کے علاوہ بھی کچھ اسباب ہیں جنھوں نے عورتوں کو مردوں سے پیچھے کر رکھا ہے۔

پروفیسر آئی سنک جنھوں نے ذہانت کا حسابی پیمانہ ایجاد کیا ہے، اور جن کا کہنا ہے کہ کالے اور سانولے رنگ کی نسلیں، سفید فام نسلوں کے مقابلہ میں کم تر ذہانت رکھتی ہیں۔ اب انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہی بات عورتوں کے لیے بھی صحیح ہے۔ ان کے جین دراصل ان کو بناتے ہیں۔ حمل کے وقت ہی سے ان کا زنانہ پن اسی طرح متعین اور مقرر ہوتا ہے جس طرح کسی کمپیوٹر میں۔ علمائے سماجیات کے دعویٰ کے برعکس، یہ روایت اور ماحول کا اثر نہیں ہے کہ ایک چھوٹی بچی گڑیوں کے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے اور ایک چھوٹا بچہ سپاہی کی صورت والے کھلونے سے کھیلتا ہے۔ یہ حیاتیاتی بناوٹ کا اثر ہے۔ حتی کہ ایک لڑکی جب کہ ابھی وہ رحمِ مادر میں ہوتی ہے وہ لڑکے کے مقابلہ میں زیادہ کشادہ پیڑو بنانے لگتی ہے۔ پیڑو جتنا زیادہ کشادہ ہوگا، اتنا ہی اس میں زنانہ پن زیادہ ہوگا۔ یہ بھی پایا گیا ہے کہ جن مردوں کے پیڑو چوڑے ہوتے ہیں ان میں زنانہ پن، انفعالیت حتی کہ ہم جنسی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جن عوتوں کے پیڑو کم چوڑے ہوتے ہیں ان میں مردانہ اوصاف جارحیت اور ہم جنسی کے رجحانات ہوتے ہیں۔ یہ تجربات اتنے قطعی ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے قریبی لوگوں کا جائزہ لے کر ان کی تصدیق کر سکتا ہے۔

آئی سنک اس سے پہلے نسلی مساوات کے حامیوں کا نشانہ تنقید رہا ہے۔ اب مساواتِ نسواں کے حامیوں نے بھی اس کے خلاف قلم اٹھالیا ہے اور اس پر سخت تنقیدیں کی جا رہی ہیں۔ —— خشونت سنگھ

عورت کی بے بسی

جدید تہذیب نے عورت کو برابر کا درجہ دینے کی کوشش میں یہ کیا کہ اس کو مستقل نابرابری کے درجہ پر پہونچا دیا۔ مغربی زندگی کے جس شعبے میں بھی عورت آج کام کر رہی ہے، وہاں وہ مرد کے مقابلے میں صرف دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز اس نابرابری

کی مزید قیمت اس کو یہ دینی پڑتی ہے کہ ہر جگہ وہ مرد کے مظالم کا شکار ہو رہی ہے۔ یہاں ہم امریکا کی کارکن خواتین کے بارے میں ایک رپورٹ کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ یہ رپورٹ انڈین ایکسپریس میں شائع ہوئی ہے:

یہ ایک دہلی بس جیسا تجربہ ہے۔ ذلیل اشارے، جارحانہ زبان، ذاتی حملے۔ امریکا میں کام کا مقام خاتون کارکنوں کے لیے ویسا ہی ہے جیسا کہ دہلی کی بس خاتون مسافروں کے لیے۔ ایک بینک کے پریسیڈنٹ سڈنی ٹیلر نے اپنے بینک کی ایک خاتون کارکن مائیکل ونسن کو جسمانی اذیت پہنچائی اور اس کی عصمت دری بھی کی۔ ایسا چار سال تک ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ مذکورہ خاتون عورتوں کی ایک تنظیم کی مدد سے عدالت گئی۔ ڈسٹرکٹ کورٹ نے اس کی اپیل رد کردی۔ زیادہ تر اس بنا پر کہ وہ چار سال تک خاموش رہی اور اس نے بینک کے شکایتی نظام سے مدد کی درخواست نہیں کی۔ عدالت نے کہا کہ دونوں کے درمیان جو بھی تعلّق تھا وہ رضا کارانہ تھا۔ ہائی کورٹ سے یہ مسئلہ ختم نہ ہوسکا اور آخر کار وہ سپریم کورٹ میں پہنچا۔ امریکا کی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ کسی کو جنسی طور پر ہراساں کرنا عورت کے روزگار کے حقوق کی براہ راست خلاف ورزی ہے۔ اس سے ایک مخاصمانہ ماحول پیدا ہوتا ہے۔ جس میں وہ اپنی ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہوسکتی ہے یا اپنا کام پوری طرح نہیں کرسکتی۔ حتیٰ کہ اگر اس قسم کا نامحمود جنسی مطالبہ براہِ راست طور پر روزگار کے مفادات سے وابستہ نہ ہو تب بھی عملاً اس کا مطلب ہے — میں جیسا کہتا ہوں ویسے کرو ورنہ تمہیں ملازمت سے نکال دیا جائے گا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ یہ طریقہ مقام عمل پر جنسی امتیاز کی ممانعت کے بارے میں امریکی قانون کی خلاف ورزی ہے۔

کام کرنے والی عورتوں کو دفتروں میں پریشان کیا جانا ایک وبا کی شکل اختیار کر گیا ہے، خواتین سے متعلق ایک تنظیم نے بتایا۔ پچھلے پانچ برسوں میں دفاتر میں کام کرنے والی خواتین

کی تقریباً نصف تعداد نے اس قسم کی بدسلوکی کا تجربہ کیا۔ یہ واقعات صرف کارخانوں میں اور مزدوروں کے ساتھ کام کرنے والی خواتین کے ساتھ پیش نہیں آتے۔ بلکہ اونچی بلڈنگیں اور شاندار دفاتر بھی اپنی خاتون کارکنوں کے لیے اچھے نہیں۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو سکریٹری ہیں یا قانون داں ہیں یا اور کسی اونچے عہدہ پر ہیں۔ مرکزی حکومت میں کام کرنے والی خواتین کی تقریباً 42 فی صد تعداد کو اپنے دفتروں میں پریشان کیا گیا۔ یہ بات ایک حالیہ سروے کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے۔ ریاستی حکومتوں کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والی 60 فی صد خواتین نے بتایا کہ جنسی بدسلوکی ان کے لیے ایک عام تجربہ بن چکا ہے۔ 1981 اور 1985 کے درمیان اس قسم کی شکایتوں کی تعداد 70 فی صد تک بڑھ گئی ہے۔

"They sound like experiences in a Delhi bus. Lewd gestures, offensive language, attacks on your person—the American workplace is for its women workers what public transport is for women in Delhi.

A bank teller, Michelle Vinson, suffered physical abuse and alleged rape by the bank's vice-president Sidney Taylor for four years until finally, assisted by a women's organisation, she went to court. The district court rejected her appeal, largely because she had remained silent for four years and had not used the bank's complaint procedure to ask for help. It held that any relationship between the two was voluntary. The higher court of appeal rejected every finding of the district court and the matter finally found its way to the Supreme Court. The Supreme Court of the United States ruled that sexual harassment is a direct infringement of a woman's right to employment. It creates a hostile and abusive

work environment in which she may be forced to leave her job or in which she cannot function to her full potential, even if such unwelcome sexual demands are not directly linked to concrete employment benefits. In other words, the court ruled that it violates U.S. civil laws against sex discrimination in the workplace. Sexual harassment of working women is endemic, said the friends-of-the court brief filed by numerous women's organisations for this case. In the last five years, about half the American female working force has suffered this type of harassment at work.

This does not just happen to women in factories or at blue collar workplaces. Within the fibreglass, multi-storied sky scrapers, the American office is not as pleasant for its women secretaries, lawyers, and other professionals as its air-conditioned, carpeted and muted decor makes it appear. About 42 percent of federally employed women were harassed in their jobs, stated a recent two-year survey done by the Official Merits Protection Board. Another 60 percent of the members of the American Federation of State, Country and Municipal Employees said that sexual harassment was a frequent problem for them. And between 1981 and 1985, the number of such complaints to the Equal Employment Opportunities Commission, established to monitor employment practices, shot up by 70 percent.

The complaints vary from the physical violence of rape and assault to the insidious harassment of unwanted pushing and touching, persistent sexual demands,

offensive sexual comments, constant conversations containing sexual innuendoes and coarse language.

The offender usually makes his moves swiftly and silently, when there are not witnesses around. He is usually confident that fear, embarrassment, and often the hopelessness of the situation will keep the victim from making public complaints. And when complaints are made, he can use every defence that this grey area of social attitudes and innuendoes provides. When it is so hard for a rape victim to prove she has been violated, one can imagine how much harder it is for a victim of the less dramatic forms of violence to prove her case. In such instances, if the offenders are their supervisors, women who resist or complain find themselves burdened with an increased workload, scathing work evaluation, unwarranted reprimands and sheer hostility. So many quit their jobs rather than go to court. When neither alternative seems feasible, they give in, quietly."

خاتون کارکنوں کی شکایتیں مختلف قسم کی ہیں۔ یہ عصمت دری سے لے کر دھکا دینا، چھونا، مسلسل جنسی مطالبات، جارحانہ قسم کے جنسی تبصرے اور گندی زبان استعمال کرنا ہے۔ مرد اپنی اس قسم کی حرکتیں اکثر ایسے مواقع پر کرتے ہیں جب کہ آس پاس کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو۔ اس کو اطمینان ہوتا ہے کہ خوف اور ناامیدی عورت کو اس سے روکے رہے گی کہ وہ دوسروں سے اس کی شکایت کرے۔ حتیٰ کہ اگر عورت شکایت کرے تب بھی مرد کو اطمینان رہتا ہے کہ وہ حالات کے اعتبار سے اپنا کامیاب دفاع کر سکے گا۔ جہاں عصمت دری جیسے سنگین مسئلہ کو ثابت کرنا مشکل ہو وہاں اس سے کمتر درجہ کی بدسلوکی کو کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح کے معاملات میں اگر ملزم وہ شخص ہو جو خاتون کارکن کا افسر ہے تو شکایت کرنے کی سزا خاتون کارکن کو یہ ملتی ہے کہ اس کے اوپر کام کا بوجھ بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس کے کام کو بے قیمت کیا جاتا ہے اور طرح طرح سے پریشان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سی عورتیں عدالت میں جانے کے بجائے ملازمت چھوڑ دیتی ہیں۔(انڈین اکسپریس 13 اگست 1986)

امریکا کے دفاتر میں خاتون کارکنوں کا یہ حال اس کے باوجود ہے کہ وہاں دونوں جنسوں کو مساوی درجہ دینے کے بارے میں باقاعدہ قوانین بنے ہوئے ہیں۔ خاتون کارکنوں کو نہ ستانے کے بارے میں بھی قوانین موجود ہیں۔ اس کے باوجود امریکی دفاتر میں عورت مظلوم بنی ہوئی ہے۔ اس کی مجبوری یہ ہے کہ وہ شوہر اور ماں اور باپ کو پہلے ہی چھوڑ چکی ہے۔ اب اگر وہ دفتر کو بھی چھوڑ دے تو کہاں جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی عورت کی یہ مجبوری نہ ہو تو مغربی دفاتر عورتوں سے خالی نظر آنے لگیں۔

مغربی دفاتر میں خاتون کارکنوں کا یہ حال اتفاقی نہیں اور نہ کسی بھی قانون کے ذریعہ اس کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہ مسئلہ اس سے زیادہ بڑا ہے کہ کوئی قانون اس کی روک تھام کر سکے۔ چڑیا اور بیل کو مساوی قرار دینے کے لیے آپ دونوں کو یکساں طور پر مقابلے کے میدان میں اتار دیں اور اس کے بعد چڑیا کچل اٹھے تو کیا اس "ظلم" کو قانون کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے۔ کیا ایسا کوئی قانون بنانا ممکن ہے کہ چڑیا اور بیل دونوں ٹکرائیں اس کے باوجود چڑیا کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرد کو قدرت نے صنف قوی بنایا ہے اور عورت کو صنف نازک یہ فرق دونوں کے اس کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہے جو قدرت دونوں سے الگ الگ لینا چاہتی ہے۔ دونوں کے تقسیم عمل میں تبدیلی فطرت کی خلاف ورزی ہے اور فطرت کی خلاف ورزی سے جو مسائل پیدا ہوں، ان کا حل دوبارہ فطرت سے مطابقت ہے۔ فطرت کی خلاف

ورزی کو باقی رکھتے ہوئے ان کو کسی بھی طرح حل نہیں کیا جاسکتا۔

پھول کو اگر آپ گلدستہ میں لگائیں تو وہ ایک اونچی سطح پر اپنے لیے باعزت جگہ پالے گا لیکن اگر آپ پھول کو میز کے پایے کے نیچے رکھنے لگیں تو وہ کچل کر مٹی میں مل جائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ مرد اور عورت کا ہے۔ عورت کو اگر گھر کے اندر رکھا جائے تو وہ بہن اور بیوی اور ماں کی حیثیت سے نہایت باعزت جگہ کی مالک بنے گی۔ لیکن اگر اس کو گھر سے نکال دیا جائے اور باہر کی دنیا میں اس کو مردوں کے "دوش بدوش" کھڑا کر دیا جائے تو اس کا وہی انجام ہوگا جو مغربی دنیا میں اس کے نتیجے میں عورت کا ہو چکا ہے۔ عورت کا صنف نازک ہونا گھر کے اندر اس کو گھر کی ملکہ بناتا ہے، عورت کا صنف نازک ہونا گھر کے باہر کی زندگی میں اس کو مظلوم اور حقیر بنا دیتا ہے۔

ایڈز کی لعنت

فطرت کی خلاف ورزی سے کیسے سنگین نتائج برآمد ہوتے ہیں اس کی ایک تازہ مثال وہ بیماری ہے جس کو ایڈز کہا جاتا ہے۔ ایڈز فطرت کی خلاف ورزی کی سزا ہے۔ چنانچہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ مرض غلط عادتوں، خاص طور پر ہم جنسی کے فعل کے سبب سے پیدا ہوتا ہے:

> "The group of people who run the high-risk of contracting the disease are promiscuous homosexuals, bisexual men, intravenous drug-abusers and those having multiple sexual partners. Its highest incidence is among male homosexuals."

ایڈز (AIDS) ایک اشاراتی نام ہے۔ یہ لفظ حسب ذیل انگریزی فقرہ کا مخفف ہے:

Acquired Immune Deficiency Syndrome

اس کا مطلب ہے — جسم کے مدافعتی نظام کی تباہی کی علامت۔ یہ ایک عجیب وغریب قسم کا متعدی مرض ہے جو صرف ملیریا کے بعد نمبر 2 پر سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساری انسانی تاریخ میں مجموعی طور پر جو موتیں ہوئی ہیں ان میں سے نصف موتیں صرف ملیریا کے ذریعہ ہوئی ہیں۔ اب موجودہ زمانے میں ایڈز کی بیماری ظاہر ہوئی ہے جو بعض اعتبار سے غالباً ملیریا سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

اس مرض کے جراثیم (Virus) آدمی کے اندر خاموشی سے داخل ہوجاتے ہیں۔حتیٰ کہ ابتداءً آدمی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کسی مہلک مرض کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ مرض آدمی کے جسم کے فطری دفاعی نظام کو بالکل تباہ کر دیتا ہے۔ ایڈز کے بعد تباہ شدہ مدافعتی نظام (Shattered Immune System) کا اب تک کوئی علاج دریافت نہ ہوسکا۔ کیوں کہ یہ بیماری خون میں شامل ہوجاتی ہے اور آدمی کے پورے جسم کو متاثر کر کے رکھ دیتی ہے۔

ایڈز کے مریض کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کا جسمانی نظام اندر سے بالکل کھوکھلا ہوجاتا ہے۔ اس کو چوٹ لگ جائے تو وہ کسی طرح اچھی نہیں ہوتی۔ بخار ہو تو کوئی دوا کام نہیں کرتی۔ انجکشن لگایا جائے تو وہ بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ اس کا خون کسی بھی دوا یا غذا کو قبول نہیں کرتا۔ بیمار کا وزن دن بدن گھٹتا رہتا ہے۔ وہ بے حد کمزور ہوجاتا ہے۔ وہ کوئی کھانے کی چیز کھا نہیں سکتا۔ اس کے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگتا ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اس کے اوپر ہر وقت بددلی اور اداسی چھائی رہتی ہے، وغیرہ۔

ایڈز کے مریض ایک قسم کے عالمی اچھوت بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ کسی کو تحفہ دیں تو ان کا تحفہ قبول نہیں کیا جاتا۔ کیوں کہ سخت اندیشہ ہوتا ہے کہ اس میں اس مہلک مرض کے جراثیم موجود ہوں گے وہ سیاحت کے لیے جائیں تو کال گرلس اور ہوٹلوں کے ملازم ان کے قریب آتے ہوئے ڈرتے ہیں ایسے لوگوں کے دوست لڑکے اور لڑکیاں ان سے دور بھاگتے

ہیں۔امریکا کے محکمہ صحت نے ڈاکٹروں کے نام سخت ہدایات جاری کی ہیں کہ جب وہ بلڈ بینک سے خون کا بوتل منگوائیں تو اس کو باضابطہ ٹیسٹ کے بغیر کسی مریض کو نہ دیں۔کیوں کہ یہ معلوم ہوا ہے کہ ہزاروں امریکی صرف اس لیے ایڈز کے مریض بن گئے کہ آپریشن یا خون کی کمی کے وقت ان کے جسم میں بلڈ بینک کا خون داخل کیا گیا تھا۔1985-86 کے درمیان صرف ایک سال میں امریکا میں ایسے ایڈز کے مریضوں کی تعداد تقریباً 50 ہزار تھی جو خود اس مرض کا شکار نہیں ہوئے تھے۔مگر کسی مریض کے ربط کے نتیجے میں ان کو یہ مرض لگ گیا۔

1986ء کے اعداد و شمار کے مطابق ایڈز کی مہلک بیماری اور اس سے تعلق رکھنے والی بیماریاں امریکا میں اس سے بہت زیادہ ہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔یہ بات امریکا وال اسٹریٹ جرنل میں بتائی گئی ہے جرنل نے بتایا کہ جو امریکی ایڈز کا شکار ہیں ان کی تعداد 21 ہزار ہے اور ان میں سے نصف کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ مرجائیں گے۔ ایک لاکھ سے دو لاکھ تک ایسے لوگ ہیں جو ایڈز سے تعلق رکھنے والی مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہے:

"AIDS IN AMERICA: The dreaded AIDS disease and related diseases are far more prevalent in the U.S. than is generally realised, according to a report in the Wall Street Journal. The paper said the number of Americans who suffer from AIDS is 21,000 and nearly half of them are expected to die. About 100,000 to 200,000 have AIDS-related diseases including lymphadenopathy, thrombocytopemia, candidiasis, diarrhoea, fever, hairy leukoplakia, dementia, neuropathy and Hodgkins."

(*The Times of India*, June 1, 1986)

جولائی 1986 کے پہلے ہفتہ میں پیرس میں ماہرین طب کی ایک کانفرنس ہوئی۔اس کا

مقصد ایڈز کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اگر ایڈز کے جراثیم امریکا کی طرح بقیہ دنیا میں پھیلتے ہیں تو 1991 میں تین لاکھ مزید ایڈز کے مریض پیدا ہو چکے ہوں گے۔ ماہرین کی پیشین گوئی کے مطابق اس وقت تک امریکا میں 74 ہزار نئے افراد ایڈز کے مرض میں مبتلا ہوں گے۔ اندازہ ہے کہ 1991 تک ایک چوتھائی ملین سے زیادہ امریکی باشندوں کو یہ بیماری لگ چکی ہوگی اور 179 ہزار افراد مرجائیں گے۔ امریکی اسپتالوں کا ایڈز کا بل اس وقت تک آٹھ بلین ڈالر ہو چکا ہوگا۔ اِس وقت یورپی ملکوں میں فرانس سب سے زیادہ اس مرض سے متاثر ہوا ہے۔ دوسرے نمبر پر مغربی جرمنی ہے۔ تیسرے نمبر پر برطانیہ اور چوتھے نمبر پر اٹلی:

> "According to experts participating in a conference on AIDS held in Paris last week, there will be 300,000 new cases of AIDS in 1991 alone if the virus spreads in the rest of the world as it has in the U.S. In the U.S., 74,000 new AIDS cases are forecast for the same year. It was estimated that by then more than a quarter of a million Americans would have caught the disease and 179,000 would have died. The U.S. hospital bill for AIDS for 1991 is forecast to be $ 8 billion. At present, France is the worst affected European country and had recorded about 700 cases by the first quarter of this year. West Germany is next with 457, Britain third with 340 and Italy fourth with 219."
>
> (*The Times of India*, New Delhi, July 5, 1986)

ایڈز کا مرض کیسے لگتا ہے، اس کے سلسلے میں معلوم کیا گیا ہے کہ اس کی وجہ جنسی انارکی، خاص طور پر ہم جنسی کا فعل (homosexual practice) ہے۔ موجودہ زمانے میں مغرب کے آزاد لڑکوں اور لڑکیوں میں اس کا رواج بہت بڑھ گیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کھلم کھلا

ہم جنسی کا فعل کرنے لگے تھے۔ مگراس غیر فطری فعل کی سزا انھیں ایک ایسے مہلک مرض کی صورت میں ملی کہ وہ خود ایک دوسرے سے بھاگنے لگے۔

تحقیقات کے دوران مزید معلوم ہوا ہے کہ افریقی جنگلوں میں بندروں کی ایک نسل پائی جاتی ہے جس کو عام طور پر ہرا بندر (green monkey) کہتے ہیں۔ ان بندروں میں بھی ایڈز کی قسم کا مرض پایا جاتا ہے۔ یہ بندر تمام معلوم جانوروں میں ایک استثنائی مثال ہیں جو عین وہی ہم جنسی کا فعل کرتے ہیں جس میں آج مغرب کی نوجوان نسل مبتلا ہے۔ اور اس فعل کے نتیجے میں وہ اسی مرض کا شکار رہتے ہیں جس کو موجودہ زمانے میں ڈاکٹروں نے ایڈز کا نام دیا ہے۔ ہرے بندروں کو شاید اللہ تعالیٰ نے عبرت کے طور پر دنیا میں رکھا تھا۔ تاکہ انسان ان کو دیکھ کر سبق لے اور ہم جنسی کا مہلک فعل نہ کرے۔ مگر انسان کی بڑھی ہوئی آزادروی نے اس کو یہ سبق نہ لینے دیا۔

سان فرانسسکو کو ہم جنسوں کی عالمی راجدھانی کہا جاتا تھا۔ اس امریکی شہر کے بارے میں ایک طبی رپورٹ بتاتی ہے کہ یہاں بہت تیزی سے ایڈز کی بیماری پھیل رہی ہے۔ 1986 کے ابتدائی چھ مہینوں میں ایڈز کے 520 نئے کیس معلوم کیے گئے ہیں۔ ان میں ہر تین میں سے دو کیس سخت مہلک ہیں۔ یعنی کل تعداد کا 67 فی صد۔ پچھلے سال مہلک مریضوں کی تعداد 58 فی صد تھی:

"AIDS is sweeping San Francisco, the city known as the 'gay capital of the world,' according to medical statistics published on Wednesday. Of the 520 new cases of AIDS recorded in the first six months of the year, more than two out of three—67 per cent—proved to be fatal. This compared with the previous record of 58 per cent fatalities last year." (*The Times of India*, July 4, 1986)

جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ایڈز کی بیماری کا ابتدائی سبب ہم جنسی کا فعل ہے، ہم جنسی کے دل دادہ لڑکے اور لڑکیاں اس فعل سے اس طرح دور بھاگ رہے ہیں جیسے کوئی شخص طاعون کے مریض کو دیکھ کر اس سے دور بھاگے۔ بعض علاقے جو اس سے پہلے ہم جنسی کا فعل کرنے والے "رندوں" سے معمور رہتے تھے۔ اب وہ سنسان ہوتے جا رہے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) کے مقالہ ہم جنسی (Homosexuality) میں بتایا گیا ہے کہ ہم جنسی کا فعل اگرچہ مغربی ملکوں میں پہلے سے موجود رہا ہے۔ تاہم اس فعل کا سائنسی مطالعہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی کیا جا سکا۔ پروفیسر کنسے (A.C. Kinsey) نے 1948-1952 کے درمیان امریکا میں باقاعدہ اعداد شمار جمع کیے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اُس وقت امریکی مردوں کی 37 فی صد اور امریکی عورتوں کی 13 فی صد تعداد ہم جنسی کا تجربہ کر چکی تھی۔ دوسرے مغربی ملکوں میں بھی کم وبیش یہ رواج پایا گیا ہے۔ (ایڈز کی طبی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، ٹائم 3 نومبر 1986)

مغربی ملکوں میں عام طور پر ہم جنسی کے خلاف قانون موجود نہیں ہیں۔ البتہ اگر مفعول کم عمر ہو یا فاعل نے اس کے ساتھ جبراً یہ فعل کیا ہو تو وہ غیر قانونی قرار پائے گا۔ اس سے پہلے مغرب میں ہم جنسی کے مرتکب کو تحقیری طور پر لوطی (Sodomy) کہا جاتا تھا۔ مگر اب اس کے لیے ایک بے ضرر لفظ رائج ہو گیا ہے، اور وہ گے (Gay) ہے۔ اس انگریزی لفظ کا مفہوم تقریباً وہی ہے جس کو اردو زبان میں رند یا رند منش کہتے ہیں۔ جو چیز پہلے عمل قوم لوط تھی۔ وہ اب محض خوش طبعی کے ہم معنی بن گئی۔

برطانیہ میں 1967 میں ہم جنسی کو ازروئے قانون جائز قرار دیا گیا تھا۔ اب مزید ترقی ہوئی ہے اور عام طور پر اس کو نکاح کی طرح ایک جائز ادارہ سمجھا جانے لگا ہے۔ ڈنمارک میں ہم جنسی کا فعل کرنے والے جوڑوں کے لیے وراثت کا وہی قانون منظور کیا گیا ہے جو شادی شدہ جوڑوں کے لیے ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ ڈنمارک کی پارلیمنٹ میں اس

موضوع پر رائے شماری ہوتی تو ممبران کی اکثریت نے اس کے حق میں رائے دی کہ جو ہم جنس جوڑے اس کا ثبوت دے دیں کہ وہ ایک ساتھ رہتے ہیں وہ ایک دوسرے کی وارثت میں میاں بیوی کی طرح حصہ دار قرار پائیں گے:

> "Denmark has granted homosexual and lesbian couples the same rights of inheritance as married couples, reports Reuter. The Danish parliament on Friday voted by 78 votes to 62 in favour of a law granting inheritance rights to couples who can prove they are living together. The new inheritance rights will also apply to brothers and sisters who share a home."
>
> (*The Times of India*, New Delhi, June 1, 1986)

موجودہ زمانے میں آزادی کے لامحدود تصور نے جو خرابیاں پیدا کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہم جنسی ہے۔ قدیم زمانے سے یہ طریقہ چلا آرہا تھا کہ ایک مرد اور عورت نکاح کے رشتہ میں بندھ کر باہم ازدواجی تعلق قائم کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں پہلے نکاح کے رشتہ کو غیر ضروری قرار دیا گیا۔ اس کے بعد لوگوں کی آزاد مزاجی یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے کہا کہ ازدواجی تعلق کے لیے مخالف جنس کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ مرد مرد اور عورت عورت بھی ایک دوسرے سے جنسی تعلق قائم کر سکتے ہیں۔ اس کو موجودہ زمانے میں خوبصورت طور پر جنسی اختیار (sexual preference) کا نام دیا گیا۔ مگر نتائج نے بہت جلد بتایا کہ فطرت کے نظام سے انحراف ہمیشہ فساد پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کے لیے ایک ہی صحیح راستہ ہے۔ یہ کہ وہ پیغمبروں کے بتائے ہوئے نظام فطرت پر عمل کرے۔ اگر اس نے اس سے انحراف کیا تو وہ کسی حال میں اس کے بُرے انجام سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔

مغرب کو فطرت سے انحراف کی بیک وقت دو قیمت دینی پڑی۔ ایک یہ کہ اس نے صنفِ نازک کو صنف قوی کے میدان میں کھڑا کر کے یہ کیا کہ صنف نازک کو مستقل طور پر کم تر حیثیت میں پہنچا دیا۔ امریکا میں قانون کے اعتبار سے عورت کو مکمل مساوات کا درجہ حاصل ہے۔ مگر قانونی مساوات ابھی تک عملی مساوات کی صورت اختیار نہ کرسکی۔ ایلن گڈمین (Ellen Goodman) کے الفاظ میں، امریکی خواتین ابھی تک مساوی درجہ پانے کا انتظار کر رہی ہیں۔

We're still waiting for equal status (*Time*, July 1987, p.45)

امریکا کی خاتون پروفیسر ڈاکٹر مانٹ گومری (Dr Louise F. Montgomery) نے جو بات امریکی صحافت میں عورت کے درجہ کے بارے میں کہی، وہی بات امریکی زندگی کے تمام شعبوں میں عورت کے درجہ کے بارے میں صحیح ہے۔ انھوں نے کہا:

"Women in the United States remain in the lower ranks in the newspaper hierarchy. Even in TV news programmes, the leaders who influence Americans are males."

(*The Hindustan Times,* New Delhi, August 23, 1986 p. 3)

امریکا کی اخباری دنیا میں عورتیں اب بھی نچلے درجہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ حتیٰ کہ ٹی وی خبروں کے پروگرام میں جو لوگ لیڈر ہیں اور امریکنوں پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ مرد ہی ہیں۔ عورت کے معاملہ میں فطرت سے انحراف کا دوسرا نقصان جدید ترقی یافتہ ملکوں کو یہ ملا کہ ان کا پورا معاشرہ جنسی آوارگی کا شکار ہو گیا اور اس کے نتیجے میں اتنے بے شمار مسائل پیدا ہو گئے جن کا شمار بھی آسان کام نہیں۔

عورت معاشرہ میں

قدیم معاشروں میں تقریباً ساری دنیا میں یہ صورت حال تھی کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں کم تر درجہ حاصل تھا۔ قدیم یونان میں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984) کے الفاظ میں، عورت کا مرتبہ اتنا گرا دیا گیا تھا کہ اس کی حیثیت بچہ پالنے والی غلام کی ہو کر رہ گئی تھی۔ عورتوں کو ان کے گھروں میں بند کر دیا گیا تھا۔ وہ تعلیم سے محروم تھیں۔ ان کا کوئی حق نہ تھا۔ ان کے شوہر ان کو بس گھر کے سامانوں میں سے ایک سامان سمجھتے تھے:

> "In Athens, woman's status had degenerated to that of slaves. Wives were secluded in their homes, had no education and few rights, and were considered by their husbands no better than chattels."

قدیم روم میں ایک عورت کی قانونی حیثیت کامل محکومی تھی۔ اولاً وہ اپنے باپ یا بھائی کی محکوم ہوتی تھی اور بعد کو اپنے شوہر کی۔ شوہر کو اپنی بیوی کے اوپر پدرانہ اختیار حاصل ہوتا تھا۔ قانون کی نظر میں عورت ضعیف العقل شمار ہوتی تھی:

> "In ancient Rome, a woman's legal position was one of complete subordination, first to the power of her father or brother and later to that of her husband, who held paternal power over his wife. In the eyes of the law, women were regarded as imbeciles."
>
> (*Encyclopedia Britannica,* 19/909)

عیسائیت نے بھی صورت حال کو کچھ بہتر نہیں بنایا۔ ہر معاملہ میں، حتی کہ مذہبی معاملہ میں بھی عورت کو کم تر درجہ دیا گیا۔ کرنتھیوں کے نام، پولس رسول، کے پہلے خط میں درج

ہے: پس فرشتوں کے سبب سے عورت کو چاہیے کہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔ (گنتی 1۔ کرنتھیوں، 10:11)

قدیم زمانے میں عورت کے ساتھ غلط سلوک کی وجہ وہی تھی جو دوسرے معاملات میں قدیم انسان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ یعنی توہماتی عقائد قدیم زمانے میں ہر معاملے میں انسان نے کوئی نہ کوئی بے بنیاد عقیدہ (irrational belief) قائم کرلیا تھا۔ یہی بے بنیاد عقائد قدیم لوگوں کے لیے مذہب کی حیثیت رکھتے تھے اور انھوں نے سارے انسانی سلوک کو بگاڑ رکھا تھا۔

مثلاً قدیم یونانیوں نے عورت کے بارے میں عجیب وغریب طور پر یہ عقیدہ بنالیا تھا کہ اس کے منہ میں کم دانت ہوتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے — ارسطو نے دعویٰ کیا کہ عورتوں کے دانت مردوں سے کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس نے دوبار شادی کی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اپنی بیویوں کے منہ کی جانچ سے اپنے اس بیان کی تصدیق کرے:

"Aristotle maintained that women have fewer teeth than men; although he was twice married, it never occurred to him to verify this statement by examining his wive's mouths."

(*The Impact of Science on Society,* 1976, p. 17)

اسی طرح عیسائیت نے عورت کے بارے میں یہ غلط عقیدہ بنالیا کہ وہ آدم کو جنت سے نکالنے کی ذمہ دار ہے۔ عیسائیت میں عورتوں کو بہکانے والی کی نظر سے دیکھا گیا جو کہ آدم کے ہبوط کی ذمہ دار تھی۔ اور وہ دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتی تھی:

"(In Christianity), they were regarded as temptresses,

responsible for the fall of Adam, and as second class human beings."

(*Encyclopedia Britannica,* 19/909)

عورت کا درجہ اسلام میں

قدیم دنیا میں مختلف توہماتی خیالات کے تحت عورت کو حقیر سمجھ لیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں عورت کو جن حقوق سے محروم کیا گیا ان میں سے ایک جائداد کا حصہ تھا۔ خاندان کی جائداد میں عورت کا حصہ ختم کر دیا گیا۔ یہ اسلام تھا جس نے تاریخ میں پہلی بار باقاعدہ طور پر عورتوں کا وراثتی حصّہ مقرر کیا۔ جے ایم رابرٹس نے لکھا ہے:

"Its coming was in many ways revolutionary. It kept women, for example, in an inferior position, but gave them legal rights over property not available to women in many European countries until the nineteenth century. Even the slave had rights and inside the community of the believers there were no castes nor inherited status. This revolution was rooted in a religion which—like that of the Jews—was not distinct from other sides of life, but embraced them all."

(J. M. Rober, *The Pelican History of the World,*
New York, 1984, p. 334)

اسلام کی آمد بہت سے پہلوؤں سے انقلابی تھی۔ مثال کے طور پر اس نے عورتوں کو اگرچہ کم درجہ دیا مگر اس نے عورتوں کو جائداد پر قانونی حق دیا جو کہ یورپ کے اکثر ملکوں کی عورتوں کو 19 ویں صدی عیسوی تک بھی حاصل نہ ہوسکا تھا۔ حتیٰ کہ غلام بھی حق رکھتے تھے اور اہل ایمان کی جماعت کے اندر نہ ذات پات تھی اور نہ پیدائشی درجات۔ اس انقلاب کی جڑیں ایک ایسے مذہب میں جمی ہوئی تھیں جو کہ یہود کی مانند صرف دوسری زندگی سے تعلق

نہیں رکھتا تھا بلکہ سب کچھ اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

دہلی ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس مسٹر راجندر سچر نے یہی بات قدیم ہندستان کے حوالہ سے کہی۔ نئی دہلی کی ایک تقریب میں مسٹر جسٹس سچر نے کہا کہ تاریخی طور پر اسلام عورتوں کو جائداد کے حقوق دینے میں بہت زیادہ فراخ دل اور ترقی پسند رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ 1956 میں ہندو کوڈ بل بننے سے پہلے ہندو عورتوں کا جائداد میں کوئی حصہ نہ تھا، جب کہ اسلام مسلم عورتوں کو یہ حقوق 1400 سال پہلے دے چکے تھا۔

> "Mr. Justice Sachar said that historically Islam had been very liberal and progressive in granting property rights to women. The fact that there were no property rights t Hindu women untill 1956 when the Hindu Code Bill was passed whereas Islam had granted these rights to Muslim women over 1400 years ago."

(*The Statesman*, Delhi, April 26, 1986)

تاہم یہ صرف پہلے اور بعد کی بات نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کے حقوق کا دروازہ کھولا ہے۔ قدیم زمانے میں تقریباً تمام سماجوں کا یہ حال تھا کہ ان کے یہاں عورتوں کو کوئی متعین حق حاصل نہ تھا۔ اسلام کے ذریعہ انسانی تاریخ میں جو انقلاب آیا۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ عورتوں کو مساوی درجہ دیا گیا اور ان کے حقوق مقرر کیے گئے۔

چوں کہ اسلام صرف ایک فلسفیانہ نظریہ نہ تھا بلکہ اس نے اس وقت کی آباد دنیا کے بیشتر حصّہ کو فتح کرڈالا۔ اسلام کی تہذیب دنیا کی سب سے زیادہ غالب تہذیب بن گئی اور ہزار سال تک مسلسل بنی رہی۔ اس چیز نے تمام دنیا کے معاشروں کو متاثر کیا۔ اسلامی تہذیب کے زیر اثر تمام دنیا میں عورت کے حقوق پر نظر ثانی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ عمومی طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا کہ عورتوں کو بھی اسی طرح حقوق ملنے چاہئیں جس طرح وہ مردوں کو ملے ہوئے ہیں۔

دورِ جدید کے جو مبصرین اسلام کی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ وہ بھی اکثر یہ جملہ دہراتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں کو کم تر درجہ دیا گیا ہے۔ مگر یہ بات اپنی تردید آپ ہے۔ قدیم زمانے میں اور آج بھی، وراثت کا معاملہ اہم ترین معاشرتی معاملہ ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وراثت وہ واحد معیار ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں کسی کو کیا درجہ دیا گیا ہے۔ اسلام کا وقت کے زمانی رواج کے سراسر برعکس جائداد میں عورت کو حصّہ دار بنانا واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام عورت کو کم تر درجہ دینا نہیں چاہتا۔ اگر اسلام میں عورت کو کم تر درجہ دیا جاتا تو اس کا سب سے پہلا مظاہرہ یہ ہوتا کہ وراثت میں اس کا حصّہ مقرر نہ کیا جاتا جو کہ زمانی رواج کے مطابق عین درست سمجھا جا رہا تھا۔

اس معاملہ میں مغربی ذہن کی غلطی دوبارہ وہی ہے جس کا شکار قدیم زمانے کا انسان تھا۔ یعنی بے بنیاد عقیدہ (irrational belief) کے تحت رائے قائم کرنا۔ قدیم زمانے کے انسان نے کچھ بے بنیاد عقیدے بنا لیے تھے جس کے نتیجے میں اس کے یہاں عورت کے بارے میں غلط قسم کے عمل رواج قائم ہو گئے۔ اسی طرح جدید مغرب نے عورت کے بارے میں ایک بے بنیاد عقیدہ بنالیا۔ اس کے نتیجے میں عورت کا معاملہ بگڑ کر رہ گیا۔

عورت جدید تہذیب میں

جدید مغربی انسان کی اصل مشکل یہ ہے کہ اس نے بے بنیاد طور پر عورت اور مرد کے درمیان صنفی مساوات کا عقیدہ بنالیا۔ اس عقیدہ کی بنا پر اس کے نزدیک عورت کو مساوی درجہ دینے کے معنی یہ بن گئے کہ اس کو زندگی کے تمام شعبوں میں مرد کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا جائے۔ چوں کہ اسلام عورت اور مرد کا دائرہ کار الگ الگ قرار دیتا ہے، اس لیے جدید انسان یہ فرض کر لیتا ہے کہ اسلام نے عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں یہ کہا جا رہا ہے کہ عورت کو ہر شعبہ میں مرد کے برابر جگہ دو۔ اس بنا پر جدید انسان نے یہ

رائے قائم کرلی کہ مغرب میں اس کو برتر درجہ دیا جا رہا ہے۔

مگر عملی صورت حال کیا ہے۔ مغرب کے انتہائی ترقی یافتہ سماج میں بھی عورت کو ایک اعتبار سے عملاً وہی درجہ ملا ہوا ہے جو قدیم معاشرہ میں اسے حاصل تھا۔ آج بھی مغرب میں مرد اور عورت کے درمیان عملی تقسیم ہے۔ عورت کے شعبے الگ ہیں اور مرد کے شعبے الگ۔ پچھلے باب میں ہم نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ جدید مغرب کے کسی بھی شعبہ میں عورت اور مرد کو عملی طور پر برابری کا وہ درجہ حاصل نہیں جس کا مغرب کے مفکرین نظری طور پر اعلان کرتے رہے ہیں۔

چودہ سو سال پہلے اسلام نے بھی آزادیِ نسواں کی ایک تحریک چلائی تھی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ عورت کو مصنوعی بندشوں سے نکالا جائے اور اس کو وہ مقام دیا جائے جو ازروئے حقیقت اس کو ملنا چاہیے۔ (مثلاً گھر کی جائداد میں دوسرے اہل خاندان کی طرح اس کا وراثتی حصّہ مقرر کرنا)۔ اسلام کی اس تحریک نے عورت کا درجہ بلند کیا۔ بغیر اس کے کہ سماج میں کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوا ہو۔ اسلام کا تجربہ وحی کی روشنی میں کیا گیا، اس لیے وہ حدود کے اندر تھا۔ اس کے برعکس جدید مغرب کا تجربہ عقل کی روشنی میں (زیادہ صحیح الفاظ میں جذبات کے تحت) کیا گیا، اس لیے وہ حدود کا پابند نہ رہ سکا۔ اس تجربہ نے نئے نئے سماجی مسائل پیدا کر دیے۔

غیر فطری مساوات

ایڈورڈ ولیم نے قرآن کے منتخب حصّوں کا انگریزی ترجمہ تیار کیا تھا جو پہلی بار 1843ء میں لندن سے چھپا تھا۔ اس کتاب کے دیباچہ میں انگریز مستشرق نے لکھا کہ اسلام کا سب سے کمزور پہلو اس کا عورت کو کمتر درجہ دینا (degradation of woman) ہے۔ اس کے بعد سے اب تک اس بات کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ بات اتنی عام ہوئی

کہ نہ صرف اسلام کے کھلے دشمن اس کو دہراتے ہیں بلکہ اسلام کا اعتراف کرنے والے نسبتاً منصف مزاج مورخین، مثلاً جے۔ ایم رابرٹس جیسے لوگ بھی اس کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ وہ کوئی ثابت شدہ واقعہ ہو۔

اس کتاب کے دوسرے مقامات پر ہم نے تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس الزام کے بالکل برعکس اسلام نے عورت کے مرتبہ کو بڑھایا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں صرف دو تہذیبیں ہیں۔ جنھوں نے عورت کے مرتبہ کو گھٹایا۔ ایک، قدیم مشرکانہ تہذیب، اور دوسرے جدید ملحدانہ تہذیب، اول الذکر نے نظری اور عملی دونوں حیثیت سے اور ثانی الذکر نے عملی حیثیت سے۔

قدیم مشرکانہ تہذیب اوہام وخرافات (myths) پر قائم تھی۔ چیزوں کے بارے میں فرضی طور پر کچھ بے بنیاد رائیں قائم کرلی گئی تھیں اور زندگی کے تمام معاملات کو انھیں مفروضات کے تابع کردیا گیا تھا۔ قدیم انسان نے کچھ چیزوں (مثلاً سورج اور چاند کو) فرضی طور پر بڑا سمجھ لیا۔ اور انھیں پوجنے لگا۔ اسی طرح اس نے کچھ چیزوں کو چھوٹا سمجھ لیا اور ان کو حقیر بنادیا۔ انھیں حقیر چیزوں کی فہرست میں عورت بھی شامل تھی۔ عورت کے یہاں ماہواری کا آنا، عورت کا جنگ میں نہ لڑسکنا، اس طرح کی باتوں کی توہماتی تعبیر کرکے یہ سمجھ لیا گیا کہ عورت ایک حقیر جنس ہے اور اس کے ساتھ مرد کے مقابلہ میں کم تر درجہ کا سلوک کرنا چاہیے۔

جدید مغربی تہذیب نے نظری طور پر بظاہر عورت کا درجہ بلند کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے کہا کہ عورت اور مرد دونوں ہر حیثیت سے برابر ہیں۔ ہر وہ کام جو مرد کرتا ہے وہی کام عورت بھی کرسکتی ہے۔ اس لیے عورت کو گھر سے باہر نکل کر زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کے برابر مقام حاصل کرنا چاہیے۔ اس نظریہ کے علم برداروں نے جو نعرے اختیار کیے، ان میں سے ایک نعرہ یہ تھا کہ کافی نہ بناؤ، پالیسی بناؤ:

عورت کے بارے میں جدید تہذیب کا یہ نظریہ بظاہر عورت کا درجہ بلند کرنے کے ہم معنی ہے۔ مگر عملی طور پر وہ صرف عورت کا درجہ گرانے کے ہم معنی ثابت ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ برابری کے خوبصورت دعووں کے باوجود زندگی کے تمام جدید شعبوں میں عورت کا درجہ مرد سے کم ہے۔ اگلے باب "مغربی عورت" میں ہم نے اس کو تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ، ایک لفظ میں، مساوات کا غلط تصور ہے۔ مردوں کے درمیان مساوات ایک تسلیم شدہ نظریہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اگر ایک مرد اور دوسرے مرد کے درمیان مساوات کا مطلب یہ ہو کہ ہر میدان میں ہر مرد دوسرے مرد کا مقابلہ کرسکتا ہے تو یہ نظریہ سراسر بے معنی ہو جائے گا۔

انسانی مساوات کا مطلب اگر کچھ لوگ یہ سمجھ لیں کہ ہر آدمی کو ہر شعبہ میں کام کرنا چاہیے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس قسم کی غیر فطری مساوات کا کوئی علم بردار آئن سٹائن کو ایک ایسی آبادی میں لے جائے گا جہاں صرف باکسر (boxers) بستے ہوں اور وہاں وہ آئن سٹائن کو باکسروں کے ساتھ "عمل" میں لگا دے گا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مساوات کا نتیجہ صرف غیر مساوات کی صورت میں برآمد ہوگا۔ یونیورسٹی یا سائنس کانفرنس میں جو آئن سٹائن ٹاپ پر نظر آرہا تھا وہ باکسروں کی مقابلہ گاہ میں کم تر درجہ کا انسان بن کر رہ جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مساوات کا مطلب عمل میں مساوات نہیں بلکہ حیثیت میں مساوات ہے۔ مساواتِ انسانی یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی وہی کام کرے جو کام دوسرا آدمی کر رہا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر آدمی کو یکساں عزت ملے، ہر ایک کو یکساں احترام کی نظر سے دیکھا جائے۔ ہر ایک کے ساتھ یکساں اخلاقی سلوک کیا جائے۔

مرد اور عورت کے معاملہ میں مغرب کی غلطی یہی ہے کہ اس نے دونوں جنسوں کے

درمیان مذکورہ بالا قسم کی غیر فطری مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ مرد اور عورت کے درمیان تاریخ کی سب سے بڑی عدم مساوات قائم ہوگئی۔

مرد اور عورت دو الگ الگ جنسیں ہیں اور دونوں کی تخلیق الگ الگ مقاصد کے تحت ہوئی ہے۔ دونوں کو اگر ان کی تخلیق کے اعتبار سے ان کے اپنے میدان میں رکھا جائے تو دونوں اپنے اپنے میدان میں مساوی طور پر کامیاب رہیں گے۔ اور اگر مرد اور عورت دونوں کو ایک ہی میدان میں ڈال دیا جائے تو عورت وہ کام نہ کرسکے گی جو مرد اپنی تخلیقی صلاحیت کے اعتبار سے زیادہ بہتر طور پر کرسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت مرد کے مقابلے میں کم درجہ کی جنس بن کر رہ جائے گی۔

ایک لڑکی اپنے گھر سے بگڑ کر بھاگ گئی۔ وہ ایک شہر میں پہنچی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہاں وہ مردوں کی طرح کمائی کرکے اپنی آزاد زندگی بنا سکے گی۔ مگر مردانہ شعبوں میں سے کسی شعبہ میں اسے جگہ نہ مل سکی۔ اس کے بعد جو چیز اس کے پاس باقی رہ گئی تھی وہ اس کی نسوانیت تھی۔ اس نے اپنی نسوانیت کو بازار کا سودا بنا دیا۔ اس کو آزاد زندگی مل گئی۔ مگر یہ آزاد زندگی اپنے آپ کو مرد کا سامان تفریح بنانے کی قیمت پر تھی، نہ کہ سماجی زندگی میں ''برابری'' کا درجہ حاصل کرنے کی قیمت پر۔

یہی حال زیادہ بڑے پیمانہ پر مغربی عورت کا ہوا ہے۔ مغرب نے اپنی عورتوں میں یہ مزاج بنایا کہ وہ باہر اگر مردوں کی طرح کمائیں۔ مگر عورت جب گھر سے نکل کر باہر آئی تو اس کو معلوم ہوا کہ موجودہ شعبوں میں وہ مرد کی طرح کام کرکے اپنی قیمت حاصل نہیں کرسکتی۔ اب کمائی اور آزادانہ زندگی حاصل کرنے کی خاطر اس کے پاس دوسرا بدل صرف ایک تھا اور وہ اس کا نسوانی جسم تھا۔ مذکورہ لڑکی کی طرح اس کو بھی اپنے نسوانی جسم کو بازار کا سودا بنانا پڑا۔ اس غیر فطری اور غیر اخلاقی عمل سے عورت کو نام نہاد برابری کا درجہ تو نہیں ملا۔ البتہ

اس کے نتیجے میں بے شمار نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ ان میں ایک مسئلہ وہ ہے جس کو عریانیت (pornography) کہا جاتا ہے۔ عریانیت کوئی علاحدہ مسئلہ نہیں، یہ بے قید آزادی کا وہ لازمی نتیجہ ہے جس کو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

عریانیت کا مسئلہ

عریانیت (pornography) سے مراد عشق و محبت کے مناظر پیش کرنا ہے، خواہ کتابوں میں یا تصویروں میں یا فلم میں جن کا مقصد جنسی جذبہ بھڑکانا ہو۔ دنیا کے اکثر ملکوں میں عریاں مواد قانونی ممانعت کا موضوع بن رہا ہے اس کی وجہ حسب ذیل دو مفروضے ہیں:

(1) عریاں مواد نوجوانوں یا نوجوانوں اور بالغوں دونوں کے اخلاق کو بگاڑنے والا ہے۔

(2) اس طرح کی چیزوں کا استعمال جنسی جرائم پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے:

> "Pornography is the representation of erotic behavior, as in books, pictures, or films, intended to cause sexual excitement. Pornographic matter has fallen under legislative prohibition in most countries in the world on at least one of the following assumptions:
>
> (1) pornography will tend to deprave or corrupt the morals of youth, or of adults and youth; and
>
> (2) consumption of such matter is a cause of sexual crimes."
>
> (*The Encyclopedia Britannica,* 1984, Vol. VII, p. 127)

عریانیت اب مغربی ملکوں میں انڈسٹری بن چکی ہے۔ صرف امریکا میں اس کے تحت سالانہ آٹھ بلین ڈالر کا کاروبار ہوتا ہے۔ ایک امریکی کمیشن نے امریکہ میں ہونے والے جنسی جرائم کا سبب عریانیت کو قرار دیا ہے اور اس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے:

"A U.S. government commission has issued a report linking sex crimes with hard-core pornography. The commission, headed by then U.S. Attorney General Mr. Edwin Meese, called for a law enforcement effort of unprecedented scope against the $8 billion-a-year pornography industry."

(*Times of India,* 11 July, 1986)

محکمۂ انصاف (واشنگٹن) کے تحت قائم شدہ ایک کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ اکثر عریاں سامان جو امریکا میں فروخت ہوتا ہے وہ امکانی طور پر نقصان دہ ہے اور تشدد پیدا کر سکتا ہے۔ عریانی پر اٹارنی جنرل کے کمیشن نے اپنے آخری رپورٹ میں یہ سفارش کی ہے کہ عریانی کی صنعت کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اس کی تجویز میں یہ بھی شامل ہے کہ عریانی کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت جرمانے کیے جائیں۔ رپورٹ نے یہ پایا ہے کہ عریانی کی اشاعت اکثر جنسی تشدد، جنسی جبر اور نا مطلوب جنسی جارحیت کا سبب بنتی ہے۔

کمیشن کے یہ نتائج اس سابقہ کمیشن سے مختلف ہیں جو 1970 میں صدر امریکا نے قائم کیا تھا۔ سابقہ کمیشن نے کہا تھا کہ عریانی اور تشدد یا دوسرے سماجی دشمن سلوک میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔

اٹارنی جنرل ایڈون میسی کا تشکیل کردہ کمیشن پچھلے سال قائم ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ امریکا کا بیشتر عریاں لٹریچر عورتوں کا رتبہ گرانے (degrading) کے ہم معنی ہے۔

رپورٹ نے کہا کہ ہم متفقہ طور پر اور پر اعتماد طور پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حاصل شدہ معلومات شدت سے اس خیال کی تائید کرتی ہیں کہ جنسی طور پر پُرتشدد سامان کی قابل لحاظ حد تک نمائش سماج دشمن اعمال اور جنسی تشدد کا سبب بنتی ہے۔ نیز کچھ طبقوں کے لیے امکانی طور پر جنسی تشدد کے غیر قانونی عمل کے لیے۔

کمیشن نے مزید کہا ہے کہ عریانیت کی صنعت اور منظم جرائم میں قریبی رشتہ پایا جاتا ہے۔ بظاہر اس کی مضبوط شہادتیں موجود ہیں کہ عریاں میگزین کے کچھ حصّے اور عریاں فلمی صنعت وغیرہ، یا تو براہ راست یا بالواسطہ طور پر جرائم پیشہ طبقہ کے ہاتھ میں ہیں۔

Degrading Women

"A justice department commission has concluded that most pornography sold in the United States is potentially harmful and can lead to violence. In an introduction to its final report, the Attorney General's commission on pornography urged action against the pornography industry, including more severe penalties for violation of obscenity laws. The report found that exposure to most pornography bears some causal relationship to the level of sexual violence, sexual coercion or unwanted sexual aggression.

The commission's conclusions conflict with those of a 1970 presidential commission that found no link between pornography and violence or other anti-social behavior. The 11-member commission formed by Attorney General Edwin Meese said most pornography in the United States would be classified as "degrading," particularly to women. "We have reached the conclusion, unanimously and confidently, that the available evidence strongly supports the hypothesis that substantial exposure to sexually violent materials as described here bears a causal relationship to anti-social acts of sexual violence and, for some subgroups, possibly to unlawful acts of sexual violence," the report said. The commission also concluded that there were ties between the pornography industry and organized crime. "There seems strong evidence that significant portions of the pornography magazine industry

are either directly operated or closely controlled by La Cosa Nostra members or very close associates," the commission said." (By arrangement with *The International Herald Tribure*, Washington)

(*The Times of India*, New Delhi, 23 May 1986)

بے قیدی کے نتائج

عورت کو گھر سے باہر لانا، مرد اور عورت کا آزادانہ اختلاط اور عریانیت کی کثرت کا لازمی نتیجہ شہوانی جذبات کا اشتعال ہے۔ جدید مغرب میں شہوانی جذبات کا اشتعال لامحدود سطح پر پیدا ہوا۔ اس لامحدود اشتعال کی تسکین کے لیے نکاح کا طریقہ ناکافی تھا۔ چنانچہ دھیرے دھیرے آزاد جنسی تعلق کا ذہن پیدا ہونا شروع ہوا۔ ایک نیا لٹریچر بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہوا جس میں مرد اور عورت کے درمیان آزادانہ جنسی تعلق کو اتنا ہی فطری اور بے ضرر قرار دیا گیا جتنا دو دوست کا آپس میں ہاتھ ملانا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ نکاح کو بوجھ سمجھ کر اس سے دور ہونے لگے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے نکاح کے بغیر ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ حتی کہ اب ''غیر شادی شدہ جوڑے'' کی اصطلاح مغرب میں اسی طرح ایک جائز اصطلاح سمجھی جاتی ہے جیسے شادی شدہ جوڑے کی اصطلاح۔

خدائی شریعت نے عورت اور مرد کے درمیان جو توازن قائم کیا تھا، اس کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کا تکملہ (complements) ہیں، وہ ایک دوسرے کا مثنیٰ (duplicates) نہیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں آزادیِ نسواں کی تحریک نے اس کے برعکس دعویٰ کیا۔ اس نے کہا کہ نہیں، عورت اور مرد ایک دوسرے کا مثنیٰ ہیں۔ یعنی جو عورت ہے وہی مرد ہے اور جو مرد ہے وہی عورت ہے۔

اس نظریہ کو موجودہ زمانہ میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ عورت اور مرد کے

درمیان قائم شدہ وہ توازن ٹوٹ گیا جو سیکڑوں برس سے دونوں کے درمیان پایا جارہا تھا۔ مگر اس کے نتیجے کو دیکھیے تو توازن ٹوٹنے کا کوئی فائدہ انسانیت کو نہیں ملا۔ البتہ اس کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

عورت کے معاشی استقلال کے بطن سے سب سے پہلے جو چیز پیدا ہوئی وہ طلاق کی کثرت ہے۔ عورت کے بارے میں جدید تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ وہ مرد کے مقابلے میں جذباتی (emotional) ہوتی ہے۔ وہ فوری تاثر کے تحت ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ کرسکتی ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے عورت کا معاشی طور پر آزاد نہ ہونا اس کی جذباتیت پر ایک قسم کا روک تھا۔ وہ جب ازدواجی زندگی سے آزردہ ہوتی تھی تو احساس اس کو روک دیتا تھا کہ اگر وہ طلاق لے لے تو کہاں رہے گی۔ مگر موجودہ زمانے میں ایک عورت کے لیے یہ اندیشہ باقی نہ رہا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) نے بتایا ہے کہ دنیا کے صنعتی ملکوں (industrialized parts of the world) میں طلاق کی شرح میں بہت اضافہ ہوگیا ہے، اور اس کی وجہ عورتوں کا معاشی استقلال ہے۔

(*Encyclopedia Britannica,* Vol. III, p. 586)

مغربی دنیا میں طلاقوں کی تعداد خطرناک حد تک زیادہ ہوگئی ہے۔ فرانس کے شہروں میں 50 فی صد شادیاں طلاق پر ختم ہوتی ہیں۔ کناڈا میں ان کی تعداد تقریباً 40 فی صد ہے۔ اسی طرح امریکہ میں طلاق کی شرح 50 فی صد تک پائی گئی ہے۔ امریکا 10 خواتین میں چھ وہ ہیں جو طلاق کا تجربہ کرچکی ہیں۔ (پلین ٹروتھ مئی 1986)

کم سن مجرمین

جدید دور میں عورت کو گھر سے باہر نکال کر زندگی کے ہر شعبہ میں داخل کیا گیا۔ اس کا یہ فائدہ تو نہیں ہوا کہ عورت کو فی الواقع زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کے برابر مقام مل گیا ہو۔

البتہ اس کے نتیجے میں بے شمار نا قابلِ حل مسائل پیدا ہو گئے۔ ان میں سے ایک نا جائز جنسی تعلقات کا مسئلہ ہے۔ عورت اور مرد کا آزادانہ اختلاط اور نا جائز جنسی تعلقات بالکل لازم وملزوم ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

نا جائز جنسی تعلق ابتداءً ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب ایک مرد اور ایک عورت کے تعلق سے ایک تیسرا بچہ پیدا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی سادہ فعل نہ تھا۔ بلکہ اپنے بعد سنگین نتائج رکھتا تھا۔ مغربی ملکوں کے نوجوان عام طور پر منع حمل کی تدبیر پر عمل کرتے ہیں۔

اس کے باوجود وہاں کثیر تعداد میں نا جائز بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ برطانیہ میں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ ان میں ہر پانچ میں ایک بچہ وہ ہوتا ہے جو نا جائز جنسی تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر تین حمل میں سے ایک حمل غیر شادی شدہ جوڑوں کے ذریعہ قرار پا رہا ہے۔ یہ بات لندن سے چھپنے والی 1985 کی رپورٹ میں بتائی گئی ہے:

ILLEGITIMATE KIDS: "Nearly one in five children born in Britain was illegitimate and that nearly one in three had been conceived by unmarried parents, an official report in 1985 revealed in London." reports AFP.

(*The Times of India,* May 17, 1986, p. 9)

یہ نا جائز بچے اس حال میں دنیا میں آتے ہیں کہ انھیں نہ اپنے باپ کا علم ہوتا ہے اور نہ اپنی ماں کا۔ وہ سرکاری اداروں میں پلتے ہیں اور پھر جانور کی طرح سماج میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں طلاقوں کی کثرت نے بھی یہی صورت حال پیدا کی ہے۔ مغربی ملکوں میں نکاح کا رشتہ بے حد کمزور ہو گیا ہے۔ معمولی معمولی باتوں میں عورت اور مرد کے درمیان طلاق ہو جاتی ہے۔ ان طلاقوں نے بہت بڑے پیمانہ پر وہ مسئلہ پیدا کیا ہے جس کو اجڑے

ہوئے گھر (broken homes) کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ عورت اور مرد، جب طلاق لے کر جدا ہوتے ہیں تو عین اسی وقت وہ اپنے بچوں کو بھی ماں اور باپ کے سایہ سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہ تمام بچے معاشرہ میں جانوروں کی طرح پلتے ہیں اور پھر انھیں کے اندر سے وہ مجرمانہ کردار ابھرتے ہیں جن کا ایک تجربہ "شوبھراج" کی صورت میں 1986 میں ہندستان میں کیا گیا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) نے کم سن مجرمین کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے بوکھلا دینے والے سماجی روگوں میں سے ایک روگ وہ ہے جس کو کم سنی کا جرم کہا جاتا ہے۔ یہ ایک عالمی مظہر ہے۔ اگر چہ کیفیت اور رفتار کے اعتبار سے ایک ملک اور دوسرے ملک میں فرق پایا جاتا ہے:

> "Among the most baffling social maladies of the 20th century is that of juvenile delinquency. A world-wide phenomenon, it varies in quality and frequency from country to country." (11/913).

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ انسان کا بچہ سب سے زیادہ کمزور بچہ ہوتا ہے۔ وہ تمام زندہ چیزوں میں سب سے زیادہ اپنے ماں باپ کی محبت اور سرپرستی کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر عورت کے معاملہ میں مغربی تہذیب کی غیر فطری روش کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بچے اس نعمت سے محروم ہو گئے جس کو قدرت نے ماں باپ کی شکل میں ان کے لیے پیدا کیا تھا۔ کہیں وہ اس لیے محروم ہیں کہ باپ کے ساتھ ماں بھی سارے دن دفتر میں کام کرتی ہے۔ کہیں وہ اس لیے محروم ہیں کہ ان کے ماں باپ نے انھیں پیدا کر کے باہم علاحدگی اختیار کر لی اور کوئی ایک طرف چلا گیا اور کوئی دوسری طرف۔ کہیں وہ اس نعمت سے اس لیے محروم ہیں کہ جو مرد اور عورت ان کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہیں انھوں نے رشتہ نکاح میں اپنے آپ کو

باندھے بغیر جنسی فعل کیا تھا۔ اس لیے ان کے پروگرام میں یہ شامل ہی نہ تھا کہ وہ پیدا ہونے والے بچہ کو اپنا بچہ سمجھیں اور اس کی دیکھ بھال کریں۔

یہی والدین سے محروم بچے ہیں جو بالآخر چارلس شوبھراج جیسے انسان بنتے ہیں۔ چارلس شوبھراج کا باپ ہندستانی تھا اور ماں یوروپین تھی۔ انھوں نے نکاح کیا اور پھر ایک بچہ پیدا کرنے کے بعد ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ چارلس شوبھراج کی پرورش ایک آزاد لڑکے کی حیثیت سے ہوئی۔ اس کی مناسب تعلیم بھی نہ ہو سکی۔ دھیرے دھیرے وہ مجرم بن گیا۔ اس نے عالمی سطح پر ڈاکے ڈالے اور قتل کیے۔ اب وہ بے حد خطرناک مجرم کی حیثیت سے ہندستان کی جیل میں ہے۔

مغربی ممالک میں کم سن مجرمین کے مسئلہ کا وسیع پیمانہ پر مطالعہ کیا گیا ہے اور بہت سے نتائج نکالے گئے ہیں۔ ان میں سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ کم سنی کا جرم اکثر وہ بچے کرتے ہوئے پائے گئے ہیں جو ماں باپ سے محرومی کی وجہ سے جھنجھلاہٹ اور منفی ذہنیت میں مبتلا تھے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے اڈیشن 1984 میں بتایا گیا ہے کہ اس قسم کے بچے اکثر نفسیاتی بے اعتدالی (psychological abnormality) میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر ان سے طرح طرح کے سماجی جرائم ظہور میں آتے ہیں۔ ٹائم (19 اکتوبر 1987) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکا میں ہر سال تقریباً تین سو بچے اپنے باپ یا ماں کو قتل کر دیتے ہیں۔ (صفحہ 60)

مغربی عورت

''ٹائم''، مشہور امریکی ہفتہ وار میگزین ہے۔ اس کی ہر اشاعت میں کسی خصوصی موضوع پر تفصیلی رپورٹ ہوتی ہے۔ اس کی 20 مارچ 1972 کی اشاعت میں ''امریکی عورت'' سے متعلق معلومات درج ہیں۔ اس رپورٹ کو میگزین کے وسیع ادارتی اسٹاف کی 20 خواتین نے خصوصی جدوجہد سے مرتب کیا ہے۔ پرچہ کا بیشتر حصّہ اسی موضوع پر مشتمل ہے۔ پرچہ کے ہر شعبہ کے ماہرین نے اس کی تیاری میں حصّہ لیا ہے۔ یہاں اس تفصیلی رپورٹ کے کچھ اجزاء کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

امریکا کی جدید عورت پر تقریباً ایک صدی گزر چکی ہے۔ 1898 میں اسکاٹ لینڈ کے سیاح موئر ہیڈ نے لکھا تھا کہ مرد یہاں عورت کے مقابلے میں جنس برتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ وہی سارے محنت کے کام کرتا ہے۔ مگر جدید نسوانی تحریک کے علم بردار کہتے ہیں، یہ ستم ظریفی ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے سیاح نے سو برس پہلے جو بات کہی تھی، وہ اب بھی باقی ہے۔ اب بھی عورتیں ہی ہیں جو محکوم ہیں۔ (صفحہ 15)

امریکی خواتین میں آج کل ایک نئی تحریک چل رہی ہے جس کو نئی نسوانیت کہا جاتا ہے۔ یہ اس بے چینی کا مظہر ہے جو آج کل امریکا کی عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ امریکی عورت کو آج تاریخ میں سب سے زیادہ خوش ہونا چاہیے۔ تعلیم، لباس، سامان عیش ہر چیز میں آج وہ پہلے سے بہت زیادہ حصّہ پائے ہوئے ہے مگر اس سیب میں ایک کیڑا پڑ گیا ہے۔ وہ خاندانی ذمہ داریوں سے پریشان ہے، وہ ایک ایسی زندگی چاہتی ہے جس میں بچہ، باورچی خانہ، چرچ، ان چیزوں کا کوئی دخل نہ ہو۔ اگرچہ ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جو یہ کہتا ہے کہ عورت کا مقام مرد سے مختلف ہے۔ مگر بہت سی عورتیں اس سے اتفاق نہیں

کرتیں۔نئی نسوانی تحریک نے ایسی نوجوان عورتوں کی تعداد بہت بڑھادی ہے جنھوں نے طے کیا ہے کہ وہ شادی نہیں کریں گی اور تنہا رہیں گی۔

ایک امریکی جریدہ سائیکالوجی ٹوڈے کے ایک سوالنامہ کے جواب میں 51 فیصد مردوں نے کہا کہ امریکی سماجی عورتوں کا استحصال اسی طرح کرتا ہے جس طرح کالے نیگروؤں کا۔ایک سیاست داں کلیر یوتھ لوس نے کہا کہ امریکی عورت نے جب 30-1920 میں ووٹ کا حق حاصل کیا اور کالج جانا شروع کیا تو اس وقت عورتوں نے سمجھ لیا کہ لڑائی جیتی جا چکی ہے۔ انھوں نے ایک بہادرانہ آغاز شروع کیا۔ وہ گھروں سے باہر نکلیں اور ملازمتوں میں اپنی جگہ بنانا شروع کیا۔مگر ابھی تک انھوں نے امریکی زندگی میں کوئی اہم جگہ حاصل نہیں کی۔امریکی عورت آج کہاں ہے؟ جواب یہ ہے کہ اعداد وشمار کی زبان میں پہلے کے مقابلے میں 106 ملین زیادہ مضبوط ہے۔وہ قومی ملازمتوں کے دوتہائی سے زیادہ حصہّ پر قابض ہے۔لیکن ڈپارٹمنٹ آف لیبر کے ایک سروے کے مطابق، امریکی عورت عام طور پر مرد کے مقابلے میں کم مہارت اور کم تنخواہ کے کام کرتی ہے۔کئی ملازمتوں میں وہ ایک ہی کام کے لیے مساوی تنخواہ نہیں پاتی۔کسی کارخانے میں چھٹنی ہو تو اس کا حال کالوں کا سا ہوتا ہے، اس کو سب سے پہلے نکال دیا جاتا ہے۔اس کی وجہ شادی کا عدم استحکام اور طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح ہے۔

1964 میں لنڈن جانسن نے صدارتی حکم جاری کیا کہ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ سرکاری ملازمتوں یں لیا جائے۔ 1967 میں فیڈرل سول سروس نے مکمل اعداد وشمار شائع کیے جس میں عورتوں کا تناسب بتایا گیا تھا۔اونچے اسکیل کی سرکاری ملازمتیں جن کی تنخواہ 28 ہزار ڈالر سالانہ سے شروع ہوتی ہے اس کے مطابق 1966 میں صرف 1.6 فی صد عہدے عورتوں کے پاس تھے۔صدر نکسن نے وعدہ کیا کہ وہ زیادہ عورتوں کو سرکاری محکموں

یں لیں گے، حتی کہ انھوں نے عورتوں کی بھرتی کا ایک شعبہ وہائٹ ہاؤس میں کھول دیا۔ مگر واشنگٹن کی عورتیں مشکل ہی سے اونچے سرکاری عہدوں پر پہنچ پاتی ہیں۔ یہاں کوئی عورت کبھی سپریم کورٹ کی جج نہ بن سکی۔ صرف دو عورتیں ہیں جنھیں امریکا کی تاریخ میں کابینہ میں بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ اس وقت صرف ایک عورت امریکی سینٹ میں ہے اور گیارہ عورتیں ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو میں۔ نیویارک واحد اسٹیٹ ہے جہاں ایک خصوصی ویمنز ایڈوائزری یونٹ برائے گورنر قائم ہے۔ مگر اس کا بھی حال یہ ہے کہ اس کی سیاہ فام خاتون صدر نے کہا:

ہم تو صرف ایک علامتی ایجنسی ہیں۔ (صفحہ 18)

خاتون نے مزید کہا: نیویارک اسٹیٹ گورنمنٹ میں 63 علاحدہ ایجنسیاں ہیں ان میں سے صرف 13 ایسی ہیں جن میں سیکرٹری سے اوپر کا کوئی عہدہ کسی عورت کو ملا ہے۔ پورے امریکا میں صرف چند خاتون میئر ہیں۔ آخری اسٹیٹ گورنر الباما میں تھی جس کا نام لورلین ویلیس تھا۔ 50 ریاستوں کے لیجسلیچر اداروں میں مجموعی طور پر سات ہزار ممبران ہیں جن میں صرف 340 عورتیں ہیں۔ ان میں سے چند ہی ایسی ہیں جو کوئی اثر رکھتی ہیں۔ مردوں کی اس دنیا میں عورتیں اب بھی صرف ایک روایتی درجہ رکھتی ہیں۔ وہ صرف ایسے شعبوں میں جوش وخروش سے لی جاتی ہیں جو عورتوں پر انحصار رکھتے ہیں، جیسے فیشن یا ایکٹنگ۔ جیسا کہ کلیر لیوس نے کہا ہے: اقتدار، روپیہ اور جنس، آج امریکا کی تین سب سے بڑی قدریں ہیں۔ اور عورتیں اقتدار تک کوئی پہنچ نہیں رکھتیں، سوا اپنے شوہروں کے ذریعہ۔ وہ روپیہ حاصل کرتی ہیں تو زیادہ تر جنس کے ذریعہ خواہ جائز ہو یا ناجائز۔ (صفحہ 18)

نسوانی انقلاب اگر سادہ طور پر یہ چاہتا کہ ایک کارفرما طبقہ کی جگہ دوسرے کو کارفرما بنا دے اگر وہ کلّی طور پر نسوانی غلبہ کو اپنا مقصد بناتا تو منزل شاید آسان ہوتی۔ برابری کا مطالبہ، نہ کہ غلبہ کا، انتہائی طور پر پیچیدہ ہے۔ خودمختار شرکاء کے درمیان سچی برابری حاصل

کرنا ایک دشوار امر ہے خواہ دونوں ایک ہی جنس کے کیوں نہ ہوں۔ رول اور ذمہ داریوں اور حقوق کا محتاط توازن، بغیر روایتی ڈھانچہ کے جو اس کی پشت پناہی کرے، بعض اوقات بالکل خیالی معلوم ہوتا ہے۔

تقریباً ہر شخص نئی تحریک نسوانیت کے بعض بنیادی مقاصد کی حمایت کرتا ہے— یکساں کام کے لیے یکساں تنخواہ یکساں روزگار کے مواقع، یکساں قانونی سلوک، مگران چیزوں کا حصول اس سے زیادہ گہری تبدیلیوں کا طالب ہے جو نسوانی تحریک کے حامیوں نے ابتداءً فرض کیا تھا۔ عورتوں کے اوقات کار اور کام کے شرائط کے لیے تحفظاتی قانون سازی کی ضرورت ہے۔ پھر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ امریکی عورت کو دوبارہ "گڑیا گھر" میں زبردستی لوٹایا جاسکے۔

"وہ حیرت انگیز حد تک بُرے ہیں، مگر وہی حقیقۃً عورتوں کے محافظ ہیں۔" جینی نے مردوں کے بارے میں کہا: جینی نے بلیو پرنٹ ریڈنگ اور میتھ میٹکس میں مہارت حاصل کی۔ جب اس نے نیوٹن کی ایک المونیم کمپنی میں ایک ملازمت کے لیے درخواست دی تو حسب امید اس کو جواب ملا کیا واقعی آپ اس درخواست میں سنجیدہ ہیں۔ میں نے جہاں بھی کام تلاش کیا۔ مجھ کو مردانہ ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسری خاتون بیٹی جیکسن (Betty Jackson) 15 سال کی عمر کی تھی کہ اس کے یہاں ایک ناجائز بچہ تولد ہو گیا۔ اس صدمہ کے بعد اس کی ماں مرگئی اور بیٹی جیکسن کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ آج وہ سات ناجائز بچوں کی ماں ہے۔ گیس اور بجلی کا بِل میری طاقت سے باہر ہے۔ میں ایک گندی گلی میں ایک ایسے گھر میں رہتی ہوں، جہاں گرم پانی نہیں، چوہے اور چیونٹے ہر طرف دوڑتے رہتے ہیں۔ ویلفیر ڈپارٹمنٹ ماہانہ 92 ڈالر اس کو دیتا ہے اور مزید 128 ڈالر وہ دوسرے ذرائع سے کماتی ہے۔ مگر یہ رقم اس کی ناگزیر

ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں۔ ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے سامان تعیش کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ "میری زندگی بے معنی ہے" (my life is meaningless) اس نے کہا۔ اب اس کی 19 سالہ لڑکی نے ایک ناجائز بچہ جنا ہے جس نے اس کے مسائل میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

"آزادیِ نسواں کی تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ ٹائم کے نامہ نگار نے اس سے پوچھا۔ مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں"۔ اور مذہب؟ میں چرچ نہیں جاتی۔ وہ سب ڈاکو ہیں میں گھر پر عبادت کر سکتی ہوں اور خدا یقیناً سنے گا۔ میرے پاس چرچ کو ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں؛ اس کے خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ مجھے زندہ رہنے کے لیے جگہ چاہیے اور بس:

"I just need some space to survive."

گیلی گن (Lauretta Galligan) کی شادی 1944 میں ہوئی۔ تعلیم کے بعد اس نے کچھ دن کام کیا۔ اب اس نے باہری دلچسپیاں ترک کر دی ہیں تاکہ وہ گھر پر زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکے۔ 52 سال کی عمر میں اب بھی وہ صبح ساڑھے چھ بجے اٹھ جاتی ہے تاکہ اپنے شوہر کا ناشتہ تیار کرے اور بچوں کو تیار کر کے وقت پر اسکول بھیج سکے، وہ بہت خوش ہوتی ہے جب اس کا شوہر اس کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ کہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے: میں سب سے پہلے اپنے خاندان اور اپنے شوہر کے کام کو ترجیح دیتی ہوں، اس کے بعد میں دوسری چیزوں کے لیے کام کرتی ہوں۔

لاریٹا کبھی برج نہیں کھیلتی اور اتفاقاً کبھی فیشن شو میں جاتی ہے۔ اس کی زیادہ تر سوشل زندگی شوہر کے بزنس کے گرد گھومتی ہے ماں بننا اور گھر بنانے میں مشغول ہونا بڑا دل چسپ مشغلہ ہے۔

سوزین(Suzanne Sape)،عمر 23 سال، شادی شدہ ہونے پر خوش ہے مگر وہ اولاد نہیں چاہتی، اگر کبھی ایسا ہو تو میں اسقاط کو پسند کروں گی، مجھے بچے پسند ہیں۔ بچوں کو اس قابل بنانا کہ وہ وقت کے مسائل کا مقابلہ کر کے زندہ رہ سکیں بڑا مشکل کام ہے اور وقت اور قوت چاہتا ہے۔ میں اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ وہ آپریشن کروا لے مگر پھر رُک گئی۔ کیوں کہ جسمانی اور نفسیاتی ردعمل کا خطرہ تھا۔ وہ کہتی ہے: اگر آپ ایک کام کرنے والی عورت ہیں تو آپ کس طرح بچوں کی نگہداشت کرسکتی ہیں۔ اگر ایک عورت کے ایک بچہ ہو تو کم از کم ایک سال ورنہ دو یا تین سال تک اس کو پوری طرح اس میں مشغول ہونا پڑے گا۔ نارین(Norine O'Callaghan) اسقاط کے خلاف ہے۔ ''یہ تو قتل ہے''۔ اس کو تردد ہے کہ کچھ عورتیں مرکز تحفظ اطفال کو بچوں کی پرورش کا بدل سمجھتی ہیں۔ وہ آزادیِ نسواں سے ہمدردی رکھتی ہے۔ مگر اس کا کہنا ہے کہ عورتیں اگر ساری سرگرمیوں میں شریک ہوں تو مردوں کی طرح ہو جائیں گی اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔

ہیوبر(Marica Heuber)، جب میں ہائی اسکول میں تھی تو میری سب سے بڑی منزل شادی تھی۔ اگرچہ وہ اتنا ہی سخت کام کرتی ہے جتنا اس کا شوہر۔ مگر جب وہ شوہر کے مقابلے میں اپنی حیثیت پر غور کرتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ مرد کو غالب جنس ہونا چاہیے ، وہ پورے یقین کے ساتھ کہتی ہے، میں چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کو یہ احساس ہو کہ وہ گھر کا بڑا ہے ہم مل جل کر فیصلے کرتے ہیں۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ آخری حرف اسی کا ہونا چاہیے۔

ڈیشیا ایک نہایت سرگرم عورت ہے۔ اس نے جو زندگی بنائی ہے اس پر اس کو فخر ہے۔ ''شادی شدہ ہونا اور ایک فیملی کا مالک ہونا میرے لیے سب سے اہم چیزیں ہیں۔ میں اپنی زندگی پر بہت خوش ہوں۔''

یانگ(Lynn Young) ایک 33 سالہ خاتون ہے۔ اس نے طے کیا ہے کہ وہ

شادی نہیں کرے گی۔ ”میں سرجن بننا چاہتی تھی“اس نے کہا” مگر ایک دوست ڈاکٹر نے اس ارادہ کی حوصلہ شکنی کی۔ اس نے بتایا کہ یہ پیشہ بہت سخت ہے، اور عورت کے بس کا نہیں۔“بہت سی عورتیں اپنے کو شوہر کے بغیر محفوظ نہیں سمجھتیں۔ مگر یہ شادی کرنے کی بہت بے ہودہ وجہ ہے۔(صفحہ 22)

الینور (Eleanor Driver): میں اپنے شوہر کو اے بی کہتی ہوں، یعنی مغرور، نمک حرام اور وہ واقعہ ہے۔ مگر وہ مضبوط اور غالب ہے اور میں اس کو پسند کرتی ہوں۔ جب مجھے یونیورسٹی میں ایک ملازمت ملی تو اس نے کہا جاؤ، مگر میں چاہتا ہوں کہ میرے موزے دھلے ہوئے ہوں۔ ”عورتیں، عورتوں کی آزادی نہیں چاہتیں، وہ صرف محبت چاہتی ہیں“۔

تنظیم آزادیِ نسواں، رسمی طور پر 1966 میں قائم ہوئی۔ آج وہ عورتوں کی سب سے طاقت ور تنظیم ہے۔ اس کے ممبروں کی تعداد 18 ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ بچوں کی پرورش سے لے کر اسقاط حمل کے قانون میں اصلاح تک اس نے متعدد کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ آزادیِ نسواں کا خاص مقصد یکساں کام کے لیے یکساں تنخواہ ہے، ایک ایسی قوم میں جہاں عورتوں کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے، سیاسی نفوذ اور اقتصادی طاقت حاصل کرنے پر کوئی رکاوٹ نہیں۔ صفحہ 23

پچھلے سال صدر نکسن نے ایک بل کو ویٹو کر دیا جو سرکاری اہتمام میں تحفظ اطفال مراکز کے قیام سے متعلق تھا۔ یہ ایک نہایت جامع منصوبہ تھا۔ جس پر بالآخر سالانہ 30 ملین ڈالر خرچ ہوتا۔ یہ سرکاری بجٹ پر ایک غیر معمولی اضافہ تھا جو اِس وقت بھی بہت بڑھ چکا ہے۔ اگر مائیں آزادانہ طور پر روزگار کے سلسلے میں مردوں کا مقابلہ کرتی ہیں تو بہر حال کوئی انتظام ہونا چاہیے جہاں وہ اپنے بچوں کو چھوڑ سکیں، معقول معاوضہ پر جب کہ وہ کام کر رہی ہوں۔

تحریک نسواں سے زیادہ انقلابی لوگ اس پر مطمئن نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جنسی عمل میں

ایسی تبدیلی کی جانی چاہیے کہ دونوں صنف پرانے طرز کے بندھنوں اور ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائیں۔ یہ تصور کہ مرد کمانے والا فرد ہے اور عورت کا کام گھر سنبھالنا ہے، وہ کہتے ہیں فرسودہ ہے اور دونوں صنفوں کے لیے تباہ کن ہے۔

جدید نسوانی تحریک کے زیادہ انقلابی عناصر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی راہ کی رکاوٹ صرف سماج نہیں ہے بلکہ اس سے بڑی رکاوٹ حیاتیاتی محدودیت ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس آف ایوجینکسن کے ذریعہ جینٹک کوڈ کو اس طرح بدل دیا جائے کہ نئے قسم کے مرد اور نئی قسم کی عورتیں پیدا ہونے لگیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ انتہا پسند لوگ چاہتے ہیں کہ عورت بشمول جنسی تعلقات، مرد سے مکمل طور پر آزاد ہو جائے۔ جل جانسٹن کے نزدیک نسوانی تحریک درحقیقت اس بات کی تحریک کہ ہم جنسی کا طریقہ رائج کر دیا جائے: یہ اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کوئی عورتیں جنسی تقاضوں کے لیے مردوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دے۔ (صفحہ 24)

ماسکو کے میگزین اسپٹنگ (اکتوبر 1987) کے ایک مضمون کا عنوان ہے — کیا باپوں کو ماں بننا چاہیے:

Should Daddies Be Mummies

اس کے مطابق ایک جرمن ڈاکٹر نے تبدیلیِ جنس (sex change) کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عورت کی بچہ دانی کو نکال کر بذریعہ آپریشن مرد کے پیٹ میں نصب کر دیا جائے تاکہ مرد بھی بچہ پیدا کرنے کا کام کریں اور اس طرح دونوں صنفوں میں فطری عدم مساوات کو ختم کیا جا سکے۔ امریکا میں خواتین کی ایک تنظیم ہے جس کی شاخیں امریکا کی 42 ریاستوں میں قائم ہیں۔ اس کا ماٹو یہ ہے: عورتو، کافی نہ بناؤ، پالیسی بناؤ۔ اس تنظیم کا مقصد عورتوں کو سیاست میں بھرپور شریک کرنا ہے۔ 1960 کے صدارتی الیکشن

میں عورتوں کے ووٹ کا بڑا حصہ جان کینڈی کو ملا تھا۔ (صفحہ 27) امریکا کے مرد سیاست داں عورتوں کے مطالبات پورے کرنے میں چست رہے ہیں۔ مثلاً یکساں کام کے لیے یکساں تنخواہ۔ طلاق اور اسقاط کی آسانیاں۔ ڈے کیئر سنٹر کا انتظام۔

خاتون صدر مملکت کا تصور اب تک امریکہ میں مذاق سمجھا جاتا رہا ہے۔ مسز روزویلٹ نے 1934 میں کہا تھا "ابھی ہم اس نوبت کو نہیں پہنچے ہیں کہ عوام کی اکثریت ایک عورت کی صدارت پر مطمئن ہو سکے"۔ کیا آج امریکی ووٹرس اس نوبت کو پہنچ چکے ہیں۔ غالباً نہیں، حتی کہ وہ عورت کو وائس پریسیڈنٹ کی کرسی پر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ حال میں ایک آزمائشی رائے شماری میں خود عورتوں کی بڑی تعداد نے امریکی مرد کی صدارت کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر امریکا میں کسی خاتون کے صدر یا نائب صدر ہونے کا امکان ہے تو یہ تعجب انگیز خبر صرف 2000ء میں پیش آسکتی ہے۔ مستقبل کی کسی خاتون امیدوار کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس سے پہلے بڑی تعداد میں سرکاری خدمات انجام دے چکی ہو تاکہ ذمہ داری اور اقتدار کے عہدوں میں اس کی شخصیت عوام کے دماغ میں بیٹھ جائے۔ جیسا کہ اندرا گاندھی اور گ ولڈا میر کے ساتھ ہوا۔ اس کی ذات کو سیاسی طور پر معروف ہونا چاہیے، نہ کہ جنسی طور پر۔

ووٹر لازماً یہ چاہیں گے کہ خاتون امیدوار میں بھی وہی صفات ہوں جو وہ مرد میں دیکھتے ہیں۔ لیاقت حوصلہ، تجربہ، استحکام، ذہانت۔ یہ 'افواہ' کہ عورتیں صلاحیت میں کم تر ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دو سال پہلے سرجن ایڈگر برمن کا ایک بیان عورتوں کے حلقے میں بڑی خفگی کا سبب ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ عورتیں اپنی ہارمون کمسٹری کی وجہ سے اقتدار کے مناصب کے لیے جذباتی (emotional) ہو سکتی ہیں۔ مسز برچ ایک عالم فلکیات ہیں۔ مگر انھیں شکایت ہے کہ مردوں کے تسلط والی دنیائے سائنس میں انھیں ان کی صحیح جگہ نہ مل سکی۔

امریکا میں کام کرنے والوں کے درمیان عورتوں کی تعداد 40 فی صد ہے۔ مگر امریکا کے 350000 سائنس دانوں میں خاتون سائنس دانوں کی تعداد صرف 10 فی صد ہے۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یافتہ خواتین مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ اس لیے وہ اعلیٰ سائنسی عہدوں پر بہت کم پہنچ پاتی ہیں۔ مثلاً نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے منتخب ممبروں کی تعداد 800 سے زیادہ ہے جس میں خواتین صرف 9 ہیں۔

سائنس کا نوبل پرائز پانے والے 278 لوگوں میں صرف 6 عورتیں شامل ہیں۔ حال میں عورتوں کے سلسلے میں رجحان میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ مگر یہ صورت حال اب بھی باقی ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹے درجے کے عہدوں کے لیے منتخب کی جاتی ہیں۔ (صفحہ 20)

کیا عورتیں غیر متغیر طور پر مردوں سے مختلف ہیں، آزادیِ نسواں کے علمبرداروں کا یقین ہے کہ جسمانی پہلو کو چھوڑ کر جتنے بھی فرق ہیں وہ سب سماجی حالات کے پیدا کردہ ہیں۔ دوسرے نقطۂ نظر کے حاملین کا کہنا ہے کہ ہر قسم کے فرق جین کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ جین کے اندر صنفی میلان ہونا تین مشاہدات سے اخذ کیا گیا ہے۔ پہلی چیز مارگریٹ میڈ کے الفاظ میں تہذیبی عالمگیریت۔ تقریباً ہر جگہ یہ مثال ملتی ہے کہ ماں بچہ کی نگہداشت کی ذمہ دار ہے اور مرد کا غلبہ مسلمہ طور پر رائج ہے۔ علم الانسان کے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ عورتوں کے غلبہ کا سماج بھی دنیا میں کبھی کبھی پایا گیا ہے مگر دوسرے اس کا قطعاً انکار کرتے ہیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ زمین پر پائے جانے والے بیشتر حیوانات میں نر (male) ہی غالب ہوتا ہے۔ وہ مادہ اور بچوں کی حفاظت کرتا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ صورت حال اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب کہ کسی جانور کے بچوں کو شروع ہی میں الگ کرکے پرورش کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنا صنفی عمل اپنے معاشرے سے نہیں سیکھتے۔

آخری بات یہ ہے کہ کرداری صنفی فرق بچپن میں اس سے بہت پہلے ظاہر ہو جاتا ہے جب کہ ایک بچہ امکانی طور پر ماں اور باپ کا فرق سمجھتا ہو۔ یا یہ جان سکے کہ والدین میں سے کس کی اسے نقل کرنی چاہیے۔ ایک سائنس داں نے کہا ہے کہ زیادہ بہتر مفروضہ یہ ہے کہ ہم یہ مانیں کہ صنفی فرق کے پیچھے حیاتیاتی عوامل کام کر رہے ہیں۔ طبیعیاتی فرق پیدائش سے بھی پہلے ظاہر ہو جاتے ہیں، بچہ جب ابتدائی حالت میں رحم کے اندر ہوتا ہے، اس وقت دیکھا گیا ہے کہ بچی کا دل اکثر زیادہ تیزی سے دھڑکتا ہے۔ ایک سوشیالوجسٹ نے کہا ہے کہ عورت زیادہ بہتر تخلیق کا نمونہ ہے۔ مرد زیادہ طاقت ور اور متحمل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ ٹیکنالوجیکل سماج میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

حالیہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے دماغ میں بھی صنفی فرق ہو سکتے ہیں۔ کچھ تجربہ کرنے والوں کے نزدیک رحم کے ابتدائی جرثومہ کے اندر مردانہ ہارمون کی موجودگی اس کے دماغ کو جنس مذکر بنانے کا سبب ہو سکتی ہے۔ پیدائش سے پہلے مرکزی اعصابی نظام میں یہ جنسیت مردوں اور عورتوں کے اندرونی احساسات میں فرق پیدا کر سکتی ہے۔ سوشیالوجسٹ جان گیگنن (John Gagnon) کا کہنا ہے: درحقیقت بعض حالات میں نومولود لڑکیاں مختلف قسم کے تاثرات ظاہر کرتی ہیں۔ ان کو چھوا جائے یا ان کے اوپر سے کپڑا ہٹایا جائے تو بہت تیزی سے ان پر اس کا ردعمل ظاہر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ تجربات بتاتے ہیں کہ بارہ ہفتہ کی لڑکیاں جیومیٹری کی اشکال کے مقابلہ میں چہروں کی تصویروں کو زیادہ دیر تک دیکھتی ہیں۔ لڑکے اس قسم کا فرق نہیں کرتے۔ اگرچہ بالآخر وہ جیومیٹری کی اشکال کو زیادہ متوجہ ہو کر دیکھتے ہیں۔

تجربہ کیا گیا ہے کہ اگر کھیل کے ٹکڑوں سے گھر بنانے کے لیے کہا جائے تو 10 سے 12 سال کی لڑکیاں گھر کے اندرونی حصہ کو عمدہ بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جب کہ اسی عمر کے

لڑکے گھر کے بیرونی حصہ کو عمدہ بنانے پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ علمائے حیاتیات کا خیال ہے کہ یہ فرق دونوں صنفوں کے درمیان جنینی فرق کی بنا پر ہوسکتا ہے۔ (صفحہ 32)

لڑکیاں، لڑکوں کے مقابلہ میں گننا یا بولنا زیادہ جلد سیکھ لیتی ہیں۔ مگر جب کہ لڑکیاں لفظی معاملہ میں لڑکوں سے آگے ہیں، وہ تجزیاتی سوالات کو حل کرنے میں لڑکوں سے پیچھے رہتی ہیں، ایسے سوالات جو زیادہ توجہ طلب ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے ٹسٹوں سے ثابت ہوا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم تخلیقی ہوتی ہیں۔ اکثر سوشل سائنٹسٹ خیال کرتے ہیں کہ اس کی وجہ کلچر ہے۔ عورتوں اور مردوں میں شخصیت کا فرق بھی پایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر نیویارک یونیورسٹی میں ریسرچ کرنے والوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی اگر بوتل پینے میں مشغول ہے تو وہ اس وقت پینے سے رک جاتی ہے جب کہ کوئی شخص کمرے میں آتا ہوا نظر آئے، جب کہ ایک لڑکا کسی آنے والے پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ اسی طرح کاگن کے تجربہ میں پایا گیا کہ 12 ماہ کی لڑکیاں کسی اجنبی کمرہ میں ہوں، اور انھیں خوف زدہ کیا جائے تو وہ اپنی ماؤں کی طرف بھاگتی ہیں جب کہ اس عمر کے لڑکے کچھ کرنے کی راہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ اسی طرح چار ماہ کی لڑکیاں کسی لیبورٹری میں خوف زدہ کی جائیں تو وہ اسی عمر کے لڑکوں کے مقابلہ میں دگنا زیادہ روتی چلّاتی ہیں۔ مزید یہ کہ یہی فرق بندر کے بچوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کاگن نے کہا ہے:

یہ واقعہ ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ مردوں اور عورتوں میں بعض نفسیاتی فرق کا امکان محض معاشرتی تجربات کی بنا پر نہیں ہوسکتا بلکہ وہ لطیف قسم کے حیاتیاتی فرق کی پیداوار ہے۔

Immutably Different

Are women immutably different from men? Women's Liberationist believe that any differences—other than

anatomical are a result of conditioning by society. The opposing view is that all of the differences are fixed in the gense (p. 43). Many researchers have found greater dependence and docility in very young girls, greater autonomy and activity in boys. When a barrier is set up to separate youngseters from their mothers, boys try to knock it down; girls cry helplessly (p. 44). Surgeon Edgar Berman earned a low place in the bestiary of Women's Libera-tion when he suggested that because of their harmonal chemistry women might be too emotional for power (p. 34). Better education has broadened women's view beyond home and hearth, heightening their awareness of possibilities—and their sense of frustration when those possiblities are not realized. As Toynbee had noted earlier, middle -class women acquired eduaction and a chance at a career at the very time she lost her domestic servants and the unpaid household help of relatives living in the old large family, she had to become either a "household drudge" or "carry the intolerably heavy load of two simultaneous fulltime jobs (p. 27). Even after infancy, the sexes show differential interests that do not seem to grow solely out experience. Psychoanalyst Erik Erikson has found that boys and girls aged ten to twelve use space differently when asked to construct a scene with toys. Girls often build a low wall, sometimes with an elaborate doorway, surrounding a quiet interior scene. Boys are likely to construct towers, facades with cannons, and lively exterior scenes (p. 43). On its most radical level, the New Feminism at time seems to constitute an assault—sometimes emotional and foolish—not just on society but on the limitations of biology. Some argue that through the science of eugenics, the genetic code could be altered to produce a different kind of man and woman (p. 30).

(*Time Magazine,* March 20, 1972)

اکثر ریسرچ کرنے والوں نے پایا ہے کہ چھوٹی لڑکیوں میں انحصار کا مادہ زیادہ ہے۔ اس کے برعکس، چھوٹے لڑکوں میں سرگرمی اور خودمختاری زیادہ ہوتی ہے۔ اگر بچوں اور ماں کے درمیان ایک روک کھڑا کردیا جائے تو لڑکے اس کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ لڑکیاں بے یارومددگار ہو کر چلاتی ہیں۔

عورتوں کی انفعالیت ایک بحث کا موضوع رہا ہے۔ اسی طرح دوسرا زیر بحث مسئلہ ہارمون کے اثر کا ہے۔ اس سلسلے میں سائنٹفک محققین کے نتائج سے زیادہ تر بعض خواتین نے اختلاف کیا ہے جو عورتوں کی انفعالیت یا ہارمون کے اثر کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ جہاں تک سائنسی محققین کا سوال ہے انھوں نے تقریباً اجتماعی طور پر اتفاق کیا ہے کہ ہارمون ہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ لوگ کس طرح محسوس کریں اور کس طرح عمل کریں۔ عورتوں میں جو بڑھتی ہوئی تاثر پذیری پائی گئی ہے، اس کی بنا پر محققین کا خیال ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں سخت حالات میں زیادہ جھجک والی ثابت ہوسکتی ہے۔

محققین بتاتے ہیں کہ تمام کلچر میں عورتوں کے مقابلہ میں مرد زیادہ جارح پائے گئے ہیں۔ یہ بھی غالباً دونوں صنفوں کے ہارمون میں فرق ہونے کا نتیجہ ہے یعنی اس کے پیچھے جنینی عامل کام کررہا ہے بعضوں کا خیال ہے کہ عورتیں بھی مردوں ہی کی طرح جارح ہوسکتی ہیں۔ البتہ ان کی جارحیت عملی کے بجائے لفظی ہوگی۔

لڑکوں اور لڑکیوں کا یہ فرق اس وقت بھی موجود ہوتا ہے جب کہ وہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتے ہیں۔ ’’کیا کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ صنفی مساوات کا سماج قائم ہوجائے جہاں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہ ہو ماسوا جسمانی فرق کے۔‘‘ یہ بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ہارمون اور جارحیت کے بارے میں آخری تحقیق ابھی باقی ہے۔ تاہم یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون میں فرق ہے۔ اور یہ فرق پیدائش سے پہلے

بالکل آغاز حیات میں موجود رہتا ہے۔ تجربات میں دیکھا گیا ہے کہ نر حیوانات کو اگر الگ کر کے رکھا جائے تب بھی وہ آخر تک جارح رہتے ہیں۔

ماہر نفسیات بنڈک نے کہا ہے: ”حیاتیات شخصیت پر سبقت لے جاتی ہے“۔ عورت کے مقابلہ مرد میں غالب خصوصیات ہونا سابق تصور کے مطابق کلچر کے بجائے خود فطرت سے اس درجہ وابستہ ہے کہ میکائیل لیوس کے الفاظ میں: قدرت ظالم ہے عورت کا رول بحیثیت گھرستن ان کے حیاتیاتی عمل کا ایک ارتقائی نتیجہ ہے۔ دودھ کی بوتل نے عورت کو اس کے بعض کاموں سے رہائی دے دی ہے۔ مگر یونیورسٹی آف مشی گن کے عالم نفسیات بوڑت بارڈوک نے کہا: بچہ کی نگہداشت کی بڑی ذمہ داری اب بھی عورت ہی کے اوپر ہے حتیٰ کہ روس اور دوسرے کمیونسٹ ممالک میں بھی کہا جاتا ہے کہ مادری مہارت زیادہ تر اکتسابی چیز ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر جانوروں کو تنہائی میں رکھا جائے اور اس کے بعد کسی ایسے کمرہ میں ان کو لے جایا جائے جہاں ان کو نوع کے بچے ہوں تو مادہ حیوانات ہی بچوں کے پاس جاتی ہے اور ان کی دیکھ بھال میں لگ جاتی ہے۔

جیروم کاگن کہتا ہے: ”عورت اور مرد کے حیاتیاتی فرق غالباً مکمل طور پر ختم کیے جا سکتے ہیں اور ایسا سماج بنایا جا سکتا ہے جس میں کسی صنف کو کوئی اہمیت نہ رہے سوا مادری ذمہداری کے۔ مگر ہمیں پوچھنا چاہیے کہ کیا ایسا سماج اس کے افراد کو مطمئن کر سکے گا“۔ اس کے نزدیک لین دین ہی وہ چیز ہے جو افراد کے درمیان تعلقات کو مستحکم اور پُرمسرت بناتی ہے۔

عالم نفسیات مارٹن سائمنڈ کہتا ہے: ”بنیادی وجہ جس کی بنا پر صنفی یکسانیت ناکام رہے گی، یہ ہے کہ خود جنسی عمل میں مرد دینے والا ہوتا ہے اور عورت قبول کرنے والی ہوتی ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب مرد اپنی اس حیثیت کو حاکمیت سمجھنے لگے اور عورتیں اپنی حیثیت کو ماتحتی۔ صنفی یکسانیت ایک تباہ کن چیز ہے۔ کیوں کہ ایسے سماج میں کوئی

کشاکش نہیں ہوگی جو انسان کے صحت مند ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ فرق ہونا نقص کی بات نہیں۔ عالم حیاتیات آؤن سٹڈ نے کہا ہے: ''ہم سب انسانی وجود ہیں اور اس اعتبار سے برابر ہیں مگر سب یکساں نہیں۔'' دوسرے عالم حیاتیات جان منی کے نزدیک ''آپ صرف اس وقت صحیح عمل کر سکتے ہیں جب کہ مسلمہ فرق کو مانیں اور اس کا احترام کریں۔''

امریکا میں عورتیں تعلیم کے میدان میں بہت آگے ہیں مگر وہ شعبے جو روایتی طور پر مردوں کے سمجھے جاتے رہے ہیں ان میں عورتوں کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی خاتون پروفیسر نے تحقیقات کے بعد بتایا ہے کہ اس کی بڑی وجہ عورتوں کا مقابلہ سے گھبرانا ہے۔ اس خاتون نے اپنے تجربات میں پایا کہ مرد مقابلہ کے لیے پر جوش طور پر تیار رہتے ہیں جب کہ عورتیں اس کے لیے تیار نہیں پائی گئیں۔

اس سلسلے میں اعداد وشمار بھی افسوسناک ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکی عورت آج پہلے سے زیادہ مشقتوں میں مبتلا ہے۔ عورتوں کی خودکشی کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے یہ تھا کہ مرد اپنے آپ کو زیادہ ہلاک کرتے تھے۔ مگر اب صورت حال برعکس ہو گئی ہے۔ مثلاً لاس اینجلس میں 1960 میں خودکشی کرنے والوں میں 35 فی صد عورتیں تھیں مگر 1971 میں ان کی تعداد 45 فی صد تک پہنچ گئی۔ وسکنسن یونیورسٹی کے ایک جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ نفسیاتی علاج کے لیے رجوع کرنے والوں میں عورتیں مردوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ اضطراب اور حالات سے نہ لڑنے کی صلاحیت کی شکایت کرتی ہیں۔

امریکی معاشرہ کی ایک اور چیز قابل ذکر ہے جس کو صنفی انقلاب کہا جاتا ہے۔ نئی نسل کے لڑکے اور لڑکیاں شادی سے پہلے صنفی تعلقات کو بُرا سمجھنے کے بجائے اچھا خیال کرنے لگے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دوشیزگی کا احترام ختم ہو گیا ہے۔ 1970 کے ایک گیلپ پول

میں چار میں تین طلبہ نے شادی کے لیے دوشیزگی کو نا قابل لحاظ قرار دیا۔ یونیورسٹی آف مینی سوٹا کے ماہر سماجیات نے پایا کہ 20 سال کی عمر تک کی عورتوں میں 40 فی صد اپنی دوشیزگی کھو چکی تھیں اور شادی کے وقت 70 فی صد جنسی تجربہ کر چکی تھیں۔ انگریز عالم جنینیات جان سوم کا کہنا ہے: 1950 سے پہلے کا بوسہ آج کا جنسی عمل بن چکا ہے۔ یونیورسٹی آف مشی گان کے ایک پروفیسر نے گولیوں کے جائزہ میں پایا کہ وہ حمل کو روکنے میں بری طرح ناکام ثابت ہوئی ہیں اور عام خیال کے مطابق وہ عورتوں کے لیے جنسی اجازت نامہ نہ بن سکیں۔ اکثر وہ ناجائز حمل میں مبتلا پائی گئی ہیں۔

دوسرے شعبوں کے برعکس جرنلزم میں عورتیں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں مگر اہم بات یہ ہے کہ ان کی بہت کم تعداد ملے گی جو اہم پوزیشن کی مالک ہو۔ وہ یا تو رپورٹر ہیں یا ایڈیٹر ہیں۔ ان کی بڑی تعداد یا تو ہفتہ وار اخباروں میں یا چھوٹے درجہ کے روزناموں میں کام کرتی ہے جس میں تنخواہیں عام طور پر کم ہیں۔ کوئی اخباری ادارہ یا کوئی اشاعتی تنظیم ایسی نہیں ہے جو عمومی ہو اور اس کی صدر کوئی خاتون ہو۔ حالانکہ 1971 میں امریکا کے جرنلزم اسکولوں کے طلبہ میں 44 فی صد خواتین تھیں، جب کہ 1950 میں ان کی تعداد 35 فی صد تھی۔

امریکا کے نیوز پیپرس میں خاتون ایڈیٹروں کی تعداد 35 فی صد ہے۔ مگر یہاں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ امریکا کے عظیم ادارہ ایسوسی ایٹڈ پریس میں اسٹاف ممبروں کی تعداد 1050 ہے۔ جس میں صرف 112 عورتیں ہیں اور صرف دو عورتیں بیورو منیجر ہیں۔ یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل کے ملازمین کی تعداد 900 ہے مگر ان میں عورتیں صرف 81 ہیں۔ ان میں سے ایک عورت جنرل نیوز ایڈیٹر ہے۔ نیویارک ٹائمز میں ایڈیٹروں، رپورٹروں، کاپی ریڈروں کی تعداد 626 ہے، جس میں عورتیں صرف 64 ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ میں 385 میں 70 عورتیں ہیں۔ یہی دوسرے بڑے اکثر اخبارات میں عورتیں کھانے، فیشن، ٹیلی ویژن اور

خواتین سے متعلق خبروں پر مامور ہیں۔ میگزینوں میں نسبتاً عورتوں کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں بھی مردوں ہی کا غلبہ ہے۔ (صفحہ 37)

تحریک نسواں کے علم برداروں کا کہنا ہے کہ وہ تمام الفاظ جو مردوں کے غلبہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ سب مردوں کی ایجاد ہیں اور ان کو بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ یہ لوگ زبانوں کا نیا لغت تیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مثلاً مرد کے لیے مسٹر نکسن اور عورت کے لیے مسز نکسن کے بجائے دونوں کا الگ الگ نام لیا جائے اور مسٹر اور مزان کے ناموں کے ساتھ لگایا جائے۔ اسی طرح چیرمین کے بجائے پرسن۔

تحریکِ نسواں کے علم بردار کہتے ہیں کہ عورتوں کو اگر سماجی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک کرنا ہے تو ان کے لیے چائلڈ ڈے کیئر سنٹر قائم کرنے ہوں گے جہاں وہ کام پر جاتے ہوئے اپنے چھوٹے بچوں کو چھوڑ سکیں۔ امریکا میں اس قسم کے سنٹر قائم کیے گئے ہیں جو ڈے کیئر سنٹر کہے جاتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ بہت مہنگے ہیں اگرچہ کم آمدنی والوں کے لیے 20 ڈالر فیس رکھی گئی ہے۔ لیکن اگر ماں کی ماہانہ آمدنی 600 ڈالر ہے تو اس کو چائلڈ کیئر سنٹر سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی تنخواہ کا تہائی حصہ (200 ڈالر) بطور فیس دے دینا پڑے گا۔ اس لیے تحریک نسواں والوں کا ایک بڑا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت اپنے خرچ پر اس قسم کے مراکز قائم کرے۔ حکومت کی طرف سے جو ادارے قائم ہیں، ان میں ایک بچہ کے اوپر 2400 ڈالر خرچ ہوتے ہیں سرپرستوں سے حقیقتاً اس کا بہت تھوڑا سا جزء وصول کیا جاتا ہے۔ (صفحہ 40)

تحریک نسواں کے علم بردار شادی کے قدیم طریقہ پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ شادی کا یہ طریقہ ان کے نزدیک ایک سردار (شوہر) اور ایک غلام (بیوی) کو جمع کرنے کا دوسرا نام ہے۔

ڈاکٹروں کی کمی کو خواتین کی طبی تعلیم کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس سلسلے میں تحقیق کرنے والوں نے مریضوں کے اندر ایک قسم کا تعصب پایا ہے۔ ڈاکٹر ایڈ گر انگلمین نے نیو یارک سٹی کے تین اسپتالوں میں 500 مریضوں سے سوالات کیے۔ 84 فی صد عورتوں نے اپنے جواب میں مرد ڈاکٹر کو ترجیح دی۔ اگرچہ ان کی نصف تعداد نے اعتراف کیا کہ خاتون ڈاکٹر مرد ڈاکٹر کے مقابلہ میں زیادہ نرم اور بااخلاق ہوتی ہے۔ 54 فی صد نے بتایا کہ عورتیں مرد کے مقابلہ میں کمتر صلاحیت کی ڈاکٹر ہوتی ہیں۔ اگرچہ بعض کے نزدیک یہ جوابات مردانہ تسلط والے کلچر کا نتیجہ ہیں۔ ایک مریض نے کہا: مرد ڈاکٹر کی واقفیت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ زیادہ سنجیدگی کے ساتھ دیکھتا ہے۔ وہ اپنے ذہن کو پوری طرح مریض کی طرف لگاتا ہے۔ جب کہ عورت کے لیے گھر کے مسائل ہوتے ہیں۔ ”کیسے ممکن ہے کہ وہ گھر بھی بنائیں اور ڈاکٹر بھی بنیں“ ایک مریض نے جواب دیا۔ بعضوں نے اور بھی زیادہ سخت جوابات دیے۔

جہاں تک سرجری کا تعلق ہے اس میں عورتیں تقریباً نفی کے برابر ہیں۔ ایک خاتون ڈاکٹر نے کہا ”مردوں کی انا کی وجہ سے اب تک سرجری کے دروازے عورتوں کے اوپر بند ہیں۔ خاتون سرجن کی سینکڑوں طریقہ سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ ایک خاتون میڈیکل طالبہ نے کہا۔ اگر آپ کھڑے ہونے کے علاوہ کسی اور طریقہ سے پیشاب کرنا چاہیں تو یہاں یہ ایک مسئلہ ہے۔

میڈیسن مردوں کی دنیا ہے۔ عورتیں ابھی حال میں اس میدان میں داخل ہوئی ہیں۔ وہ ڈاکٹر کے بجائے زیادہ تر نرس کی حیثیت سے کام کرتی رہی ہیں۔ 10 سال پہلے امریکا کے 260000 ڈاکٹروں میں عورتیں صرف 6 فی صد تھیں۔ اب وہ 345000 ڈاکٹروں میں 7 فی صد ہیں۔ سرجنوں میں وہ صرف ایک فی صد ہیں جو اس پیشہ میں سب سے زیادہ کمائی والا

میدان ہے۔ پبلک ہیلتھ فزیشین میں وہ 26 فی صد ہیں جن کی آمدنی دیگر ڈاکٹروں کے مقابلہ میں صرف اوسط درجہ کی ہوتی ہے۔مگر اب خاتون ڈاکٹروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ دس سال پہلے 8300 میڈیکل طلبہ میں خواتین کی تعداد 600 یعنی 7 فی صد تھی۔ 1968 میں ان کی تعد 9 فی صد ہوگئی۔(صفحہ 43)

عورت مرد کے مقابلہ میں جنسی قیدی زیادہ ہے۔اس کو جبری مادریت اور نا مطلوب حمل کا شکار ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز اس کی ساری آزادیوں کو بے معنی بنا دیتی ہے۔ جدید میڈیکل سائنس حیاتیاتی بندھن سے اس کو نکالنا چاہتی ہے اور بہت کچھ کامیاب بھی ہوئی ہے۔مگر مانع حمل گولیوں کے دیگر اثرات کا مسئلہ اب بھی باقی ہے۔اس کے علاوہ اب بھی دسیوں ہزار غیر مطلوب حمل رہ جاتے ہیں جن کے لیے اسقاط کا سہارا لینا پڑتا ہے۔امریکا کی 16 ریاستوں نے اسقاط کے معاملہ میں کسی حد تک عورت کو قانونی آزادی دے دی ہے۔ اگرچہ ہر ریاست کے قانون میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔تاہم شخصی اختیار کا حق ہر ایک نے تسلیم کیا ہے۔(صفحہ 44)

امریکا میں خواتین کے نصاب بنائے گئے ہیں اور ان کے تحت ادارے قائم کیے گئے ہیں جن کا مقصد ہے عورتوں کے شعور کو اٹھانا (consciousness-raising)۔

1970 میں ہائی اسکول سے فارغ ہونے والے طلبہ میں لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد برابر تھی۔ دونوں تقریباً 50 فی صد مگر لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں نے بہت کم آئندہ تعلیم کے لیے کالج میں داخلہ لیا۔(59 فی صد لڑکے 41 فی صد لڑکیاں) اسی طرح عورتیں مردوں کے مقابلہ میں نسبتاً کم وظائف اور مالی امداد حاصل کر پاتی ہیں۔مردوں کے لیے سالانہ 760 ملین ڈالر اور عورتوں کے لیے 518 ملین ڈالر۔ اسکول کی تعلیم کے آگے یہ فرق اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ڈاکٹریٹ کے مرحلہ میں پہنچ کر مالی امداد میں عورتوں کا حصہ صرف 13 فی صد رہ جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم میں 85 فی صد ٹیچر خواتین ہیں۔ مگر ان اسکولوں کی پرنسپل صرف 21 فی صد عورتیں ہیں۔ ہائی اسکول میں خاتون پرنسپلوں کا تناسب صرف 3 فی صد ہے۔ اور اگر ایک عورت کالج کی صدر بننا چاہے تو اس کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ اسے نن بننا چاہیے۔ 1970 میں کالج اور یونیورسٹی کے شعبوں میں عورتوں کی تعداد 20 فی صد تھی مگر ان میں صرف 9 فی صد پروفیسر تھیں۔ عورتوں کی تنخواہ بھی مردوں کے مقابلہ میں عام طور پر کم ہوتی ہے۔ (45) اکثر نوجوانوں کا یہ خیال ہے کہ عورتیں بے دماغ رفیق ہیں۔ وہ صرف اس لیے ہیں کہ مردوں کی ضروریات پوری کریں۔ ایک خاتون نے کہا ''مردوں نے ابھی تک نہیں سیکھا کہ وہ عورتوں کو ذہنی اعتبار سے اپنا مساوی سمجھیں۔" (46) اکثر خواتین کا خیال ہے کہ ایجوکیشن موجودہ شکل میں بے معنی ہے۔ اگر کو ایجوکیشن (co-education) کو ایکول بنانا ہے تو یونیورسیٹیوں میں طلبہ اور طالبات کی تعداد کو مساوی بنانا ہوگا۔ جو فی الحال ایک امکان بعید معلوم ہوتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے کارکنوں کی تعداد تقریباً 4500 ہے۔ ان میں تخمینی طور پر سات میں سے دو عورتیں ہیں۔ فلم کے شعبہ میں نسبتاً عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مثلاً ایک فلمی ادارہ کے 1000 ممبروں میں سے 90 عورتیں ہیں، مگر یہاں بھی بڑے بڑے عہدے مردوں کو حاصل ہیں۔ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر تو بہت ہی کم عورتیں ہیں۔ (صفحہ 48)

امریکی سپریم کورٹ کی عمارت پر یہ فقرہ لکھا ہوا ہے: قانون کے تحت یکساں انصاف۔ مگر امریکی عورت پر یہ الفاظ مشکل سے چسپاں ہوتے ہیں۔ سپریم کورٹ میں کوئی خاتون جج نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ سپریم کورٹ کے 9 ججوں میں سے صرف ایک جج کے یہاں خاتون کلرک ہے۔ فیڈرل اپیل کورٹ کے 97 ججوں میں صرف ایک خاتون جج ہے۔ فیڈرل ڈسٹرکٹ کورٹ کے 402 ججوں میں چار کے سوا سب مرد ہیں۔

پورے امریکا میں تمام ججوں کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے۔ ان میں 200 کے قریب عورتیں ہیں۔ کوئی اٹارنی جنرل خاتون نہیں۔ فیڈرل سروس میں 93 ڈسٹرکٹ اٹارنی ہیں جو سب کے سب مرد ہیں۔ قانون کے پیشہ میں نسبتاً عورتیں کافی ہیں۔ جو عورتیں قانون کی تعلیم حاصل کرتی ہیں، ان کے 17 سالہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ قانون داں عورتوں کی 84 فی صد تعداد پرائیویٹ پریکٹس کرتی ہے۔ مگر خاتون وکلاء کی 12 فی صد سے کم تعداد ایسی ہے جس کی آمدنی 20000 ڈالر سے اوپر ہے جب کہ مرد وکلاء میں ان کی تعداد 50 فی صد ہے۔ 325000 وکیلوں میں خواتین کی تعداد 9000 ہے، جو 2 فی صد سے کچھ زیادہ ہے۔ امریکن بار ایسوسی ایشن میں آج تک کوئی خاتون صدر نہ ہوسکی۔ (صفحہ 50)

نفاذ قانون کے دائرہ میں عورتیں زیادہ تر زیر نفاذ ہیں، نہ کہ نفاذ کرنے والی۔ پولیس میں خواتین نیچے درجہ کی ملازمتوں میں ایک فی صد سے کچھ زیادہ ہیں۔ گرٹروڈ شمل نیویارک کی پہلی پولیس کیپٹن ہے۔ "کیا وہ کسی عورت کے پولیس کمشنر بننے کی امید کرسکتی ہے۔" اس سے پوچھا گیا۔ "صرف اس وقت جب کہ نیویارک میں پہلی خاتون میئر مقرر ہوگی۔" اس کا جواب تھا۔

امریکی عورت باہر کی تمام سرگرمیوں میں حصہ دار بن رہی ہے۔ وہ اپنا اکاؤنٹ تک الگ رکھتی ہے۔ مگر باہر مردوں کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد جب وہ گھر لوٹتی ہے تو یہاں دوسری ذمہ داریاں اس کے استقبال کے لیے موجود رہتی ہیں۔ اسے اپنے بچوں سے محبت ہے اور اگرچہ یہ اکثر اس کے لیے تکلیف دہ گھونٹ ثابت ہوتا ہے مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں کہ بچوں کی دیکھ بھال کی اکثر ذمہ داریاں دوسروں کو سونپ دے۔ اس کو اپنے شوہر سے بھی محبت ہے، وہ ان کاموں کو کرنے سے انکار کی ہمت نہیں پاتی۔ جو عام طور پر "عورتوں کے کام" سمجھے جاتے ہیں خواہ شادی کے وقت اس معاملہ میں آزادی کا قول و قرار کیوں نہ ہو گیا ہو۔ اس دہری ذمہ داری کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو سخت احساس ستاتا رہتا ہے کہ وہ کسی غلطی کی شکار ہے۔

آرٹ میں عورتوں کا بڑا حصہ ہوسکتا ہے۔مگر آرٹ کی تاریخ میں جتنے نمایاں نام ہیں وہ سب مردوں کے ہیں۔آخر خواتین آرٹسٹ کہاں گئیں۔اس کا جواب تاریخ کے پاس خاموشی ہے۔ آرٹ کے ایک مورخ کا کہنا ہے کہ کوئی بڑی خاتون آرٹسٹ پیدا ہی نہیں ہوئی۔(صفحہ 54)

کھیل کا میدان بھی مردوں کا میدان ہے۔اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ دوڑ کے مقابلہ میں مرد عورتوں سے زیادہ تیز دوڑتے ہیں۔عورتوں کی کامیابیاں زیادہ تر ان کھیلوں میں ہے جن میں عورتوں کا مقابلہ عورتوں سے ہوتا ہے۔مثلاً ٹینس وغیرہ مسنر کنگ اور مسز اسمتھ نے کھیل کے میدان میں کچھ کامیابیاں حاصل کی ہیں۔مگر انھوں نے بھی اب تک کے بہترین ایک سو مرد کھلاڑیوں کا مقابلہ نہیں کیا ہے۔نیز ان دونوں عورتوں کو اپنی صنف کی وجہ سے مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ان خواتین کو (اپنی مردانہ صفات باقی رکھنے کے لیے) اسقاط بھی کرانا پڑا ہے۔(95) بلی جین کا کہنا ہے کہ اگر میرے یہاں بچہ ہو گیا تو ”ماں“ بن جاؤں گی اور پھر مجھے کھیل کی دنیا کو چھوڑ دینا پڑے گا۔تاہم ”میں اچھی ماں بننا پسند کرتی ہو“ اس نے کہا۔

دوسری خاتون کھلاڑی رابن شادی اور بچوں کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتی۔رابن نے گھر پر اپنی دلچسپی کے لیے چوہے پال رکھے ہیں۔ وہ کہیں جاتی ہے تو بیگ میں اپنے تین چوہے بھی رکھ لیتی ہے۔

1968 کے بعد سے کھیل میں انعام پانے والی عورتوں کی تعداد بڑھی ہے۔مگر اب بھی کامیاب کھلاڑی عورت کے مقابلہ میں کامیاب کھلاڑی مرد کو زیادہ انعام ملتا ہے۔776ق م میں یونان میں پہلے کھیلوں کے مقابلہ میں عورتوں کے لیے دیکھنا بھی ممنوع تھا۔1896 میں انھیں چند کھیلوں میں شامل کیا گیا ہے۔

امریکی عورت آج اقتصادی میدان میں کافی سرگرم ہے۔مگر فیڈرل سروے کے مطابق ہمہ وقتی کام میں عورت کی اجرت اوسطاً تین ڈالر ہے۔ جب کہ اسی کام میں مرد کو اوسطاً پانچ ڈالر دیے جاتے ہیں۔ اگر عورتوں کو مردوں کے برابر اجرت دی جائے تو اجرت کی مقدار 109 بلین ڈالرز زیادہ ہو جائے (صفحہ 62)۔ اس سلسلے میں حکومت نے متعدد احکامات جاری کیے ہیں۔ اور عدالتوں نے فیصلے دیے ہیں کہ عورتوں کو مساوی اجرت دی جائے اوران سے امتیاز نہ برتا جائے۔ ان میں ایسے فیصلے بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ عورتوں سے زیادہ کام نہ لیا جائے اور بھاری بوجھ نہ اٹھوائے جائیں۔

(یہ کہنا کہ عورتوں سے محنت کے کام نہ لیے جائیں گویا یہ تسلیم کرنا ہے کہ عورت صنف ضعیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یکساں قسم کے کام میں اس کو مرد سے کم اجرت ملتی ہے۔ اس فرق کو مٹانے کے لیے قانون سازی کا ذریعہ اختیار کرنا عورت کے کیس کو رحم کا کیس بنا دیتا ہے۔ مترجم)

ایک خاتون ہیلن میک لین نے کہا: امریکا نے جتنے مرد چاند پر بھیجے ہیں اس سے بھی کم عورتوں کو زمین میں انتظامی عہدوں پر رکھا ہے۔

کیلی فورنیا کی ''پیسفک گیس اینڈ الیکٹرک "میں جو عورتیں ملازم ہیں، ان کی 94 فی صد تعداد کلرک اور سکریٹری ہے۔ منہاٹن اوون پروڈکٹس (Manhattan's Avon Products) کے دس ہزار کارکنوں میں تقریباً نصف عورتیں ہیں۔ مگر اس نے صرف 14 عورتوں کو انتظامی عہدوں تک ترقی دی ہے۔ وائس پریسیڈنٹ یا اس سے اونچے عہدہ پر ایک بھی خاتون نہیں۔

امریکی عورتوں کا یہ حال بنکنگ، فائننس، اسٹیل مائننگ اور ریل روڈ جیسے شعبوں میں ہے۔ دوسری طرف ایڈورٹائزنگ اور فیشن جیسے شعبوں میں انھیں کافی مواقع حاصل ہیں۔ بے شمار کمپنیاں ٹائپنگ کے کام کے لیے مردوں کے بجائے عورتوں کی مانگ کرتی ہیں۔ مگر

ان کا تقرر زیادہ تر کلرک کے منصب پر ہوتا ہے جس میں تنخواہ ایک سوڈالر فی ہفتہ سے آگے نہیں بڑھتی جو مردوں کی تنخواہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

نہ صرف عورتوں کی تنخواہیں مردوں سے کم ہیں بلکہ سیلس مین شپ کی ٹریننگ کے دوران میں مردوں کو بڑی قیمت کی چیزوں کی فروخت کی تربیت دی جاتی ہے جب کہ عورتوں کو کم قیمت کی چیزوں کو بیچنا سکھایا جاتا ہے۔مثلاً گریٹنگ کارڈ وغیرہ (صفحہ 63)۔ اسکول کی خاتون پنسپل، لیبارٹری ورکر اور کمپیوٹر پروگرامر اسی سطح کے مردوں کے مقابلہ میں صرف 67 فی صد تنخواہ حاصل کرتی ہیں۔ دس ہزار ڈالر یا اس سے زیادہ تنخواہ پانے والوں میں مردوں کا تناسب 40 فی صد ہے۔ جب کہ خاتون کارکنوں میں ان کی تعداد صرف 7 فی صد ہے۔ (صفحہ 63)

سان فرانسسکو کی ایک فرم لیوی اسٹراس اینڈ کو میں 18 ہزار ملازم ہیں جن میں 85 فی صد عورتیں ہیں۔مگر کمپنی نے جب ایک بار جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ عورتیں عام طور پر کم تنخواہ کے مناصب پر ہیں اور بڑے بڑے عہدے زیادہ تر مردوں کو حاصل ہیں، اس کے 572 مینجروں میں صرف 9 فی صد عورتیں ہیں۔ امریکا کے دوملین سکریٹریوں میں تقریباً سب کی سب عورتیں ہیں۔مگر بیشتر کم تنخواہ پانے والی ہیں۔بعض شکایات کے جواب میں مارچ 1972 میں امریکا کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے یہ آرڈر جاری کیا کہ سکریٹریوں کو فاضل مددگار کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ خاتون سکریٹریوں میں اس بات پر زیادہ سے زیادہ ناراضگی پیدا ہو رہی ہے کہ وہ تفریح طبع کے طور پر دیکھی جاتی ہے۔ (صفحہ 66)

دفتر کے مردان کو پیاری یا شیریں کہہ کر پکارتے ہیں۔ سکریٹری بیک وقت دو مصرف رکھتی ہے۔ وہ دفتر کی ایک ضرورت ہے اور اسی کے ساتھ وہ عہدیدار کے لیے تفریح طبع کا سامان ہے۔ اکثر عہدیدار اپنی سکریٹریوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ "ان کے

ساتھ" کام کرتی ہیں، نہ کہ "ان کے لیے" کام کرتی ہیں۔ (صفحہ 66) امریکا کی کارکن خواتین زیادہ تر وہ خواتین ہیں، جن کے گھر اجڑ گئے۔ (صفحہ 66) مگر جب وہ کام کی تلاش میں نکلتی ہیں تو انھیں اس تلخ تجربہ سے سابقہ پڑتا ہے کہ انھیں صرف چھوٹے کام کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں جو سال انھوں نے لگائے وہ سب بیکار گئے۔

بیسیوں ایسے نجی ادارے ہیں جو عورتوں کو روزگار کے قابل بنانے میں مدد دے رہے ہیں۔ مثلاً شکاگو کا ایک روٹری کلب ہے جو بے روزگار خاتون کو 350 ڈالر دیتا ہے تا کہ وہ اس سے ٹائپ رائٹر وغیرہ خرید کر اپنا کام شروع کر سکے۔ حتیٰ کہ زیادہ عمر کی خواتین کو مصنوعی دانت اور سننے کے آلات تک دیے جاتے ہیں تا کہ وہ انٹرویو میں اچھی ثابت ہوسکیں۔ واشنگٹن کے ایک ادارہ نے 1965 سے اب تک 10 ہزار خواتین کو اس قسم کی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ (صفحہ 67)

تھیٹر کی دنیا میں بھی عورت کا یہی حال ہے۔ عورت مرد کے مقابلہ میں کمتر درجہ کا کردار ادا کرتی ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ ہنسے اور خوش کرے۔ اس کو برابری حاصل نہیں، وہ مرد کے لیے خطرہ نہیں بن سکتی، اس کو مرد کے حفاظتی بازو کی ضرورت ہے۔ (صفحہ 67)

کتابوں کی دنیا میں بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں ہے۔ نیویارک شہر، جو صنعتی مرکز ہے وہاں صرف ایک خاتون ہیں جو کسی بڑے پبلشنگ فرم کی صدر ہوں۔ بڑی فرموں کے کارپوریٹ افسر سب کے سب مرد ہیں۔ عورتیں زیادہ سے زیادہ پبلسٹی ڈائریکٹر کے عہدوں پر ہیں۔ نیویارک کے بڑے پبلشر عام طور پر دو مردوں پر ایک عورت کو لیتے ہیں۔ بچوں کی کتابوں کے پروگرام میں زیادہ تر عورتیں پائی جاتی ہیں۔ امریکا کے افسانوی ادب کا بڑا حصہ عورتیں پیدا کرتی ہیں۔ مگر اکنامکس، پالی ٹکس وغیرہ موضوعات پر ان کے کام بہت کم ہیں۔ (ٹائم میگزین 20 مارچ 1972)

فطرت کا فیصلہ

مغربی تہذیب کے مخصوص نظریات میں سے ایک نظریہ مرد اور عورت کی مساوات تھا۔ مغربی دنیا میں پچھلے سو سال سے اس نظریہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے کسی بھی شعبہ میں یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا جائے۔ قانون کے اعتبار سے برابر کا درجہ پانے کے باوجود عملی طور پر دونوں سماج کے اندر برابر کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

اس فرق کے بارے میں ابتداءً یہ کہا گیا کہ یہ فرق ماحول (Environment) کا پیدا کردہ ہے۔ مگر جدید تحقیقات اس مفروضے کو بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مختلف شعبوں میں تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ فرق حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام تر پیدائشی ہے، نہ کہ تاریخی۔

نیویارک کے نیوزویک (18 مئی 1981) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے، جس میں مختلف امریکی محققین کے نتائج تحقیق درج ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ عورت اور مرد کی بناوٹ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مرد کا مسائل کو حل کرنے میں زیادہ بہتر ثابت ہونا، عورتوں کا جذباتی طور پر سوچنا، لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کا زیادہ بہادرانہ انداز سے کھیلنا، ریاضیات میں مردوں کا زیادہ برتر رہنا، یہ سب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے، نہ کہ محض ماحول کا۔

محققین کا خیال ہے کہ قائدانہ خصوصیتیں (leadership capacities) مردوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ جدید تحقیقات لوگوں کو اس عقیدہ کی طرف لے جا رہی ہیں کہ سابقہ خیال کے برعکس، پرورش (Nurture) نہیں بلکہ فطرت (Nature) وہ اصل عامل ہے

جس نے مرد اور عورت کے عمل میں فرق پیدا کیا ہے۔ عمومی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ لڑنے بھڑنے کی صلاحیت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر زیادہ ہوتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ دونوں کے ہارمون (Hormone) جدا جدا ہوتے ہیں اور وہی دونوں کے درمیان فرق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ محققین نے نَر کے ہارمون (Hormone Testosterone) کو مادہ کے جسم میں داخل کیا تو مادہ کے اندر نر کی خصوصیات محسوس کی جانے لگیں۔ کچھ لڑکیوں میں پیدائش سے پہلے مردانہ ہارمون داخل کردیے گئے۔ چنانچہ پایا گیا کہ پیدائش کے بعد ان میں گڑیوں سے کھیلنے کا شوق بہت کم تھا، ان میں لڑکوں کی طرح جارحیت کا مزاج زیادہ پایا گیا۔

محققین نے پایا ہے کہ ہارمون خود دماغ کے ڈھانچہ کو بدل دیتے ہیں۔ نر اور مادہ کے دماغ (brain) میں فرق پایا گیا ہے اور اس کا سبب دونوں کے ہارمون کا فرق ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ دونوں صنفوں کے درمیان ناقابلِ انکار فرق (undeniable difference) موجود ہے۔

یہ تحقیقات واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ عورت اور مرد کی تخلیق میں فرق ہے اور جب دونوں میں فرق ہے تو دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ ہونا چاہیے۔ مگر جو لوگ لمبی مدت تک پچھلے خیال کے ساتھ وابستہ رہے ہیں وہ ابھی اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ایک مغربی عالم نے کہا:

> "Whether these physiological differences destine men and women for separate role in society is another and far more delicate question."

کیا یہ عضویاتی فرق مردوں اور عورتوں کے لیے سماج کے اندر الگ الگ کردار مقرر کرتے ہیں، یہ ایک علاحدہ اور زیادہ پیچیدہ سوال ہے۔ (ریڈرس ڈائجسٹ، اکتوبر 1981)

اس سے پہلے امریکا کے ایک اور ہفتہ وار میگزین ٹائم (20 مارچ 1976ء) نے اس موضوع پر تفصیلی رپورٹ شائع کی تھی۔ میگزین کے وسیع ادارتی اسٹاف میں 20 تعلیم یافتہ خواتین کو مقرر کیا گیا کہ وہ "جدید امریکا میں عورتوں کی حالت" کا جائزہ لیں۔ انھوں نے ہر میدان میں اس کا جائزہ لیا اور ہر شعبہ کے ماہرین سے مدد لی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی جو خصوصی نمبر کے طور پر مذکورہ میگزین میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ سائنس کے تمام متعلقہ شعبوں کی تحقیق کے مطابق مرد جنس غالب (Dominant Sex) ہے۔

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سو سالہ جدوجہد کے باوجود امریکی عورت ابھی تک اسی مقام پر ہے جہاں وہ سو سال پہلے تھی۔ مرد اب بھی عملاً امریکا میں جنس برتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ قدیم نظریہ کے مطابق، سماجی نہیں ہے بلکہ تمام تر حیاتیاتی اور نفسیاتی ہے۔ مغرب میں آزادیِ نسواں کی تحریک سو سالہ تجربہ کے بعد اب اس رائے پر پہنچی ہے کہ حیاتیاتی حقائق عورت کو مرد کے برابر مقام دینے میں رکاوٹ ہیں۔ یہ قدرت کا ظلم ہے، نہ کہ سماج کا ظلم۔ اس لیے اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس آف ایوجینکس کے ذریعہ رحم مادر میں جینٹک کوڈ کو بدل دیا جائے اور اس طرح نیا حیاتیاتی نظام وجود میں لایا جائے جس میں نئے قسم کی عورتیں پیدا ہوں اور مردوں کی برتری ختم ہو کر یکساں صنفی صلاحیت کا سماج بن سکے — یہ تجویز ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص بطور خود یہ نظریہ قائم کرے کہ مچھلی اور بکری دونوں ایک ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے مچھلی کو بھی دودھ دینا چاہیے جس طرح بکری دودھ دیتی ہے۔ اور جب کوشش کے باوجود مچھلی دودھ نہ دے تو وہ کہے کہ ہم میڈیکل سائنس کے ذریعہ نئے قسم کی مچھلیاں پیدا کریں گے جو بکری کی مانند دودھ دینے لگیں۔

فطرت سے جنگ

کسی ڈاکٹر کو ایک روز خیال آجائے کہ منہ کا مقام چہرہ پر نہیں بلکہ پیٹ پر ہونا چاہیے اور اس کے بعد وہ آپریشن کے ذریعہ منہ کو چہرہ سے ہٹا کر پیٹ پر منتقل کرنا شروع کردے۔ تو دنیا اس کی بیوقوفی پر ہنسے گی۔ کیوں کہ فطرت نے کسی چیز کا جو مقام متعین کردیا ہے وہاں سے اس کو ہٹایا نہیں جاسکتا۔ ہماری کامیابی یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھ کر معاملہ کریں، نہ کہ خود ساختہ نظریہ کے تحت اشیاء کی ترتیب بدل کر ایک نیا نقشہ بنانے کی مہم شروع کردیں۔

اسی تخیل پسندی کی ایک مثال عورت کا مسئلہ ہے۔ جدید تہذیب نے زندگی کا نیا نقشہ بنانا شروع کیا تو اس میں اس کا ایک نعرہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات ہونی چاہیے۔ اس خوشنما تخیل کو وجود میں لانے کے لیے خاندان اور معاشرت کا سارا ڈھانچہ الٹ پلٹ دیا گیا۔ مگر آخر میں جو چیز حاصل ہوئی وہ یہ کہ عورت گھر سے باہر تو آ گئی، مگر عملی زندگی میں وہ مرد کی ہم سر نہ ہوسکی۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ یہاں فطرت نے انسانی تخیل کا ساتھ دیا۔ ایک روسی سائنس داں انٹون نملوف (Anton Nemilov) جو خواہش کی حد تک خود بھی عورت اور مرد میں کامل مساوات دیکھنا چاہتا ہے۔ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ حیاتیات میں ہماری اس خواہش کے لیے بنیاد موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ عملاً یہ چیز اب تک حاصل نہ ہوسکی۔

وہ سائنس کے تجربات اور مشاہدات پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظام تمدن میں محدود حقوق دیے جائیں تو کم سے کم آدمی اس کی تائید کریں گے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہیے کہ مساوات مرد وزن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی

سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی، جتنی سوویت روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصّبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے۔" (صفحہ 76)

"اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل، نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں، بلکہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ سوویت طبقوں میں بھی جما ہوا ہے۔ اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر ان کے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھیں گی۔ بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کریں گی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنس داں، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر یا کسی صد فیصد کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلد یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ عورت کو وہ اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانہ حال کے کسی ناول کو پڑھیں۔ خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو، یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ضرور ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائیں گی۔" (صفحہ 95-194)

عورت کو مساوات کا درجہ نہ ملنا کوئی وقتی اور عملی خرابی نہیں بلکہ اس کی وجہ حیاتیات تک جاتی ہے۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے:

"اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورت واقعی سے ٹکراتا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے اور دونوں پر یکساں بار نہیں ڈالا گیا ہے۔"

(Anton Nemilov, *The Biological Tragedy of Woman* (London, 1932).

فطرت کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہی نہیں ہوتا کہ وہ چیز عملاً حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یقینی طور پر اس کی وجہ سے کئی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فطرت نے کسی چیز کو جہاں رکھا ہے وہی اس کی اصل جگہ ہے۔ اور جب کسی چیز کو اس کے واقعی مقام سے ہٹایا جائے تو اس کے نتیجہ میں خرابی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

یہی چیز عورت کے معاملہ میں ہوئی۔ عورت کو مرد کے مساوی بنانے کے لیے گھر سے باہر نکالا گیا۔ اس سے یہ تو نہیں ہوا کہ عورت فی الواقع مرد کے مساوی ہو جاتی۔ البتہ اس کو زندگی کے ہر موڑ پر مردوں کے ساتھ کھڑا کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ فواحش کا سیلاب امنڈ آیا۔

مذکورہ بالا مصنف لکھتا ہے:

> ”سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عُمال (workers) میں صنفی انتشار (sexual anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت پُر خطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں۔ میں ہزار ہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (sexual licentiousness) نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقہ عُمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔“ (102-3)

روسی مصنف نے یہ بات پچاس سال پہلے کہی تھی۔ مگر بعد کے سالوں نے اس کی مزید تصدیق کی ہے۔ اس کے الفاظ آج مزید اضافے کے ساتھ جدید معاشرہ کے لیے صحیح ہیں وہ کسی اعتبار سے غلط ثابت نہیں ہوئے۔

جدید انسان نے عورت اور مرد کے قدیم تصور کو دقیانوسی قرار دیا۔ اور عورت اور مرد کے

درمیان صنفی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ فطرت (Nature) سے جنگ کرنا تھا۔ یہ حقیقت واقعہ سے ٹکرانا تھا، اس کا نتیجہ الٹا ہوا۔ اس کے نتیجے میں دونوں صنفوں کے درمیان مساوات کا مقصد تو حاصل نہیں ہوا۔ البتہ اس مصنوعی کوشش کا یہ نقصان ہوا کہ معاشرہ کے اندر نئی نئی برائیاں پیدا ہوگئیں۔

چند مثالیں

مغربی تہذیب نے عورت کے معاملہ میں فطرت سے جو انحراف کیا، اس کے بڑے عجیب اور مہلک نتائج پیدا ہوئے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑے گی۔

شادی نہ کرنا غلطی

گریٹا گاربو (Greta Garbo) کسی زمانہ میں ہالی وڈ کی مشہور ترین ایکٹرس تھی۔ مگر اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد فلمی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے پرانے دوست بھی سب کے سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ 18 ستمبر 1980 کو اس نے اپنی 75 ویں سال گرہ تنہا منائی۔ گریٹا گاربو کے سوانح نگار نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ کو اس بات پر افسوس ہے کہ آپ نے شادی نہیں کی جس کی وجہ سے آج آپ کی تنہائیوں کا کوئی ساتھی نہیں۔ گریٹا گاربو نے غمگین لہجہ میں جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ میرا شادی نہ کرنا ایک غلطی تھی:

"Not getting married was a mistake."

(*Hindustan Times*, 21 September 1980)

خدا نے انسان کو جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے سے مل کر انسانیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ پھر زندگی کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ اس کا مستقل ہونا بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خدا نے نکاح کا

طریقہ مقرر کیا ہے۔ نکاح ایک مرد اور عورت کو مستقل خاندانی تعلق میں جوڑتا ہے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر خود اپنے تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور سماج کے تقاضوں کی بھی۔

مغربی زندگی میں آزادی کے غلط تصور کا یہ نتیجہ ہوا کہ شادی کو بندھن خیال کیا جانے لگا۔ اس کے نتیجے میں جو آزادانہ زندگی پیدا ہوئی اس نے بے شمار خاندانی اور سماجی مسائل پیدا کر دیے۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جس سے گریٹا گاربو جیسی عورتیں دوچار ہوتی ہیں۔ جوانی کی عمر میں جب کہ ان کے اندر مردوں کے لیے کشش ہوتی ہے وہ ہر جگہ رونق محفل بنی رہتی ہیں۔ ان کو روزانہ ایسے تفریحی پروگرام ملتے رہتے ہیں جن میں مصروف رہ کر وہ اپنے صبح وشام گزارتی رہیں۔ مگر جب عمر زیادہ ہوتی ہے اور جنس مخالف کے لیے اپنی نسوانی کشش کھو دیتی ہیں تو اچانک ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کی تمام سرگرمیاں محض مصنوعی سرگرمیاں تھیں دوستیاں اور تعلقات اس طرح چھوٹ جاتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درخت کے پتے۔ اس وقت انھیں معلوم ہوتا ہے کہ مستقل وفاداری کو بندھن سمجھنا ان کی کتنی بڑی غلطی تھی۔

ان پر یہ کھلتا ہے کہ اب تک وہ خوابوں کی دنیا میں جی رہی تھیں۔ ان کی رونقوں سے بھری زندگی اچانک ایک سُونے گھر میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہوتی کہ کتے اور بلی پال کر دل بہلاتی رہیں۔ ان کا کوئی رفیق حیات نہیں ہوتا جو خوشی اور غم میں ان کا شریک ہو۔ ان کے سامنے اپنے بچوں کا وہ ''باغ'' نہیں ہوتا جن کی صورت میں ایک آدمی اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کے تسلسل کو دیکھ کر مطمئن ہوتا ہے۔ ان کے آس پاس کوئی ''اپنا'' نہیں ہوتا جس کو اپنی زندگی کا اثاثہ سونپ کر وہ سمجھیں کہ انھوں نے دنیا میں بے کار محنت نہیں کی ان کو گوشت پوست کی کوئی ایسی دنیا نظر نہیں آتی جس کو وہ اپنا

سمجھیں اور جو انھیں اپنا سمجھے۔ ایسے لوگ بھری ہوئی کائنات میں بالکل تنہا ہو کر رہ جاتے ہیں اور یقیناً کسی آدمی کے لیے تنہائی سے بڑی کوئی سزا نہیں۔

اچھی بیوی بنو

فرینک بورمین Frank Borman ایک امریکی خلا باز ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی خلائی کشتی میں پرواز کیا تھا جس میں ان کے علاوہ ایک خاتون خلا باز بھی سوار کرائی گئی تھی۔ مسٹر بورمن نے ایک بیان میں کہا:

"Having women on the spacecraft was okay except that it would be upsetting to put a male and a female too close together for a long time."

خلائی کشتی میں عورت کو بٹھانا اچھا ہے۔ البتہ ایک عورت اور ایک مرد کو دیر تک اتنا زیادہ قریب رکھنا ابتری کا باعث ہوگا۔ مسٹر بورمن کے اس بیان نے مساوات مرد وزن کے بہت سے علم برداروں کو بوکھلا دیا ہے۔ ایک امریکی خاتون نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا:

"مسٹر فرینک بورمن کا وجود کہاں ہوتا اگر ان کے ماں اور باپ اکٹھا نہ ہوئے ہوتے۔"

سائنسی تحقیقات نیز عملی زندگی کے حقائق نے مساوات مرد وزن کے قدیم تصور کو سخت جھٹکا پہنچایا ہے۔ ایک امریکی خاتون مسز مارگن (Marabel Morgan) دو بچوں کی ماں ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے:

مکمل عورت (Total Woman)

اس کتاب میں انھوں نے اپنی امریکی بہنوں کو "خوش گوار ازدواجی زندگی" کے لیے یہ سادہ گر بتایا ہے:

"Be nice to your husband, stop nagging him and understand his needs."

اپنے شوہر کی اچھی رفیق بنو۔ اس کو ملامت کرنا چھوڑ دو، اس کی ضرورتوں کو سمجھو۔

یہ کتاب ایک سال سے بھی کم عرصہ میں تین ملین کی تعداد میں فروخت ہوچکی ہے۔ موصوفہ کے نزدیک مرد کی رفیق بننا عورت کی تکمیل ہے، نہ کہ آزادانہ زندگی کا مالک بننا۔(ٹائمس آف انڈیا، 8فروری 1978)

حقیقت یہ ہے کہ مکمل عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کی مکمل رفیق بن سکے۔

ناکامی کا اعتراف

امریکا کی ایک ایکٹرس جین سیبرگ (Jean Seberg) نے اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ امریکا کے علاوہ یورپ میں بھی وہ ایک عرصہ تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس نے قدیم انداز میں ایک ''گھر'' بسانے کے بجائے لاکھوں گھروں کے لیے سامان تفریح بننے کو ترجیح دیا۔ مگر اس کی موت کے بعد جب اس کی ڈائری پڑھی گئی تو اپنی ڈائری کی آخری سطروں میں اس نے لکھا تھا:

"I wish I had stayed home."

کاش میں اپنے گھر میں رہی ہوتی (ٹائمس آف انڈیا 8نومبر 1981ء)

کیسا عجیب تھا یہ کامیاب سفر جو بالآخر صرف ناکامی پر ختم ہوا۔

خدا نے جس طرح اس دنیا کی مادی چیزوں کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی فطرت پر قائم رہ کر کوئی چیز اپنا صحیح وظیفہ انجام دے پاتی ہے۔ یہی حال انسان کا بھی ہے۔ خدا نے مرد کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی طرح عورت کو بھی خاص فطرت پر پیدا کیا ہے۔ دونوں اسی وقت اپنی زندگی صحیح طور پر گزار سکتے ہیں جب کہ وہ خدا کی فطرت پر قائم رہیں۔ فطرت سے ہٹتے ہی زندگی کے نقشہ میں اپنا مقام کھودیں گے۔

عورت کی صلاحیتیں واضح طور پر مرد سے مختلف ہیں۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت کا دائرہ کار اور مرد کا دائرہ کار عمومی اعتبار سے یکساں نہیں۔ مرد کا دائرہ کار اگر باہر ہے تو

عورت کا دائرہ کار "اندر" مرد اپنے دائرہ کار میں زیادہ مفید بن سکتا ہے اور عورت اپنے دائرہ کار میں۔ اگر دونوں اپنے دائرہ کار کو بدلیں تو دونوں اپنی معنویت کو کھو دیں گے۔ دونوں اپنے کو بے جگہ بنا لیں گے۔

صرف مسائل پیدا ہوئے

امریکا سے ایک ناول چھپا ہے جس کا نام ہے — "اکیلی خاتون":

Harold Robbins, *The Lonely Lady,* London, New English Library, 1976.

اس ناول میں امریکا کے ترقی یافتہ معاشرہ کی ایک کمزوری کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عورت کی غیر شادی شدہ زندگی بالآخر ایک ناقابل برداشت تنہائی پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی کے مطابق، ایک خوبصورت اور نوجوان امریکی خاتون فلمی دنیا کی چمک دمک (glamour) سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ زندگی کو چھوڑ کر فلم ایکٹرس بن جاتی ہے۔ اس کی باکمال نسوانیت اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ بہت جلد ترقی کی سیڑھیاں طے کرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ترقی کے آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ دولت، شہرت، عزت اور چاہنے والوں کی بھیڑ، ہر چیز بافراط اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ مگر ترقی کی آخری انتہا پر پہنچنا اس کو سکون نہیں دیتا۔ اب وہ ایک تلخ حقیقت (bitter truth) کو دریافت کرتی ہے:

> that "fame has a way of fading, and friends a way of disappearing when they are most needed."

یہ کہ شہرت بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ اور دوست بالآخر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جب کہ ایک عورت کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ امریکی خاتون نہایت حسرت بھرے انداز میں کہتی ہے:

Only a woman knows what loneliness is.

حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت ہی اس بات کو جانتی ہے کہ اکیلا پن کیا ہے۔ ناول کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ فلمی دنیا کے ذریعہ بڑی بڑی کمائی کرنا اور اپنے لیے ایک خود مختار زندگی حاصل کرنا بظاہر بڑا پُرکشش معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب عورت کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھیوں میں اس کے لیے کشش باقی نہیں رہتی تو وہ ایک ناقابل برداشت حادثہ سے دوچار ہوتی ہے۔

اس کے پاس دولت اور مادی ساز وسامان کا انبار ہوتا ہے۔ مگر وہی چیز نہیں ہوتی جس کی ایک عورت کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی زندگی کا چین۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتا جو اس کے صبح وشام میں اس کا ساتھی بن سکے۔ وہ ایک ایسے آباد گھر کی مالک نہیں ہوتی جس کو وہ اپنا گھر سمجھے:

> "Here is a loneliness born of independence, of honest individualism in a society where only dishonesty brings profit."

یہ ایک تنہائی ہے جو خود مختار زندگی سے برآمد ہوتی ہے، ایک دیانت دارانہ فردیت، ایک ایسے سماج میں جہاں بددیانتی ہی سب سے بڑا نفع بخش سرمایہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بے حد نازک ترکیب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس میں ادنیٰ تبدیلی بھی صرف بربادی پر ختم ہوتی ہے۔ جمادات اور نباتات کی دنیا کے لیے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کامیابی کا راز یہ ہے کہ فطرت کے بنائے ہوئے نظام سے انحراف نہ کیا جائے۔ یہاں مطلوب نتیجہ تک پہنچنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ فطرت کے مقررہ ڈھانچہ کو قبول کیا جائے۔ مگر وہی انسان جو جمادات اور نباتات کے معاملہ میں اس حقیقت کی مکمل پابندی کرتا ہے وہ خود اپنی زندگی کے معاملہ میں اس ابدی

حقیقت کو بھول جاتا ہے۔

عورت اور مرد کے لیے فطرت کا بنایا ہوا نظام یہ ہے کہ وہ شادی شدہ زندگی گزاریں۔ ان کی جسمانی ساخت ان کے نفسیاتی اور خاندانی مسائل، ان کے اجتماعی رشتے سب اپنی درستگی کے لیے شادی شدہ زندگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ عورت کا آزاد اور خود مختار رہنا، الفاظ کے اعتبار سے بظاہر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر اس کا عملی تجربہ اتنا ہی زیادہ بھیانک ہے۔

عورت اپنی جوانی کی عمر میں بڑی آسانی سے اس قسم کے خوش کن اور دل فریب نظریات کا شکار ہو جاتی ہے۔ مگر جب اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا راستہ غلط تھا۔ مگر یہ علم اس کو صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ تلافی کا وقت نہیں ہوتا۔ اب اس کے لیے موجودہ دنیا میں جو چیز رہ جاتی ہے وہ صرف یہ کہ کتّوں اور خرگوشوں کو پال کر مصنوعی طور پر ان سے دل بہلائے اور بالآخر حسرت اور مایوسی کے قبرستان میں جا کر سو رہے۔

لذتیت کا انجام

جان کینڈی (1917-1963) امریکا کا 35 واں صدر تھا۔ اس نے جیکولین کینڈی سے شادی کی۔ اس کے بعد جیکولین کینڈی امریکا کی خاتونِ اوّل کی حیثیت سے کافی مشہور ہوئی۔

امریکا کی ایک خاتون مصنف کٹی کیلی نے جیکولین کینڈی کے بارے میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے — آہ جیکی:

Jackie Oh: *An Intimate Biography, By Kitty Kelley*, Vikas, New Delhi, 1979, pp. 336

یہ کتاب جیکولین کینڈی کے نجی حالات کے بارے میں ہے جو کہ کسی وقت امریکا کی خاتونِ اول (First Lady) تھی۔

جیکولین قدرت سے ایک پُرکشش نسوانی شخصیت لے کر پیدا ہوئی۔ اس کی اس پیدا

ئشی خصوصیت نے جان کینڈی کو متاثر کیا جو امریکہ کی ایک اعلیٰ فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی شادی جان کینڈی سے ہوگئی۔ بعد کو جان کینڈی امریکا کے صدر منتخب ہوئے۔ اس طرح جیکولین کینڈی کو امریکا میں وہ اعلیٰ ترین مقام حاصل ہوگیا۔ جس کے آگے مزید برتری کا کوئی مقام نہیں۔

جان کینڈی 1960 میں امریکا کے 35 ویں صدر منتخب ہوئے تھے۔ مگر اس کے صرف تیسرے سال 23 نومبر 1963 کو صدر کینڈی کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ جیکولین کینڈی جو اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مشہور اور معزز خاتون بن چکی تھی اچانک بے حیثیت ہو کر رہ گئی۔ تاہم اس کی نسوانی کشش نے یونانی ارب پتی ارسٹاٹل اوناسس (Aristotle Socrates Onassis 1906-1975) کو متاثر کیا۔ اس کی دوسری شادی اوناسس سے ہوگئی۔ اس وقت جیکولین کی عمر تقریباً 40 سال اور اوناسس کی عمر تقریباً 60 سال تھی۔ یہ شادی دونوں کے لیے خوش گوار ثابت نہ ہوسکی۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہی دونوں الگ الگ رہنے لگے۔ یہاں تک کہ 1975 میں طویل بیماری کے بعد اوناسس کا انتقال ہوگیا، جب کہ جیکولین اس کے پاس موجود بھی نہ تھی۔

جیکولین کو ہر چیز ملی مگر اس کو خوشی نہ مل سکی۔ اس کی سوانح نگار کٹی کیلی کے الفاظ میں جیکولین نے خوشی حاصل کرنے کی بابت اپنی ناقابل علاج خواہش کو خرید کر حاصل کرنا چاہا۔ خواہ اس کی قیمت 3 ہزار ڈالر فی گھنٹہ دینی پڑے۔ اس کے باوجود وہ خوشی حاصل نہ کرسکی:

An incurable desire to buy happiness. even if it meant spending as much in one hour as 3000 dollars.

خودکشی کرلی

میریلین مونرو (Marilyn Monroe) امریکا کی ایک انتہائی مشہور خاتون ہے۔ اس نے اولاً فوٹو گرافر کے ماڈل کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے

بعد وہ اپنی غیر معمولی نسوانی کشش کی بنا پر فلم کی دنیا کی ہیرو بن گئی۔ اس کو جنسی دیوی (sex goddess) کہا جانے لگا۔ اس کی فلموں کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ جہاں کہیں اس کا کوئی "شو" ہوتا تو بے شمار تماشائی اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے۔

میریلین مونرو کی آخری فلم بے جوڑ (The Misfits) تھی۔ فلم کا یہ عنوان گویا خود اس کی اپنی زندگی کا بھی عنوان تھا۔ وہ اپنے کو بے جگہ پا رہی تھی۔ انسانی سمندر کے درمیان وہ نفسیاتی طور پر تنہا ہو کر رہ گئی تھی۔ بظاہر اس کی ہنستی ہوئی تصویریں اخباروں اور رسالوں میں چھپتی تھیں۔ مگر اندر سے وہ اپنے آپ کو مستقل طور پر افسردگی (depression) میں محسوس کرتی تھی۔ آخر کار وہ اس نفسیاتی عذاب کو برداشت نہ کر سکی۔ 5 اگست 1962 کو اس نے بیک وقت بہت سی گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف 36 سال تھی۔

اس قسم کی عورتوں کا عام حال یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر خوش دکھائی دیتی ہیں مگر ان کا دل مستقل طور پر روتا ہے۔ ان کی زندگی بڑی مظلومی کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ سب کی ہوتی ہیں مگر کوئی ان کا نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کو خوش کرتی ہیں مگر ان کو یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ کوئی نہیں جس کے ساتھ وہ اپنی خوشی کے لمحات گزار سکیں۔ مجلسی تقریبات میں بظاہر ان کی شخصیت ایک معمور شخصیت دکھائی دیتی ہے مگر اپنی حقیقی دنیا میں وہ اپنے آپ کو بالکل خالی محسوس کرتی ہیں۔ ابتدائی شاندار زندگی آخر کار ایک غیر شاندار زندگی پر ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تنہائی کی زندگی عورت کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ عورت تنہائی کا تحمل نہیں کر سکتی۔ مگر مغربی تہذیب کا راستہ عورت کو آخر کار جہاں پہنچاتا ہے وہ یہی تنہائی کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس، اسلام عورت کو ایک ایسی زندگی کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ تنہا نہیں ہوتی، بلکہ ایک پورے خاندان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس سے یہ

ثابت ہوا کہ اسلام کا طریقہ فطری طریقہ ہے اور مغربی تہذیب کا طریقہ غیر فطری طریقہ۔

مجھ سے دور رہو

انڈین اکسپریس (14 مئی 1986) میں صفحہ 14 پر ایک مغربی عورت کی تصویر ہے۔ وہ ایک میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہے اور ایسی پریشان حال دکھائی دے رہی ہے جیسے کہ اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ مگر یہ کوئی عام عورت نہیں۔ یہ دور جدید کی مشہور ترین ایکٹریس ایلزبتھ ٹیلر ہے تصویر کے نیچے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

> ASKING FOR MONEY: Testifying before a Senate sub-committee Capitol Hill in Washington on Thursday actress Elizabeth Taylor pleads for more money to find a cure for the deadly AIDS disease.
>
> (*Indian Express,* New Delhi, May 14, 1986)

"ایڈز" کے لیے رقم۔ امریکی سینٹ کی ایک سب کمیٹی کے سامنے واشنگٹن میں ایکٹرس الزبتھ ٹیلر اپنا مسئلہ پیش کرتے ہوئے مزید رقم کا مطالبہ کر رہی ہے تاکہ وہ ایڈز کے مہلک مرض سے نجات حاصل کر سکے۔

"ایڈز" موجودہ زمانہ کا ناقابل علاج مرض ہے جو بے قید جنسی اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا شخص نہ صرف خود عجیب وغریب قسم کی تکلیفوں کا شکار ہوجاتا ہے بلکہ وہ متعدی بھی ہے۔ دوسرے لوگ ایسے شخص سے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اعلان کیا ہے کہ ایڈز کے مریض سے جو شخص چھو جائے گا اس کو بھی ایڈز کا مرض لاحق ہوجائے گا۔ چنانچہ ٹیلر جیسی خواتین جن سے قریب ہو کر لوگ فخر محسوس کرتے تھے، اب وہ ایسی عورتوں سے دور بھاگ رہے ہیں کہ کہیں ان کو بھی یہ مہلک مرض لاحق نہ ہوجائے۔

کیسا عجیب ہے مغربی عورت کا یہ انجام۔ وہ مساوی درجہ حاصل کرنے کی کوشش میں

غیر مساوی درجہ تک پہنچ گئی۔ آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ انسانی قافلہ سے پیچھے چلی گئی۔

شہرت بوجھ بن گئی

فرانس کی سنیما کی تاریخ میں جس خاتون نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ "بی بی" (Brigitte Bardot) ہے۔ وہ 1934 میں پیدا ہوئی۔ فلمی دنیا میں بعض اعتبار سے اس نے میریلین مونرو اور مارلین ڈٹرچ سے بھی زیادہ بڑا مقام حاصل کیا۔ جون آف آرک کے بعد وہ فرانس کی سب سے زیادہ شہرت یافتہ خاتون شمار ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "بی بی" کے ذریعہ باہر کی جو دولت فرانس میں آئی وہ اس سے بھی زیادہ ہے جو مشہور رینالٹ (Renault) موٹر کمپنی کے ذریعہ فرانس میں آئی۔ ٹونی کرالی نے 1958 کے آخر میں اندازہ لگایا تھا کہ اس کی تصویریں یورپ اور امریکا کے جرائد کے صفحہ اوّل پر 29345 بار چھپ چکی ہیں۔ (ریڈرزڈائجسٹ مئی 1986)

"بی بی" کی فلم پر فلم بنتی رہی۔ اس کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ بعض اوقات وہ اپنے گھر سے نکلنے میں صرف اس لیے کامیاب نہ ہوسکی کہ اس کے گھر کے باہر فوٹو گرافروں کی نا قابل عبور فوج کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے نام روزانہ اتنے زیادہ خطوط آتے تھے کہ ان کی منتخب تعداد کو پڑھنا بھی اس کے لیے ناممکن تھا۔

ان تمام ظاہری رونقوں کے باوجود اندر سے وہ سخت غیر مطمئن تھی حتیٰ کہ اس کی شہرت اس کے لیے ایک بوجھ بن گئی۔ اس نے خودکشی کے ارادہ سے ایک رات بہت زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھالیں:

> One night, worn out by her own fame, Brigitte swallowed an overdose of tranquillizers.

تاہم وہ مر نہ سکی۔ اس وقت بھی جب کہ وہ نازک حالت میں پیرس کے ایک اسپتال میں لے جائی جارہی تھی، فوٹو گرافروں نے ایمبولنس کار کو زبردستی راستہ میں روکا تا کہ وہ اس کا فوٹو لے سکیں۔ "بی بی" کے بارے میں ایک رپورٹ میں اس کا تاثر بتایا گیا تھا کہ کیمرہ

کے سامنے اس نے کبھی سکون محسوس نہیں کیا:

She never really felt at ease in front of the camera.

39 سال کی عمر میں جب کہ وہ تقریباً پچاس کامیاب فلمیں بنا چکی تھی، اس نے اچانک اپنا کیریر ختم کردیا۔ وہ فلمی دنیا سے بالکل بے تعلق ہوگئی۔ اس نے اپنی شاندار رولس رائس کار فروخت کردی اور اپنے مکان میں تنہا رہنے لگی جہاں وہ ایک معمولی انسان کی طرح خاموش زندگی گزار سکے:

"She sold her Rolls-Royce and went to live alone in her house on the Riviera," to cease to be considered a beautiful object and become a human being like any other." she said.

حقیقت یہ ہے کہ گھر کے باہر کی دنیا میں ہیرو بننا اور ہر طرف شہرت حاصل کرنا عورت کی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ عورت فطری طور پر خانہ پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصنوعی میدانوں میں شہرت پانے والی عورتیں اپنے کیریر کے درمیان میں یا اس کے آخر میں خانہ نشیں ہوجاتی ہیں۔ وقتی چمک دمک کے بعد بالآخران کو جہاں سکون ملتا ہے وہ ان کا گھر ہے، نہ کہ ان کا باہر۔

عورت کے بارے میں اسلام کا قانون عورت کی اسی فطرت کی رعایت ہے، نہ کہ عورت کے اوپر کوئی ظلم۔ وہ مقام جہاں ایک عورت ناکام تجربہ کے بعد پہنچتی ہے، اسلام چاہتا ہے کہ وہ اپنے آزادارادہ کے تحت خود اپنے انتخاب کے ذریعہ وہاں پہنچے۔

میدانِ عمل سے محرومی

مرد ہو یا عورت ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے قیمت پاتا ہے۔ عورت کو مرد کے مساوی قرار دے کر جب گھر سے باہر لایا گیا تو اس کی قیمت اس میں تھی کہ وہ ان تمام شعبوں کو سنبھال لے جن کو مرد روایتی طور پر سنبھالے ہوئے تھا۔ یعنی وہ پائلٹ، ڈرائیور، انجینئر،

پروفیسر، ایڈمنسٹریٹر، پولیس آفیسر، فوجی کمانڈر وغیرہ وغیرہ تمام حیثیتوں میں بالکل مرد کی طرح کام کرنے لگے۔ مگر حیاتیاتی اعتبار سے عورت کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ وہ ان شعبوں کو اس طرح سنبھال نہیں سکتی جس طرح مرد ان کو سنبھالے ہوئے ہے۔

عورت جب مردانہ شعبوں کو سنبھال نہ سکی تو اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ وہ ان شعبوں میں جمع ہونے لگی جن میں وہ اپنی نسوانیت کے اعتبار سے قیمت پاسکتی تھی، نہ کہ تمدنی کارکردگی کے اعتبار سے۔ مثلاً فلم، ٹیلی ویژن، تفریحی مجلس، وہ اشتہاری صنعتیں جو عورت کی نسوانیت کو استعمال کرتی ہیں۔ مگر یہاں عورت کی دوسری کمزوری اس کی راہ میں حائل ہوگئی۔ ان شعبوں میں جوان عورت کی قیمت تھی اور عورت کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ جوان رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت باہر نکل کر ایک قسم کی ادھوری شخصیت بن گئی۔ وہ صرف جوانی کے چند سالوں تک اپنے کو باقیمت ثابت کرسکی۔ جوانی کی مدت ختم ہونے کے بعد باہر کی زندگی میں اس کی کوئی قیمت نہیں رہی۔

مغربی ملکوں میں آزادیٔ نسواں کی تحریک نے پردہ کو ختم کردیا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان کوئی حدبندی باقی نہ رہی۔ تمام عورتیں سڑکوں اور بازاروں میں نکل آئیں۔ اب جن عورتوں میں نسوانی کشش نسبتاً زیادہ ہو وہ فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ وہ تیزی سے لوگوں کے درمیان مقبولیت حاصل کرلیتی ہیں۔ مگر یہ مقبولیت اس قیمت پر حاصل ہوتی ہے کہ وہ خاندانی زندگی سے دور ہوجاتی ہیں۔ وہ شادی کو بندھن سمجھ کر اس سے بے رغبت ہو جاتی ہیں۔ وہ گھر بنا کر اس میں رہنے کے بجائے محفل کی رونق بننا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

مگر یہ پُررونق لمحات بے حد وقتی ہوتے ہیں۔ جوانی کی خاص عمر تک ان عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے، اس کے بعد انھیں نارنگی کے چھلکے کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ مقبول شخصیت بالآخر خود اپنے ماحول میں غیر مقبول شخصیت بن کر رہ جاتی ہے۔

مغربی تہذیب میں صرف ''جوان عورت'' کے لیے جگہ ہے۔ ''بوڑھی عورت'' کے

لیے مغربی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں۔ مغربی تہذیب میں ایک عورت اپنی نسوانی کشش کی بنیاد پر جگہ حاصل کرتی ہے۔ بڑھاپے میں یہ نسوانی کشش ختم ہوجاتی ہے۔ اس لیے مغربی عورت بوڑھی ہونے کے بعد اپنا مقام بھی کھودیتی ہے۔ ”جو شخص ذمہ داری قبول نہ کرے اس کو حقوق میں بھی حصّہ نہیں ملتا۔“ یہ مقولہ اپنی بدترین شکل میں مغربی عورت کے حق میں صادق آیا ہے۔

خاندان سے وابستہ ہوکر جو زندگی بنتی ہے۔ اس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خاندان میں ایک عورت ”بیوی“ کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کرتی ہے۔ یہاں اس کو اپنے عمل کا بھر پور میدان مل جاتا ہے۔ اس کا گھر ایک پوری مملکت ہوتا ہے جس کو وہ سنبھالتی ہے اور جس کی وہ تنہا انچارج ہوتی ہے۔ یہاں اس کی کارکردگی سے اس کی تاریخ بنتی ہے جو آخر وقت تک اس کا ساتھ دیتی ہے ہر اگلا دن یہاں اس کے عزت و احترام میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ ”ماں“ بنتی ہے۔ پھر وہ نانی اور دادی بنتی ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنے شوہر کی نظر میں اس کی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ عورت جوانی کی عمر میں بیوی ہوتی ہے اور بڑھاپے کی عمر میں وہ ماں کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔

عورت کی یہ حیثیت بالکل فطری ہے۔ چنانچہ خود مغربی دنیا میں جو افراد ازدواجی دائرہ میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں، ان کے یہاں بھی فطرت کے زور پر عورت یہی حیثیت حاصل کرلیتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک سبق آموز مثال امریکا کے صدر رونالڈ ریگن کی ہے۔ چنانچہ ایک امریکی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر ریگن اپنی بیوی سے بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ وہ ان کو ”ماں“ کہتے ہیں جب کہ وہ عوام سے دور ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کے قریبی رفیقوں نے بتائی:

"Mr. Reagan is known to be deeply attached to his wife,

whom he calls 'mommy' away from the public, according to their close associates."

(*Hindustan Times*, October 18, 1987, p. 1)

اس طرح عمر بڑھنے کے ساتھ گھر کے اندر عورت کا وقار بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھر کی مالکہ کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ خاندان کسی عورت کی وہ دنیا ہے جو اوّل سے آخر تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔ جب کہ مغربی تہذیب کا حال یہ ہے کہ وہ زندگی کے چند سالوں میں عورت کی ساتھی ہے، وہ اس کی عمر کے طویل تر حصہ میں عورت کی ساتھی نہیں۔ مغربی زندگی میں عورت اپنی جوانی کے چند سال کے بقدر قیمت پاتی ہے اور خاندانی زندگی میں اپنی پوری عمر تک۔

جاپان کی مثال

جاپان کی عورتوں کے بارے میں ایک رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جاپان میں اگرچہ 15 ملین کارکن خواتین موجود ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر معمولی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے مرد افسروں (male superiors) کی مددگار کے طور پر کام کرتی ہیں۔

36 سال بعد دو خواتین جاپانی کابینہ میں لی گئی ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر متحدہ اقوام کے موسم خواتین کی رعایت سے جو 1985 میں ختم ہو رہا ہے۔ جاپان میں اس وقت 608 ڈپلومیٹ ہیں۔ ان میں خواتین کی تعداد صرف 12 ہے۔ جاپان آج بھی بنیادی طور پر مردوں کا سماج (male-dominated society) ہے۔

رپورٹ میں جاپان کی موجودہ خاتون وزیر کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں:

"A bill, yet to be passed by the parliament on ending discrimination against women, is considered by many of its male critics to be reverse discriminatory."

عورتوں کے خلاف امتیاز کو ختم کرنے والا ایک بل جاپانی پارلیمنٹ میں ہے مگر وہ اب تک پاس نہ ہوسکا۔ اکثر مرد ناقدین اس بل کو برعکس امتیاز پیدا کرنے والا اقدام سمجھتے ہیں (انڈین اکسپریس، 24 نومبر 1984)۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کی مساوی شرکت کے بغیر قومی ترقی نہیں ہوسکتی انھیں اس واقعہ سے نصیحت لینا چاہیے۔ جاپان دور جدید کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر یہ ترقی اس کو اس کے بغیر حاصل ہوتی ہے کہ اس نے اپنی خارجی سرگرمیوں کے تمام میدانوں میں عورتوں کو برابر کے شریک کی حیثیت سے داخل کر دیا ہو۔

قدیم زمانہ میں عورت اور مرد کے کام کا دائرہ الگ الگ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں حد بندی کو ختم کر دیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اس سے ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔ مگر تجربے نے بتایا کہ تقسیم عمل کے قدیم نظام کو توڑنے کا کوئی فائدہ تمدنی ترقی کے اعتبار سے نہیں ہوا۔ جن ملکوں میں عورت اور مرد دونوں کو زندگی کے ہر میدان میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے وہاں بھی عملاً زندگی کے تمام ترقیاتی کام مردوں ہی کے ہاتھ میں ہیں، نہ کہ عورتوں کے ہاتھ ہیں۔

جاپان کی مذکورہ مثال بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ جاپان پورے معنوں میں دور جدید کا ایک ترقی یافتہ ملک ہے مگر وہاں کا سماج ابھی تک قدیم انداز کے مطابق مردوں کے غلبہ کا سماج ہے۔ جاپان کی مثال ثابت کرتی ہے کہ ترقی کے لیے عورتوں کی مفروضہ مساوی شرکت ضروری نہیں۔ ایک امریکی خاتون شرمن ببیر (Sharmon Babior) نے اس معاملہ میں جاپان اور امریکا کے فرق کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میں یہ نہیں سمجھتی کہ امریکی عورت اس جاپانی نقطۂ نظر کو برداشت کرسکتی ہے کہ شوہر اپنے گھر کا حاکم ہے:

> "I don't think American women would tolerate the «Teishukanpaku» (the husband is the ruler of his home) behaviour."

(*The Times of India,* New Delhi, December 1, 1987)

تہذیب جدید کے نتائج

”مغربی سماج میں اگر بگاڑ ہے تو مسلمانوں کے موجودہ سماج میں بھی بگاڑ ہے۔ اس کے باوجود آپ مغربی تہذیب کو غلط اور اسلام کو صحیح کیسے کہتے ہیں“ ایک شخص نے کہا۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں۔ اس لیے کہ جس اعتبار سے ہم مغربی تہذیب اور اسلام کے درمیان تقابل کر رہے ہیں اس میں دونوں کے درمیان ایک واضح فرق ہے۔ مسلم سماج کا بگاڑ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ عین اس کے اصولوں پر عمل کرنے کا نتیجہ۔

مسلمانوں کے درمیان جو بگاڑ ہے وہ اصول اور عمل کے درمیان فرق ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ اصول اور حقیقتِ واقعہ کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے معاشرتی زندگی کے بارے میں مذہبی اصولوں کے بالمقابل کچھ دوسرے اصول وضع کیے۔ اور قدیم اصول کے مقابلہ میں جدید اصول کی معقولیت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ زمین کے قابلِ لحاظ حصے پر مغربی اقوام کا سیاسی اور مادی غلبہ قائم ہو گیا۔ انھیں یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ وہ قدیم اصولِ حیات کو رد کر کے جدید اصول حیات کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کی تشکیل کریں۔

مغربی اقوام کے غلبے کے ساتھ ہی یہ عمل شروع ہو گیا۔ اب اس تجربہ پر 100 سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ مگر عملی تجربہ اصول کی صداقت کو ثابت نہ کر سکا۔ اس تجربے نے نہ صرف یہ بتایا کہ مغرب نے انسانی زندگی کے جو نئے اصول وضع کیے تھے وہ فطرت سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اصول اور حقیقت واقعہ کا یہ ٹکراؤ بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ مغربی زندگی میں شدید قسم کی ابتری پیدا ہو گئی جس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسلم سماج میں آج جو بگاڑ پایا جاتا ہے اس کا حل یہ ہے کہ مسلم سماج کو سابقہ اسلامی اصولوں کی طرف لوٹایا جائے۔ مگر یہی بات مغرب کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی۔ مغرب کا سماج اگر پیچھے کی طرف لوٹایا جائے تو اس کا لوٹنا عین انھیں اصولوں کی طرف لوٹنا ہوگا جن پر آج بھی وہ پوری طرح قائم ہے۔ جن لوگوں نے آزادانہ جنسی اختلاط کا نظریہ پیش کیا یا جنھوں نے عورت کو ہر مردانہ شعبہ میں داخل کرنے پر اصرار کیا یا جنھوں نے یہ کہا کہ نکاح کا ادارہ ایک غیر ضروری بندھن ہے۔ وہ آخر اپنے اصولوں کی طرف لوٹیں تو کس چیز کی طرف لوٹیں گے۔ وہ اسی چیز کی طرف لوٹیں گے جس پر آج بھی وہ قائم ہیں اور جس کے ہولناک نتائج سے وہ بالفعل دو چار ہورہے ہیں مسلمانوں کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اسلام کے چھوڑے ہوئے اصول کو دوبارہ اختیار کریں۔ جب کہ مغربی معاشرہ کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ اصول کو ترک کردے۔ اس معاملے کی مزید وضاحت کے لیے یہاں ہم کچھ واقعاتی مثالیں پیش کریں گے۔

اُلٹی طرف سفر

امریکا کا انگریزی ہفتہ وار ٹائم (*Time*) نہایت کثیر الاشاعت میگزین ہے۔ وہ 95 ملکوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس میگزین نے اپنی اشاعت 26 جنوری 1987 میں امریکا کے بارے میں ایک دل چسپ رپورٹ شائع کی ہے۔ یہاں ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

پچھلے 25 سال کے اندر امریکا میں خاتون کارکنوں کی تعداد بہت بڑھی ہے۔ امریکا میں اس وقت بچہ پیدا کرنے کی عمر کی خواتین کی 65 فی صد تعداد دفتروں میں کام کرتی ہے۔ ان میں سے 90 فی صد عورتیں وہ ہیں جو کارکردگی کے دوران حاملہ پائی گئی ہیں۔ عورتوں کے لیے یہ زبردست مسئلہ ہے۔ کام کا بھاری بوجھ اٹھانا اور اسی کے ساتھ بیک وقت بچوں کی ماں بننا:

"This has created a tremendous problem for women: the onerous task of holding down a job and having children at the same time."

اسی قسم کی ایک امریکی خاتون لیلین گارلینڈ (Lillian Garland) ہے۔ وہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی میں بطور رسپشنسٹ کام کررہی تھی۔ ملازمت کے دوران وہ حاملہ ہوگئی۔ چنانچہ اس نے 1982 میں عارضی طور پر دفتر سے چھٹی لے لی۔ اس کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ تین مہینہ تک دفتر نہ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر تین مہینے کے بعد جب وہ دوبارہ دفتر آئی تو اس کو بتایا گیا کہ اب کمپنی میں اس کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس کی جگہ دوسرے کارکن کے ذریعہ پُر کرلی گئی تھی۔

گارلینڈ نے 850 ڈالر ماہانہ کی سروس کھودی۔ وہ ایسے وقت میں بے روزگار ہوگئی جب کہ بچی کی پیدائش کے نتیجے میں اس کے اخراجات کافی بڑھ چکے تھے۔ اس نے امریکا کی فیڈرل کورٹ میں اپیل کی کہ کمپنی نے اس کو ملازمت سے برخواست کرکے اس کے ساتھ امتیاز (discrimination) کا برتاؤ کیا ہے۔ مقدمہ چلتا رہا۔ گارلینڈ کے وکیل اور کمپنی کے وکیل نے ایک دوسرے کے خلاف دلائل پیش کیے۔ یہاں تک کہ پانچ سال بعد جنوری 1987 میں امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس تھر گڈ مارشل (Thurgood Marshall) نے فیصلہ دیا کہ خاتون کارکن اگر حاملہ ہوجائے تو جس ادارہ میں وہ کام کررہی ہے اس کو چاہیے کہ وہ اس کو چار مہینہ کی باضابطہ رخصت دے۔

اس فیصلہ نے امریکا میں زبردست بحث چھیڑ دی ہے۔ ایک طرف آزادیِ نسواں کی حامی دوسری طرف امریکا کے سنجیدہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ فیصلہ خواتین کے لیے مضر ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اس قسم کا تحفظ صرف خواتین کے حق میں امتیاز کو بڑھانے والا ثابت ہوتا ہے۔ یہ تدبیر ایسی ہے جو ہمیشہ الٹا نتیجہ ظاہر کرتی ہے:

"That almost always backfires."

لاس اینجلس کی مرچنٹس اینڈ مینوفیکچررس ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر ڈون بٹلر (Don Butler) نے کہا کہ یہ فیصلہ ایک مہلک فیصلہ ہے۔ اگر کمپنیوں کو اس طرح حاملہ خواتین کو چار مہینہ کی باضابطہ رخصت دینی پڑی تو وہ دیوالیہ پن (Bankruptcy) کا شکار ہوجائیں گی۔ امریکی چیمبر آف کامرس کے اٹارنی لیمپ (Attorney Lamp) نے کہا کہ اس طرح عورت کے خلاف امتیاز اور بڑھ جائے گا۔ اس لیے کہ بہت سی کمپنیاں یہ نہ چاہیں گی کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی عمر میں عورتوں کو اپنے یہاں ملازم رکھیں:

"Discrimination against women might increase. Many companies just won't hire women in their childbearing years," says the Chamber's Attorney Lamp. (p.21).

گارلینڈ کے مذکورہ معاملہ کی حمایت میں ایک مشہور خاتون لیڈر بیٹی فریڈان (Betty Friedan) نے کہا کہ عورت اور مرد کے درمیان برابری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں مردوں کے نمونہ پر پوری اُتریں:

"Equality does not mean that women have to fit the male model."

یہ دلیل بھی کیسی عجیب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب عورتیں اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے اتنی مختلف ہیں کہ وہ مردوں کے "ماڈل" کے مطابق نہیں بن سکتیں تو اس عجیب وغریب صنفی برابری کی کیا ضرورت ہے کہ عورتون کو مردوں کی طرح ہر جگہ کام کے لیے کھڑا کردیا جائے۔ اور پھر جبری قوانین کے ذریعہ اس مصنوعی برابری کو قائم رکھا جائے۔

اسی طرح سلویا این ہیولٹ (Sylvia Ann Hewlett) نے کہا کہ امریکا کی عدالت عالیہ کے اس فیصلہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ ترین قانونی سطح پر اس حقیقت کا اعتراف

کرلیا گیا کہ عورتوں کو دفاتر میں برابری کا مقام دلانے کے لیے ایک خاندانی سپورٹر کو وجود میں لانا ہوگا:

"This decision means that there is recognition at the highest legal levels that, in order to get equal status for women in the workplace, you have to create family supporters." (p.21).

یہ قدیم روایتی نظام کی معقولیت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔ جدید تہذیب نے یہ معیار پیش کیا تھا کہ مرد کو عورت کا سپورٹر نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ عورت خود کمائے اور خود اپنی سپورٹر بنے۔ مگر جب اس اصول کو عمل میں لایا گیا تو معلوم ہوا کہ عورت سپورٹر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے اس سپورٹر کا نام "شوہر" تھا اور اب اس سپورٹر کا نام "کمپنی" ہے۔

قدیم روایتی ماحول جو مذہب کے زیر اثر بنا تھا۔ اس میں مرد بنیادی طور پر باہر کا کام کرتے تھے اور عورتیں بنیادی طور پر گھر کا کام۔ یہ دراصل ایک طرح کی تقسیم کار تھی۔ مگر جدید تہذیب نے اس کے متعلق کہا کہ یہ ایک صنف اور دوسری صنف کے درمیان امتیاز ہے۔ چنانچہ زور وشور کے ساتھ آزادیِ نسواں کی تحریک چلی۔ عورتوں کو گھروں سے نکال کر دفتروں اور کارخانوں میں ڈال دیا گیا۔

مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ اس نئے انتظام میں مختلف قسم کی رکاوٹیں حائل ہیں۔ مثال کے طور پر عورت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ حاملہ ہوتی ہے۔ وہ بچہ پیدا کرتی ہے اور پھر ایک مدت تک وہ باہر کے کام کے قابل نہیں رہتی۔ اس مشکل کے حل کے لیے قانون بنایا گیا کہ عورت کو حمل اور رضاعت کے دوران خصوصی چھٹی دی جائے۔ مگر اس قسم کا لفظی کھیل صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جو قانون ساز مجالس میں بیٹھ کر قانون بناتے ہیں۔ اس اصول کا تحمل وہ لوگ نہیں کرسکتے جن کو عملاً ایک کارخانہ چلانا ہے۔ یا ایک دفتر کا انتظام کرنا ہے۔ چنانچہ

اب مالکوں اور خاتون ملازموں کے درمیان لامتناہی جھگڑے چھڑ گئے ہیں۔

حکومتی ادارہ اب تک اس نزاع میں بظاہر خواتین کا ساتھ دے رہا ہے تا کہ اس کے تہذیبی اصول کی عظمت باقی رہے۔ مگر حقیقت کے خلاف یہ جانب داری قابل عمل نہیں۔ حکومت اگر دفتروں اور کارخانوں سے کہے کہ وہ خاتون کارکنوں کو "چار ماہ" کی باتنخواہ چھٹی دیں تو کون ادارہ اس تہذیبی تعیش کو برداشت کرسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اداروں میں یہ رجحان بڑھے گا کہ جوان عورتوں کو ملازمت میں نہ لیا جائے اور جب عورتیں بوڑھی ہو چکی ہوں گی تو وہ اپنے آپ ملازمتوں میں جانے سے رک جائیں گی۔ اس طرح مغربی سوسائٹی میں وہی چیز شدید تر صورت میں پیدا ہو جائے گی جس کو ختم کرنے کے لیے آزادیِ نسواں کی تحریک چلائی گئی تھی، یعنی صنفی امتیاز۔

مایوسی کا شکار

12-16 جنوری 1987 کو نئی دہلی (وگیان بھون) میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں پندرہ ملکوں کے فلسفی، سائنٹسٹ، مصنف اور آرٹسٹ شریک ہوئے۔ اس پانچ روزہ کانفرنس کا عنوان تھا: نئے آغاز کی طرف:

Towards New Beginning

اس کانفرنس کا اہتمام مرکزی حکومت ہند نے کیا تھا۔ اس عالمی کانفرنس میں مغربی دنیا کی کئی ممتاز خواتین بھی شریک ہوئیں جو اب بڑھاپے کی عمر میں ہیں اور انھوں نے اپنی پوری زندگی آزادیِ نسواں کی تحریک چلانے میں گزاری ہے۔ مگر اب وہ مایوسی کا شکار ہیں۔ آسٹریلیا کی جرمین گریر (پیدائش 1939) جو بین اقوامی شہرت کی مالک ہیں، ان کے بارے میں انڈین اکسپریس (14 جنوری 1987) کے نامہ نگار کے الفاظ یہ ہیں کہ آج کل وہ بہت دھیمی نظر آتی ہیں ان کا وہ جوش جو فیمیل یونک (*The Female Eunuch*, 1970) نامی

کتاب لکھنے کے وقت ان کے اندر تھا وہ حیرت انگیز طور پر غائب نظر آتا ہے۔ جرمین گریر نے مغرب کی آزادیٔ نسواں کی تحریک پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے کچھ مسائل حل کیے ہیں اور ہم کو کچھ نئے قسم کے مسائل میں مبتلا کر دیا ہے۔

Whither Women's Lib?

They are feminists of different hues—Ms. Germaine Greer, the outspoken, aggressive writer from Australia, and Ms. Gisele Halimi, a Tunisian-born lawyer who spearheaded the women's movement in France along with Simone de Beauvoir and others. But both voice a concern that is troubling feminists in the West today—Whither women's lib? Ms. Greer seems more mellow today: the fire that raged in The Female Eunuch is strangely missing. "The movement has solved some problems and left us with a different set of problems," exclaimed Ms. Greer. "Perhaps the problem was that we didn't take our mothers with us. We left them behind, found them antiquated. And now that many of us are mothers ourselves with teenaged daughters, perhaps we understand our mothers better." (*Indian Express*, January 14, 1987)

"The West has no answers to the problems of inequality between sexes," says the internationally acclaimed writer Germaine Greer. The erroneous belief of western women that the females in veils are unequal and the ones with make-up minus the head-cover are free and liberated has to be rejected. Referring to the prevalence of "wifebeating" even in the so-called civilized West, she asks, how about the unequal treatment meted out to females in the U.S. and England in the areas of wages

and jobs? Well, one-fourth of the crimes in England emanate from violence against women. The man-woman relationship understood in the West as an extension of role-models is the primary cause of strain in the sexual relationships. All the western women identify themselves with the bahu—the bride—forgetting that the mother-in-law and the sister-in-law are also the specific role models to be played by females. She feels that childbearing for a woman is a unique investment: "The joys of motherhood fill the blanks that cannot be satiated in the specific husband-wife role models." Known for her non-conformist and non-traditional views, Ms. Greer advocates "coitus interruptus" in the area of birth-control: "The array of occlusive devices, spermicidal creams, quinine pessaries, douches, syringes, abortifacient pills and rubber goods of all shapes and sizes are the ill-effects of a growing consumer-culture. These have achieved nothing but added strain in the sexual relationships."

(*The Hindustan Times,* January 12, 1987)

Ms. Halimi is more frank. "It is a bad time for the women's movement" she admitted. "It is down at the moment and we are trying to find the reasons for it. Perhaps we got everything women wanted too fast—contraception, abortion, and divorce. And the problems that face women today are not strong enough to give the movement new force and strength." Women have very specific values and morals. "They have a different view of humanity. I am not saying that it is better than that of men, but it is different. And women have to prove that they are women, and not men," she emphasized. (*Indian Express,* January 14, 1987)

جرمین گریر اپنی جوانی کی عمر میں اتنی آزاد خیال تھیں کہ وہ نکاح کے طریقہ کو ختم کرنے کی وکیل بنی ہوئی تھیں۔ مگر اب وہ بدل چکی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاید مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ماؤں کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ ہم نے انھیں پیچھے چھوڑ دیا اور ان کو قدامت پرست سمجھ لیا۔ اب جب کہ ہم میں سے اکثر ماں بن چکی ہیں۔ اور ہمارے ساتھ لڑکیاں ہیں تو اب ہم مسائل کو کسی قدر مختلف انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید اب ہم اپنی ماؤں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ مغرب کے پاس مرد اور عورت کے درمیان نابرابری کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔ مغربی عورت کا یہ خیال غلط ہے کہ پردہ دار عورتوں کو برابری حاصل نہیں ہے اور وہ عورتیں جو بناؤ سنگار کے ساتھ اور کھلے سر ہوتی ہیں وہ آزاد ہیں۔ اس فکر کو اب رد کر دیا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ نام نہاد مہذب مغرب میں بھی عورتوں کے مارنے کے واقعات موجود ہیں۔ مزید یہ کہ امریکا اور انگلینڈ جیسے ملکوں میں بھی تنخواہ اور ملازمت کے معاملے میں عورتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ انگلینڈ میں جرائم کی چوتھائی تعداد عورتوں کے خلاف تشدد سے متعلق ہے۔ امریکا کی 15 فی صد عورتوں کو ان کے شوہر یا بوائے فرینڈ مارتے پیٹتے ہیں۔ (ٹیلی گراف 11 اکتوبر 1987)

فرانس کی مز ہلیمی اس معاملہ میں اور بھی زیادہ کھل کر بولتی ہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ خواتین نے جو کچھ چاہا تھا وہ سب انھوں نے پالیا۔ مگر ان کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ انھوں نے کہا کہ عورتیں بہت مخصوص قسم کی اخلاقی اقدار رکھتی ہیں۔ انسانیت کے بارے میں وہ ایک مختلف نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کا نقطۂ نظر بہتر ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عورتوں کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے کو عورت ثابت کریں، نہ کہ غیر حقیقی طور پر مرد بننے کی کوشش کریں۔ (انڈین ایکسپریس، 14 جنوری 1987)

مذہب کی تعلیمات کے مطابق عورت کا ”رول ماڈل“ یہ تھا کہ وہ گھر کو سنبھالے اور بچوں کی تربیت کرے۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں کا رول ماڈل یہ بنایا گیا کہ وہ باہر کی زندگی میں نکلیں اور ہر شعبہ میں بالکل مردوں کی طرح کام کریں۔ یہ دوسرا رول ماڈل تجربے کے بعد قابل عمل ثابت نہ ہوسکا۔ اپنے بڑھاپے کی عمر میں وہی مغربی خواتین پرانے رول ماڈل کی حمایت کررہی ہیں جنھوں نے اپنی جوانی کی عمر میں نئے رول ماڈل کی پرجوش وکالت کی تھی۔

کیا اس کے بعد بھی مذہب کے بتائے ہوئے رول ماڈل کی معقولیت پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔

دردناک انجام

پلین ٹروتھ (*The Plain Truth*) ایک مشہور امریکی میگزین ہے۔ وہ 7850000 کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ اس ماہنامہ کی اشاعت ستمبر 1986 میں صفحہ اوّل پر ایک امریکی لڑکی کی تصویر ہے جو حیرانی کے عالم میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کا نام سالی (Sally) ہے۔ میگزین میں اس لڑکی کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا خط ہے مگر وہ جتنا چھوٹا ہے اتنا ہی زیادہ وہ دردناک ہے۔ وہ مختصر خط یہ ہے۔

When I was 8 years old I first had sex with a boy of 15. I did it because I lack love and attention from my parents. I need love, and my parents never show me any. Nothing really changed at home, and at 15 I became pregnant. My boyfriend blamed me and left. I had nowhere to turn, I was trapped, so I had an abortion. Now I'm afraid to date anyone, and I cry myself to sleep every night. (p. 5)

ترجمہ: جب میری عمر آٹھ سال تھی اس وقت میں نے پہلی بار ایک پندرہ سالہ لڑکے کے ساتھ جنسی فعل کیا۔ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میں اپنے والدین کی طرف سے

محبت اور توجہ پانے سے محروم تھی، مجھے محبت کی ضرورت تھی، مگر مجھے کبھی اپنے والد ین کی محبت نہ مل سکی (میرے اس حال کے باوجود) گھر کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور میں پندرہ سال کی عمر میں حاملہ ہوگئی۔ میرے دوست لڑکے نے مجھ کو ملزم ٹھہرایا اور مجھ کو چھوڑ دیا۔ کوئی صورت میرے لیے باقی نہ رہی۔ میں پھنس کر رہ گئی۔ چنانچہ میں نے حمل ساقط کرالیا۔ اب میں کسی لڑکے سے تعلق قائم کرنے سے ڈرتی ہوں۔ ہر رات کو میں روتی رہتی ہوں یہاں تک کہ سو جاتی ہوں۔ (امریکا میں ہر دو منٹ میں ایک کم عمر لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے۔)

پلین ٹروتھ کے مذکورہ شمارہ میں نیویارک کے اخبار نویس جارج ڈون کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ امریکا میں 15 سے 19 سال کے درمیان کی ہر ایک ہزار لڑکیوں میں 96 لڑکیاں حاملہ پائی گئی ہیں۔ (صفحہ 6)

یہ انجام ہے فطرت سے انحراف کرنے کا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد اور عورت کی شکل میں بنایا۔ پھر مرد اور عورت کے تعلق کا ایک نظام مقرر کیا۔ وہ نظام یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک خاص عمر کو پہنچ کر نکاح کرلیں۔ پھر وہ مل کر ایک گھر بنائیں۔ اپنے بچوں کی تربیت اور پرورش کریں۔ اس طرح انسانی نسل چلائی جائے۔ مگر جدید مغرب نے آزادی کے تصور کو اتنا بڑھایا کہ عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو بھی ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کردیا۔ اس نتیجہ میں مغرب کے معاشرہ میں بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئیں جن میں سے ایک وہ ہے جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

عورت اور مرد کے درمیان آزادانہ اختلاط اور بے قید تعلق فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ صنفی معاملہ میں عورت "وحدت" کو پسند کرتی ہے۔ جب کہ مرد کا معاملہ طبعاً کسی قدر مختلف ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آزادانہ صنفی تعلق وفادارانہ صنفی تعلق میں مانع بن جاتا ہے جو مرد

سے زیادہ عورت کے لیے نفسیاتی ہلاکت کے ہم معنی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ قیمت عورت کو بھگتنی پڑتی ہے۔

آسٹریلیا کی مشہور آزادی پسند خاتون مِز جرمین گریئر (Ms Germaine Greer) نے بڑی عمر کو پہنچ کر یہ اعتراف کیا ہے کہ نوجوانی کی عمر میں آزادیِ نسواں کے لیے ان کا جوش وخروش حقیقت پسندانہ نہ تھا۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا:

"What is worrying today is the results of the sexual liberation movement—the number of teenaged girls who have been on the pill since they were 12 and 13, the number of teenaged girls who get pregnant by the time they are 15 and 16. What is happening to them? Sex means something quite different for men. They can love and leave. When the time comes to go to university, they can take off quite easily. Women have a different sensibility. They love with their heads, hearts and loins. And a broken love affair leaves them quite shattered. I have seen it happen to people close to me. And it is terrible."

(*Indian Express*, 14 January, 1987)

آج جو چیز پریشان کن ہے وہ آزاد صنفی تحریک کے نتائج ہیں۔ کم عمر لڑکیاں جو 12 اور 13 سال کی عمر سے مانع حمل گولیاں استعمال کرنے لگتی ہیں اور وہ لڑکیاں جو 15 اور 16 سال کی عمر میں حاملہ ہوجاتی ہیں، ان کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ صنفی تعلق مرد کے لیے کافی مختلف معنی رکھتا ہے۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ محبت کریں اور چھوڑ دیں۔ جب یونیورسٹی جانے کا وقت آتا ہے تو وہ نہایت آسانی سے روانہ ہوسکتے ہیں۔ عورتیں مرد سے مختلف حساسیت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے دماغ، اپنے دل اور اپنے وجود کے ساتھ محبت کرتی ہیں۔ ایک

ٹوٹا ہوا محبت کا رشتہ انھیں بالکل توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں یہ بات اپنے قریب کے لوگوں میں ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔ اور یہ دہشت ناک ہے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی سوسائٹی میں بھی بگاڑ پایا جاتا ہے اور مغرب کی سوسائٹی میں بھی۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے۔ مسلمانوں کا بگاڑ اسلامی اصولوں پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ خود ان کے اصولوں پر عمل کی پیداوار ہے۔

مصنوعی مسائل

کیلی فورنیا کے ایک کروڑ پتی رابرٹ گراہم (Dr. Robert Graham) نے ایک انوکھا بینک قائم کیا۔ اس کا نام انھوں نے نوبیل اسپرم بینک (Nobel Sperm Bank) رکھا۔ اس "بینک" میں نوبیل انعام یافتہ افراد کے مادۂ منویہ کو حاصل کر کے محفوظ کیا جاتا ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے عورتوں کو بارآور کیا جائے اور زیادہ اعلیٰ ذہانت (above-average intelligence) والے بچے پیدا کیے جائیں۔ بانی کا کہنا تھا کہ یہ بینک اس نے اہل شوہروں (infertile husbands) کے لیے قائم کیا ہے۔ تاہم جدید خواتین کی اباحیت پسندی اس پابندی کو ختم کر رہی ہے۔ بہت سی خواتین نکاح کے بغیر بچہ پیدا کرنا چاہتی ہیں، نیز وہ چاہتی ہیں کہ ان کی اولاد اعلیٰ استعداد کی مالک ہو، ایسی خواتین آزادانہ طور پر اس بینک کی خدمات حاصل کر رہی ہیں۔

انھیں خواتین میں سے ایک کیلی فورنیا کی ڈاکٹر آفٹن بلیک (Afton Blake) ہے۔ اس کی عمر اس وقت 44 سال ہے۔ اس نے مذکورہ نوبیل اسپرم بینک سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اپنے لیے جس قسم کی اولاد چاہتی تھی، اس کے مطابق اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ "نمبر 28" کا مادہ حاصل کرے۔ واضح ہو کہ اس بینک میں جن لوگوں کے مادۂ منویہ جمع

کیے گئے ہیں ان کو ان کے نام سے پکارا نہیں جاتا۔ بلکہ ان میں ہر ایک کو ایک نمبر دیا گیا ہے اور اسی خاص نمبر سے اس کو یاد کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بلیک "نمبر 28" کے مادہ کے اپنے رحم میں داخل کر کے حاملہ ہوئی۔ مقرر وقت پر اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام اس نے ڈورون (Doron) رکھا۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی تحفہ یا عطیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ اب چار سال سے زیادہ کا ہو چکا ہے اور وہ اب اسکول جانے لگا ہے۔ اس کی تصویر ہندستان ٹائمس 7 ستمبر 1986 (میگزین صفحہ 4) پر شائع ہوئی ہے۔

ڈیلی ٹیلی گراف کا نمائندہ آئن بروڈی (Ian Brodie) مذکورہ خاتون سے اس کے لاس اینجلس (کیلی فورنیا) کے مکان پر ملا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر بلیک کی خوشیاں دھیرے دھیرے غم میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ باپ کے بغیر بچہ کی ولادت اس کے لیے طرح طرح کے مسئلے پیدا کر رہی ہے۔ ان مسائل کی طویل فہرست میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود اب بولنے لگا ہے۔ وہ بار بار پوچھتا ہے کہ میرے باپ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر بلیک نے بتایا کہ ایک بار ایسا ہوا جب کہ ڈورون مجھ سے غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے تا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے:

"There was one occasion when Doron got angry with me. He said he was going off to live with his Dad."

خاتون کے لیے شوہر کے بغیر اولاد حاصل کرنا پہلے ایک دلچسپ تجربہ معلوم ہوتا تھا، مگر اب وہ نازک مسائل کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود ڈورون اپنے لیے ایک باپ سے محروم ہے:

"One thing Doron is deprived of is a Daddy."

فطرت کے نظام سے انحراف کے بعد آدمی کے لیے ایسے عجیب وغریب مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کا اس نے پہلے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ٹائم (نیو یارک) انگریزی زبان کا مشہور ہفتہ وار میگزین ہے۔ وہ دنیا کے تقریباً 95 ملکوں میں پڑھا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کی اشاعت 6 ملین ہے۔ (ٹائم 2 فروری 1987)

اس میگزین کی ہر اشاعت میں ایک تحقیقی مضمون ہوتا ہے جس کو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ٹیم خصوصی ریسرچ کے ذریعہ تیار کرتی ہے۔ اس مضمون کو سرورق کا مضمون (cover story) کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک مضمون اس کے شمارہ 16 فروری 1987 میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے عظیم پژمردگی (The Big Chill)۔ اس مضمون میں مختلف پہلوؤں سے اس نئی بیماری کی تحقیق کی گئی ہے جس کو ایڈز (AIDS) کہا جاتا ہے۔

ایڈز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک متعدی مرض ہے۔ چنانچہ یہ مرض اب نئے قسم کے اچھوت پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ جو مرد یا عورت ایک بار ایڈز میں مبتلا ہو جائیں، لوگ ان سے دور بھاگنے لگتے ہیں، کیوں کہ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ انھیں بھی یہ مرض لگ جائے گا۔ بعض مغربی ملکوں میں باربر شاپ پر اس قسم کے نشانات نظر آنے لگے ہیں جن کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ شیو کے لیے یہاں نہ آئیں:

"No Shaves Here."

حکومتی ذمہ داروں نے اس کو ایڈز ہسٹریا کہا ہے۔ تاہم باربر حضرات کا کہنا ہے کہ مریض کے چہرہ کا پسینہ یا شیو کرتے ہوئے معمولی سا خون نکل آنا بھی بیماری کے پھیلنے کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے احتیاطی طور پر ایسے مریضوں سے بچنا ضروری ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا 19 فروری 1987) ٹائم کے محققین کی جماعت نے تفصیلات پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ اس مہلک مرض کا سب سے بڑا سبب

آزادانہ جنسی تعلق (promiscuity) ہے۔ اسی بنا پر اس مرض کو رندی کا مرض (gay disease) کہا جاتا ہے۔ یہ مرض بہت تیزی سے پھیلتا ہے۔ چنانچہ اس نے جدید دنیا میں جیومیٹرک انتشار (geometric explosion) کی صورت اختیار کرلی ایڈز کی ہلاکت خیزی کو دیکھ کر ایک مبتلائے مرض نے کہا:

"Oh, what will happen in this world, if we have to die when we make love? AIDS is the century's evil." (p.32)

آہ، اس دنیا کا کیا ہوگا اگر ہمارا حال یہ ہوجائے کہ ہم کو محبت کرنے کے لیے مرجانا پڑے۔ ایڈز اس صدی کی آفت ہے۔

آزادانہ جنسی تعلق، جس کو مغرب میں خوبصورت طور پر آزادانہ محبت کہا جاتا ہے، وہ اب لوگوں کے لیے عذاب بنتا جارہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ 1991 تک امریکا میں 270,000 افراد اس مرض میں مبتلا ہوچکے ہوں گے۔ جن کا علاج کرنا امریکی ڈاکٹروں کے قابو سے باہر ہوجائے گا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے جو مخالف ایڈز مہم (Anti-AIDS campaign) چلائی جارہی ہے، اس کا خاص نعرہ ہے۔ احتیاط کے ساتھ محبت کیجیے:

"Love Carefully."

"احتیاط کے ساتھ محبت کیجیے" کی نصیحت کو اگر ہم لفظ بدل کر کہیں تو وہ یہ ہوگی کہ نکاح کے ساتھ محبت کیجیے، بے نکاح محبت کا طریقہ چھوڑ دیجیے۔

ڈی ایچ لارنس (D.H. Lawrence) کا ناول "لیڈی شیٹرلی کا محبوب" (Lady Chatterly's Lover) پہلی بار 1928 میں چھپا۔ اس میں آزادانہ جنسی تعلق کی وکالت کی گئی تھی۔ اس وقت اس ناول کو فحش سمجھا گیا اور جلد ہی اس کو بند (ban) کردیا گیا۔ اس کے بعد حالات بدلے اور 1959 میں دوبارہ اس ناول کو چھاپنے اور فروخت

کرنے کی قانونی اجازت دے دی گئی۔ اس ناول نے امریکی نوجوانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کے اندر آزادانہ جنسی تعلقات عام ہو گئے۔ مگر اب دوبارہ آواز اٹھ رہی ہے کہ اس ناول پر پابندی لگائی جائے۔

یہ ایڈز کا کرشمہ ہے۔ آزادانہ جنسی تعلقات نے ایڈز کی پُراسرار مگر حد درجہ مہلک بیماری پیدا کی ہے۔ اور اب مغرب کے لوگ مجبور ہو رہے ہیں کہ آزادانہ جنسی تعلق کے بارے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کریں۔ (صفحہ 24)

ٹائم کے الفاظ میں، ہر جنسی ترغیب پر دوڑنے والے لوگ، جلد یا بدیر، جنسی احتیاط اور پابندی کے ایک نئے دور کی حقیقت سے دوچار ہوں گے:

"Swingers of all persuasions may sooner or later be faced with the reality of a new era of sexual caution and restraint." (p. 24).

مذکورہ تبصرے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ فطرت کے حقائق انسان کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ آزادانہ جنسی تعلق کے طریقہ کو چھوڑ دے اور پابند جنسی تعلق کے طریقہ کو اختیار کرے۔

شریعتِ خداوندی میں عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلق کو نکاح کی قید کے ساتھ وابستہ کیا گیا تھا۔ مگر موجودہ زمانے کے آزادی پسند لوگوں نے کہا کہ یہ انسان کے اوپر غیر ضروری قسم کی پابندی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار لٹریچر شائع کیا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ممالک میں آزادانہ جنسی تعلق ایک عمومی رواج کی صورت اختیار کر گیا۔

لوگ خوش تھے کہ انھوں نے شریعت اور مذہب کی پابندی سے آزاد ہو کر لامحدود عیش کا راز دریافت کر لیا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے ربع آخر میں پہنچ کر آزادانہ جنسی تعلق نے نئے نئے امراض پیدا کر دیے۔ اور بالآخر "ایڈز" کی مہلک بیماری نے لوگوں کو یہ ماننے پر

مجبور کر دیا کہ شریعتِ خداوندی کا طریقہ ہی فطری طریقہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں آزادانہ جنسی تعلق انسانی صحت کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ٹائم میگزین کے مذکورہ شمارہ (صفحہ 24) میں ایک مرد اور ایک عورت کو اس حال میں دکھایا گیا ہے کہ ان کو ایک خوفناک سانپ نے چاروں طرف سے لپیٹ لیا ہے۔

قرآن میں ہدایت کی گئی تھی کہ عورتوں کے ساتھ جنسی تعلق قید نکاح میں لا کر کرو، نہ کہ بدکاری کے طور پر کرنے لگو: مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (5:5)۔ مفسرین نے قرآن کی اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے کہ عورتوں کے ساتھ نکاح کے ذریعہ تعلق قائم کرو نہ کہ زانی بن کر (مُتَزَوِّجِينَ غَيْرَ زَانِينَ)۔ تجربات نے بتایا کہ یہی طریقہ صحیح فطری طریقہ ہے۔ مناکحت اور مسافحت (بدکاری) میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک اگر زندگی ہے تو دوسرا موت ایک طریقہ انسانی سماج کے لیے رحمت ہے تو دوسرا طریقہ انسانی سماج کے لیے عذاب۔

ٹائمس آف انڈیا (19 مارچ 1987) نے ایڈز روک (AIDS Check) کے عنوان کے تحت ایک امریکی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکا کی حکومت نے اپنے شہریوں کو بعض تدبیریں اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے جس کے ذریعہ وہ ایڈز کی مہلک بیماری سے بچ سکتے ہیں۔ ان تدبیروں میں سب سے زیادہ خاص تدبیر جنسی پرہیز ہے:

"The US government has released its new education plan which stresses on sexual abstinence as a preventive measure."

یہ واقعہ انسانی قانون پر خدائی شریعت کی برتری کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ خدائی شریعت کو ماننے والا ایک شخص اگر خدانخواستہ مسافحت کا طریقہ اختیار کرے اور اس کو ایڈز کی بیماری لگ جائے تو اس کو اصولِ شریعت سے انحراف کا نتیجہ کہا جائے گا۔ اس کے برعکس، مغربی تہذیب کا ایک انسان مسافحت کرکے ایڈز میں مبتلا ہو تو وہ عین اس کے

اصول کے غلطی کا نتیجہ ہے۔ پہلے واقعہ کی صورت میں ایک انسان کی غلطی ثابت ہوتی ہے جب کہ دوسرے واقعہ کی صورت میں خود تہذیب جدید کے اصول کی غلطی۔

غیر فطری مساوات کا نتیجہ

" کوئی شخص جو مجھ کو جانتا ہو وہ یقین نہیں کرسکتا کہ میں نے کیا کیا ہے "ایک 35 سالہ امریکی نے کہا۔ جو کہ بظاہر ایک سنجیدہ اور معصوم چہرہ والا آدمی ہے۔ اس نے اپنی عورت کو مارنے کی کہانی بیان کی جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس نے گلا گھونٹ کر اس کو بے ہوش کر دیا۔ اس نے اس کو کیچڑ میں دھکیل دیا۔ اس نے چھری سے اس کا گلا کاٹ دینا چاہا، وغیرہ۔

"میں نے کیسے ایسا کیا"۔ اس نے تعجب کے ساتھ کہا۔ "لوگ مجھ کو ایک اچھے آدمی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ میرا اپنا ایک بزنس ہے، میں شراب نہیں پیتا، میں سگریٹ نہیں پیتا۔ میں دوسری عورتوں کا پیچھا نہیں کرتا۔" اس کے باوجود ایسا ہوا کہ اس شخص نے بار بار اپنی بیوی کو مارا۔

امریکی ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ (مارچ 1987) میں اس طرح کے بہت سے امریکیوں کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ ڈائجسٹ کے اس مضمون کا عنوان ہے۔ لوگ کیوں ان عورتوں کو مارتے ہیں جن سے وہ محبت کرتے ہیں:

"Why Men Hurt the Women They Love."

پانچ صفحہ کے اس مضمون میں عورتوں کو مارنے (Wife-beating) کی بہت سی مثالیں نقل کرتے ہوئے حسب ذیل رپورٹ دی گئی ہے:

According to one survey, in America a woman is battered by a husband or boy- friend every 18 seconds. And every year, it is estimated that more than a million of these

need medical help. Every day, four die. (p. 135)

ایک جائزے کے مطابق امریکا میں ہر 18 سکنڈ میں ایک عورت ماری جاتی ہے۔ کبھی اپنے شوہر کے ہاتھوں اور کبھی اپنے دوست لڑکے کے ہاتھوں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک ملین سے زیادہ عورتوں کو ہر سال طبی امداد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر ایک دن میں چار عورتیں مرجاتی ہیں۔

امریکا کے ترقی یافتہ اور مہذب معاشرہ میں عورتوں کو مارنے کی یہ برائی کیوں ہے۔ اس پر موجودہ زمانے میں کافی تحقیق کی گئی ہے۔ مسز سوسن شسٹر (Susan Schechter) نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے عورتیں اور مردانہ تشدد (*Women and Male Violence*) ان کا جواب یہ ہے کہ یہ جابرانہ کنٹرول حاصل کرنے کی ایک صورت ہے۔

"It is a pattern of coercive control." (p.136).

ریڈرس ڈائجسٹ کی مذکورہ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے:

"Any batterer can tell you why he hit her." say Ellen Pence, director of the Domestic Abuse Intervention Programme. "He wanted control over her, he wanted his way." (p.140).

" کوئی بھی مارنے والا مرد آپ کو بتائے گا کہ اس نے عورت کو کیوں مارا۔ "ڈی اے آئی پی کے ڈاکٹر الن پنس نے کہا۔ "اس نے عورت کے اوپر کنٹرول حاصل کرنا چاہا۔ اس نے چاہا کہ اس کی اپنی مرضی چلے۔"

مذکورہ بیان کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ صورت حال براہ راست طور پر جدید مغربی تہذیب کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے عورت کو مرد کے برابر قرار دیا۔ اس نے عورتوں کے لیے علاحدہ روزگار کا انتظام کر کے انھیں یہ موقع دیا کہ وہ مردوں سے آزاد اپنی

مستقل معاشی بنیاد حاصل کر سکیں۔ اس بنا پر عورتوں کے اندر برابری کا احساس شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا۔ تاہم یہ احساس مصنوعی تھا۔ کیوں کہ مذکورہ معاشی بندوبست کے باوجود مغربی تہذیب کے لیے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ فطرت کی اس تقسیم کو بدل دے کہ مرد پیدائشی طور پر صنف قوی اور عورت پیدائشی طور پر صنف ضعیف۔

اس مصنوعی مساوات کے نتیجے میں ان ملکوں کی گھریلو زندگی ایک تضاد کا شکار ہو گئی ان گھروں میں ایسی عورتیں رہنے لگیں جو اپنی جسمانی بناوٹ کے اعتبار سے تو مرد کے مقابلہ میں اسی طرح کمزور تھیں جس طرح ہر دور کی عورتیں کمزور رہی ہیں۔ مگر مزاج کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو مردوں کا ہمسر سمجھ رہی تھیں۔ مرد صنف قوی ہونے کی وجہ سے عورتوں پر اپنا کنٹرول قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر عورتوں نے اپنے مصنوعی مزاج کی بنا پر کنٹرول قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کش مکش کا نتیجہ یک طرفہ طور پر عورتوں کے حق میں برُا ثابت ہوا۔

عورت اور مرد دونوں اگر واقعتاً حیاتیاتی طور پر یکساں ہوتے تو کبھی مرد عورت کو مارتا اور کبھی عورت مرد کو مارتی۔ مگر چونکہ یہاں معاملہ یکسانیت کا نہ تھا، اس لیے وہی صورت پیش آئی جو خربوزے اور چھری کے ٹکراؤ میں پیش آتی ہے۔ مرد ہمیشہ مارنے والا ثابت ہوا۔ اور عورت ہمیشہ مار کھانے والی۔

اس معاملہ میں جدید عورت کی مظلومی اتنی زیادہ بڑھی ہوئی ہے کہ وہ بھاگ کر بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی۔ رپورٹ کے مطابق ایک عورت نے کہا کہ اگر کوئی عورت بھاگنا چاہے تو اس کا شوہر اس کو دھمکی دیتا ہے کہ میں تم کو پکڑوں گا اور تمہیں مار ڈالوں گا۔ اکثر سنگین ضربیں اور موتیں اس وقت پیش آتی ہیں جب کہ عورتیں باہر بھاگ جانا چاہتی ہیں:

> "If you try to leave, your husband may threaten, 'I'll find you and kill you.' Many of the worst injuries—and deaths— happen as women try to get away." (p.137).

فطرت کی تقسیم میں مرد کو عورت کے اوپر قوام بنایا گیا ہے۔ اب اگر اس تقسیم کو مصنوعی طور پر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کا انجام وہی ہوگا جس کی ایک تصویر مذکورہ بالا رپورٹ میں دکھائی دیتی ہے۔ جدید تہذیب سے پہلے کبھی ایسا نہ تھا کہ عورتیں اس طرح اپنے گھروں میں ماری جائیں۔ یہ صرف دورِ جدید کی خصوصیت ہے اور یہ براہ راست طور پر اس مصنوعی نظریہ مساوات کا نتیجہ ہے جو تاریخ میں پہلی بار مغربی تہذیب میں اختیار کیا گیا۔ تاریخ کے پچھلے دور میں بھی عورت کو مارنے کے واقعات ہوتے تھے مگر وہ استثنائی طور پر صرف نچلے طبقات میں پیش آتے تھے۔ لیکن جدید حالات نے ان کو بڑھا کر اعلیٰ طبقات کے دائرہ تک پہنچا دیا۔ اس نے ایسے واقعات کو مہذب انسانوں کا مسئلہ بنا دیا جب کہ اس سے پہلے وہ صرف غیر مہذب انسانوں کے مسئلہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

جدید عورت کی مظلومی

ایک سیاح امریکہ گیا۔ ایک بار وہ وہاں کے ایک کلب میں تھا جہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر رقص کر رہے تھے۔ سیاح کنارے کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ایک امریکی لڑکی آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اداس لہجے میں کہا: "مسٹر سیاح، کیا میرے اندر گلیمر (Glamour) نہیں"۔ " کیوں نہیں، تمہارے اندر تو گلیمر ہے۔" سیاح نے جواب دیا۔ " پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی لڑکا مجھے ڈیٹ نہیں دیتا۔" لڑکی نے کہا۔

ڈیٹ (Date) کے معنی انگریزی زبان میں تاریخ کے ہوتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں یہ لفظ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک رواج کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ ہے ایک صنف کا دوسری صنف کو کسی مقررہ تاریخ کو مدعو کرنا۔ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کا تجربہ کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ڈیٹ دے کر ایک دوسرے کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔ مغربی زندگی میں یہ رواج اتنا زیادہ عام ہو گیا ہے کہ جس لڑکی کو کوئی لڑکا "ڈیٹ" نہ دے وہ اپنے آپ کو کچھ کم سمجھنے لگتی ہے۔ اس کا خیال یہ ہو جاتا

ہے کہ شادی کے بازار میں اس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ ڈیٹنگ کا یہ طریقہ ابتداءً صرف گفتگو اور ملاقات تک محدود تھا۔ اب بڑھتے بڑھتے وہ باقاعدہ جنسی تعلقات تک پہنچ گیا ہے۔ مغربی لڑکوں کے لیے یہ ایک مہذب طریقہ بن گیا ہے کہ وہ ڈیٹ دے کر ایک لڑکی کو تنہا کمرہ میں بلائیں اور پھر وہاں اس کے ساتھ جبری طور پر بدکاری کریں۔

اس سلسلے میں امریکی میگزین ٹائم (23 مارچ 1987) نے ایک سبق آموز رپورٹ شائع کی ہے۔ اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے — جب ڈیٹ زنا کاری میں تبدیل ہوجائے:

When the Date Turns into Rape.

سوسن (Susan) 22 سال کی ایک غیر شادی شدہ خاتون ہے۔ اس کی ملاقات ایک مرد سے ہوئی۔ جب دونوں رخصت ہونے لگے تو مرد نے اس کو ڈیٹ دی۔ اس کے مطابق دونوں ایک کمرے میں جمع ہوئے 45 منٹ تک وہ ٹیلی وزن دیکھتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد مرد اس کے پاس آ گیا اور آگے کے افعال کرنا شروع کر دیے۔ عورت ٹھہرو ٹھہرو کہتی رہی۔ مگر مرد نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ تم محض تکلف میں ایسا کہہ رہی ہو، ورنہ حقیقتاً تم مجھ کو روکنا نہیں چاہتی ہو:

"You really don't want me to stop."

اس کے بعد اس کمرہ میں وہ سب کچھ ہوا جس کو قانونی اصطلاح میں "زنا بالجبر" کہا جاتا ہے۔

اس قسم کی ڈیٹ ریپ موجودہ ترقی یافتہ ملکوں میں عام ہو چکی ہے۔ ڈیٹ کے ذریعہ بدکاری کرنا، بعض محققین کے نزدیک، آج کا بہت بڑا سماجی مسئلہ ہے۔ کالج کے طلبہ کا جائزہ یہی بتاتا ہے جو کہ 6200 مردوں اور عورتوں کے درمیان 32 کیمپس میں تین سال

تک کیا گیا۔ ماہر نفسیات میری کاس نے پایا ہے کہ جن عورتوں کو اس قسم کے تجربات ہوئے، جو کہ قانون کے مطابق زنا بالجبر کی تعریف میں آتے ہیں، ان میں آدھے سے زیادہ تعداد ڈیٹ کے ذریعہ بدکاری کرنے کی تھی۔ ایک لکچرر اینڈری پیرٹ نے اندازہ لگایا ہے کہ دو کیمپس جن کا اس نے جائزہ لیا۔ ان کی 20 فیصد خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا تھا۔ 1985 مین زنا بالجبر کے واقعات کی تعداد 87340 تھی۔ میری کاس نے کہا: ڈیٹ کے موقع پر بدکاری کا خطرہ اس سے زیادہ ہے کہ اچانک جھاڑی سے نکل کر کوئی اجنبی شخص ایسا کرنے لگے۔ آزادیِ نسواں کے بعض علم برداروں کا کہنا ہے کہ امریکا میں ایک بدکاری کلچر پیدا ہو چکا ہے جس میں مردوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ جارحانہ انداز اختیار کریں اور عورتیں ان کے آگے سپر ڈال دیں۔

When the Date Turns into Rape.

Date rape, according to some researchers, is a major social problem so far studied mostly through surveys of college students. In a three-year study of 6,200 male and female students on 32 campuses, Kentucky State psychologist Mary Koss found that 15% of all women reported experiences that met legal definitions of forcible rape. More than half those cases were date rapes. Andrea Parrot, a lecturer at Cornell University, estimates that 20% of college women at two campuses she surveyed had been forced into sex during their college years or before, and most of these incidents were date rapes. The number of forcible rapes reported each year—87,340 in 1985—is believed to be about half the total actually committed. Says Koss: “You’re a lot more likely to be raped by a date than by a stranger jumping out of the bushes.” Some feminists argue that the U.S. has a “rape culture” in which males are encouraged to treat women

aggressively and women are trained to submit.

(*Times of India*, 23 March, 1987, p. 35)

مسٹر سری پرکاش (سابق گورنر مہاراشٹر اور پاکستان میں پہلے ہندستانی ہائی کمشنر) نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ 1947 میں انھوں نے ایک انگریز سے پوچھا کہ تم لوگ ہم ہندستانیوں کو حقیر کیوں سمجھتے ہو۔ انگریز نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا اس میں سے ایک بات یہ تھی: " آپ لوگ شادی کے سلسلہ میں بہت سی پابندیاں ملحوظ رکھتے ہیں۔ یورپ کا نظریہ یہ ہے کہ نوجوان لڑکا اور لڑکی خود ایک دوسرے کو پسند کرکے شادی کرلیں۔ آپ کے یہاں ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ لوگ سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔" (صفحہ 172)

آزادیِ نسواں کی تحریک کے آغاز میں یہ بات بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ مگر غیر شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان سے ہر قسم کی پابندیوں کو اٹھانے کا نتیجہ آخر کار قبل از نکاح صنفی تعلقات اور پھر زنا بالجبر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس تجربہ نے بتایا کہ صنفی تعلقات کے معاملہ میں "پابندی" کا اصول ہی صحت مند اصول ہے۔ اس معاملہ میں "آزادی" کا اصول معاشرہ کو بربادی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتا۔

ایک حدیث

"ڈیٹ" کا مذکورہ مغربی رواج اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ غیر شادی شدہ عورت اور مرد تنہائی میں ایک دوسرے سے ملیں اور جتنی دیر تک چاہیں ایک ساتھ اپنے اوقات گزاریں۔ اس رواج نے مغرب میں جو اندوہناک صورت حال پیدا کی ہے اس کو نظر میں رکھیے اور پھر مندرجہ ذیل حدیث پر غور کیجیے۔ تو معلوم ہوگا کہ شریعت نے اس معاملہ میں جو اصول مقرر کیے ہیں وہ کس قدر بامعنی ہیں:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، فَلَا يَخْلُوَنَّ بِامْرَأَةٍ لَيْسَ مَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ مِنْهَا، فَإِنَّ ثَالِثَهُمَا الشَّيْطَانُ (مسند احمد، حدیث نمبر 14651)۔ یعنی، جو شخص

اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ ہرگز وہ کسی ایسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے جس کے ساتھ کوئی محرم موجود نہ ہو۔ کیوں کہ وہاں ان کا تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

غیر مرد اور عورت اگر تنہائی میں ملیں تو شیطان کو فوراً انھیں ورغلانے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن اگر ملاقات کے وقت کوئی محرم رشتہ دار بھی ساتھ موجود ہو تو شیطان کو ان کی نفسیات میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ پہلی صورت میں ملاقات کسی حد پر نہیں رکتی۔ اور دوسری صورت میں ملاقات حد کے اندر رہتی ہے، وہ اس سے آگے جانے نہیں پاتی۔

پاکبازی کی اہمیت

موجودہ زمانہ میں صنفی اباحیت کا طریقہ بہت بڑے پیمانہ پر اختیار کیا گیا۔ مغربی دنیا میں نکاح سے پہلے جنسی تعلق قائم کرنا عام ہو گیا، حتی کہ اس کو ایک فلسفہ بنا دیا گیا۔ کہا گیا مستقل شریک حیات کے انتخاب کے لیے یہ زیادہ محفوظ اور بہتر طریقہ ہے کہ پیشگی طور پر پوری طرح اس کا تجربہ کر لیا جائے۔ مرد اور عورت نکاح سے پہلے اسی طرح کھلے طور پر ایک دوسرے سے ملنے لگے جس طرح ایک مرد اور ایک عورت نکاح کے بعد آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

مگر یہ طریقہ فطرت سے ٹکراؤ تھا۔ تخلیقی نظام کی خلاف ورزی نے ایسے ایسے مسائل پیدا کیے جن کا حل موجودہ ڈھانچہ میں ناممکن نظر آنے لگا۔ ان نتائج نے لوگوں کے اندر نظر ثانی کا ذہن پیدا کیا۔ حتیٰ کہ اب خود وہی لوگ اس طریقہ کے مخالف ہو رہے ہیں جو اس سے پہلے نہایت پر جوش طور پر اس کی حمایت کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں امریکا کی ایک بڑی سبق آموز رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اے ایف پی (AFP) کے حوالہ سے ٹائمس آف انڈیا (18 مارچ 1987) نے اس

رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

> A survey, carried out in America on more than 1400 college students aged 18-19, reveals that young women are more attracted to male virgins than they were 10 years ago. The New York psychologist, Mr Srully Blotnick, whose company carried out the survey, said: "The male virgin may not make the best lover, but usually he's eager to learn and he's the safest." The safest, that is, from the risk of AIDS and other sexually transmittable diseases. Mr Blotnick said it was the risk of sexually-related diseases that makes the male virgins so attractive to women. His latest survey showed that 22 per cent of college women now want their next lover to be a virgin, compared to just nine per cent 10 years ago.

امریکا میں کالج کے 1400 سے زیادہ طلبا کا جائزہ لیا گیا۔ ان طلبا کی عمریں 18-19 سال کی تھیں۔ یہ جائزہ بتاتا ہے کہ امریکہ کی نوجوان عورتیں ازدواجی تعلق کے لیے پاکباز مردوں کی طرف زیادہ راغب ہیں، جب کہ دس سال پہلے ایسا نہ تھا۔ نیویارک کے ماہر نفسیات مسٹر سرولی بلاٹنک جن کی کمپنی نے یہ جائزہ لیا ہے، انھوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ پاکباز مرد بہت اچھا محبت کرنے والا نہ ہو مگر عام طور پر وہ سیکھنے کا شوق رکھتا ہے اور وہ محفوظ ہے۔ وہ ایڈز اور دوسری متعدی جنسی بیماریوں کا خطرہ اپنے ساتھ لیے ہوئے نہیں ہوتا۔ مسٹر بلاٹنک نے کہا کہ یہ دراصل جنس سے تعلق رکھنے والی بیماریوں کا خطرہ ہے جس نے پاکباز مرد کو عورتوں کی نظر میں اتنا زیادہ جاذب بنا دیا ہے۔ ان کے اس جائزہ نے بتایا ہے کہ کالج کی عورتوں میں اب 22 فی صد وہ ہیں جو پاکباز مرد چاہتی ہیں، جب کہ دس سال پہلے اس قسم کی عورتوں کی تعداد صرف 9 فی صد تھی۔

ہندستان ٹائمس (19 مارچ 1987) نے امریکی نیوز ایجنسی کی اس خبر کو شائع کرتے ہوئے اس پر یہ سرخی قائم کی ہے — پاکباز مرد کی مقبولیت:

"Male Virgins in Vogue."

شادی کے لیے پاکبازی کی شرط طرفین کے لیے صنفی آزادی میں رکاوٹ تھی۔ چنانچہ آزادیِ نسواں کی تحریک کے ابتدائی دور میں اس کا مذاق اڑایا گیا اور اس کو محض ایک مذہبی افسانہ قرار دیا گیا۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ یہ مذہبی افسانہ نہیں بلکہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے۔

اگر آپ اپنے لیے درست اور بے ضرر جوڑا چاہتے ہیں تو آپ کو پاکبازی کی شرط کو قبول کرنا پڑے گا۔ پاکبازی اس سے پہلے صرف ایک مذہبی حکم نظر آتی تھی۔ آج وہ صحت مند ازدواجی تعلق کے لیے ایک لازمی اصول کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ خدائی احکام کے مبنی برحقیقت ہونے کا یہ کیسا عجیب ثبوت ہے جو خود انسانی تجربہ نے موجودہ زمانہ میں فراہم کیا ہے۔ اس کے بعد بھی آدمی اگر خدائی شریعت کی اہمیت کو نہ مانے تو یہ اس کی دھاندلی ہوگی، نہ کہ مبنی برحقیقت رویہ۔

مصنوعی اولاد کا مسئلہ

آزادیِ نسواں کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ عورت اور مرد دونوں ہر اعتبار سے بالکل برابر کا درجہ حاصل کرلیں۔ مگر عملاً ایسا نہ ہوسکا۔ آزادیِ نسواں کی تحریک اپنے اصل مقصد کو پانے میں پوری طرح ناکام ہے۔ ایک امریکی خاتون ٹی گریس اٹکنسن (Ti-Grace Atkinson) نے کہا کہ یہاں تحریک کا کوئی وجود نہیں۔ تحریک کا مطلب کہیں جانا ہے، اور آزادیِ نسواں کی تحریک کہیں بھی نہیں جارہی ہے۔ اس نے اب تک کچھ حاصل نہیں کیا:

"There is no movement. Movement means going some place, and the movement is not going anywhere. It hasn't accomplished anything."

(*Time*, March 20, 1972, p.30).

اس تجربہ کی بنا پر مغربی ملکوں میں کچھ ایسی پرجوش خواتین پیدا ہوگئی ہیں جن کا مطالبہ ہے کہ مردوں پر انحصار کو کامل طور پر ختم کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ ان سے جنسی تعلق بھی نہ رکھا جائے جل جانسٹن کا کہنا ہے کہ آزادیِ نسواں دراصل اس کا نام ہے کہ عورتیں ہم جنسی کا طریقہ اختیار کرلیں۔ یہ اِسی وقت ممکن ہے جب کہ عورتیں اپنی جنسی ضرورت کے لیے مردوں پر انحصار نہ کریں اس طرح وہ مردانہ کنٹرول سے آزاد ہوسکتی ہیں:

Due to this experience, feminist extremists in western countries demand a complete withdrawal from dependence on men, including sexual ties. Village Voice columnist Jill Johnston, for example, insists that "feminism is lesbianism" and that it is only when women do not rely upon men to fulfill their sexual needs that they are finally free of masculine control."

(*Time*, August 10, 1987, p. 25)

دو عورتوں کا شوہر اور بیوی کی طرح رہنا سادہ سی بات نہیں۔ اس میں بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ جوڑے اگر اپنا بچہ چاہتے ہوں تو وہ اپنے لیے ایک بچہ کیسے حاصل کریں۔ اس کا ذریعہ جدید میڈیکل سائنس نے مصنوعی تخم ریزی (artificial insemination) کی صورت میں فراہم کردیا ہے۔

ہالینڈ کی دو عورتیں پولا ڈیجز (39) اور جی نین ہاکسمن (38) میاں بیوی کے طور پر رہتی ہیں۔ ان کو اولاد کی خواہش ہوئی تو انھوں نے لیڈن کے انسٹی ٹیوٹ آف برتھ کنٹرول سے رابطہ قائم کیا۔ پہلی کوشش ناکام رہی۔ دوسری کوشش میں پولا ڈیجز (Paula Deijs) حاملہ

ہوگئی۔ ایک نامعلوم شخص کے مادہ کے ذریعہ ان کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ٹامس رکھا گیا۔ مگر ٹامس کی پیدائش کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ دوبارہ انھیں اسی مرد کی ضرورت ہے جس سے توحش کی بنا پر انھوں نے ہم جنسی کا طریقہ اختیار کیا تھا۔

دونوں عورتیں اس حقیقت کے بارے میں بہت حساس ہیں کہ ان کے لڑکے ٹامس کو مرد درکار ہیں جو اس کے لیے کرداری نمونہ بن سکیں۔ اب دوبارہ وہ اس مقصد کو مصنوعی طور پر حاصل کر رہی ہیں۔ چنانچہ ان خواتین کے چچا، ان کے دادا، ان کے بھائی اور مرد پڑوسیوں سے درخواستیں کی جا رہی ہیں کہ وہ بار بار ان کے گھر آئیں۔ جی نین ہاکسمن (Jeanine Haaksman) نے کہا کہ ہم نے اپنے ایک مرد دوست کو چنا ہے جو ٹامس کے لیے باپ کا کام کرے۔ ہم ٹامس کو اس کے یہاں تمام فنی ہدایات کے لیے بھیجتے رہیں گے:

> The women are sensitive to the fact that Thomas needs men as role models. Uncles, a grandfather, brothers-in-law and male neighbours are encouraged to visit frequently. "We have a good friend not too far from here whom we have chosen to be a father image for Thomas," says Haaksman. "We'll send Thomas over to him for all the technical instructions."

ٹامس کو ایک "باپ" فراہم کرنے کا مذکورہ بالا مصنوعی طریقہ کسی طرح اصل باپ کا بدل نہیں۔ یہ یقینی ہے کہ ان دونوں باپ اور بیٹے کے درمیان ایک قسم کی اجنبیت حائل رہے گی۔ اور ٹامس جب بڑا ہوگا تو یہ موہوم اجنبیت شعوری اجنبیت بن جائے گی۔ ٹامس اپنی ماں کو جانتا ہوگا مگر وہ اپنے باپ سے سراسر ناواقف ہوگا۔ ٹامس کی زندگی کا یہ خلا اس کے اندر طرح طرح کی ذہنی پیچیدگیاں پیدا کرے گا۔ اس کی یہ ذہنی حالت آخر کار اس کو نا ممکن بنا دے گی کہ وہ سماج کا ایک مفید حصہ بن سکے۔

گویا عورت اور عورت کے درمیان ہم جنسی کے نظام (Lesbianism) میں لڑکی پیدا کرنے کی گنجائش تو ہے، مگر لڑکا پیدا کرنے کی نہیں۔ اگرچہ لڑکی پیدا کرنے کے لیے بھی دوبارہ اسی مرد پر انحصار کرنا پڑے گا جس پر انحصار کو ختم کرنے کے لیے یہ نظام اختیار کیا گیا تھا۔

فطرت کے نظام سے انحراف کرنا آسان ہے، مگر اس کے بعد اس انحراف کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کو ادا کرنا کسی انسان یا کسی انسانی سماج کے لیے ممکن نہیں۔

غلطی کا اعتراف

امریکا میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام باعتبار مفہوم یہ ہے کہ بچے اپنے باپوں کو دوبارہ پا رہے ہیں:

Dr. Sam Osherson, *Finding Our Fathers* (1987)

یہ امریکا کی خاندانی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ جدید تہذیب میں زندگی کا اعلیٰ معیار یہ بن گیا تھا کہ عورت اور مرد دفتروں میں کام کریں اور بچوں کو گھریلو خادم (babysitters) یا مرکز اطفال (day-care centers) کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر کئی نسل کی بربادی کے بعد امریکیوں کی سمجھ میں یہ بات آرہی ہے کہ بچوں کی تربیت اور ارتقاء کے لیے والدین کا کوئی بدل نہیں۔ چنانچہ امریکا میں ایسے والدین پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے بیرونی مشاغل میں کمی کرکے اپنے بچوں لیے وقت نکال رہے ہیں۔

کین شومین (Ken Schuman) کو اونچی تنخواہ کا اعلیٰ عہدہ مل رہا تھا۔ مگر اس نے کم تنخواہ کی ملازمت پر قناعت کیا۔ کیوں کہ اعلیٰ عہدہ آدمی کو اتنا زیادہ مصروف بنا دیتا ہے کہ اپنے بچوں کی نگہداشت کے لیے وہ وقت نہیں نکال سکتا۔ اس نے کہا کہ موجودہ ملازمت کے ساتھ میں اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں لنچ نہیں لے سکتا، نہ ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس میں سفر کر سکتا ہوں مگر میں اپنے فیصلہ پر خوش ہوں، کیوں کہ اب میرے پاس کافی وقت ہے جب کہ اپنے بچوں کے تعمیری دور (formative stage) میں ان کی زیادہ مدد

کرسکتا ہوں۔ جان فشر (John G. Fischer) بھی اسی قسم کے نئے باپوں (new breeds of fathers) میں سے ایک ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس طرز زندگی کو از سرِ نو اختیار کیا ہے:

I'm a convert to this way of life.

یہ معلومات امریکی میگزین اسپان (ستمبر 1987) کے ایک مضمون میں دی گئی ہیں۔ 6 صفحات کے اس مضمون کا عنوان یہ ہے:

"Putting Kids First. The New generation of American fathers is balancing the demands of careers and children."

جدید انسان اپنے نظریات کی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر دوبارہ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا ہے۔ اگر چہ جدید معاشرہ پر ابھی تک اس کے سابقہ نظریات کا اتنا زیادہ غلبہ ہے کہ جو لوگ اس تبدیلی کے وکیل ہیں وہ اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے (اسپان، ستمبر 1987، صفحہ 31)

مغربی شادیوں کا انجام

امریکا کے ایک میگزین (*Better Homes and Gardens*) نے اپنے قارئین سے سوال کیا کہ کیا آپ کا خیال ہے کہ امریکا میں خاندانی زندگی مشکلات سے دوچار ہے۔ 76 فیصد کا جواب تھا کہ ہاں:

Do you think that family life in the U.S. is faced with troubles? Seventy-six percent answered in the affirmative.

85 فیصد نے کہا کہ پر مسرت شادی کے بارے میں ان کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ اسی طرح ایک اور امریکی میگزین (*Newsweek*) نے مئی 1978 میں اپنے ایک جائزہ کے نتائج شائع کیے تھے۔ اس کے مطابق امریکا میں تقریباً نصف نکاح طلاق پر ختم ہوتے ہیں طلاق کے بعد دوبارہ نکاح ہوتے ہیں اور پھر دوبارہ طلاق۔

نکاح کے ایک مشیر رونالڈ کیلی (Ronald D.Kelly) نے لکھا ہے کہ:

One of the saddest things to me as a marriage counsellor is the many couples who are married, yet strangers to each other in their own homes. They seem to share little in common. Each goes his or her own way, pausing only for occasional conversations—those often arguments about money, child rearing or sex. You wonder how they ever got together in the rust place.

مشیر نکاح کی حیثیت سے میرے لیے ایک نہایت افسوس ناک بات یہ ہے کہ اکثر عورتیں اور مرد شادی کے بعد بھی اپنے گھروں میں اجنبی کی طرح رہتے ہیں۔ان میں بہت کم اشتراک ہوتا ہے۔ان میں ہر ایک الگ الگ راستے پر چلتا ہے۔ان میں صرف کبھی کبھی گفتگو ہوتی ہے، وہ بھی زیادہ تر پیسہ، بچہ کی پرورش یا جنس کے بارے میں بحث کے طور پر۔ ان کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آخر ابتداء میں وہ دونوں کس طرح اکٹھے ہوئے تھے (پلین ٹروتھ، جون 1987)

شادی خواہ کتنی ہی پسندیدگی کے تحت کی گئی ہو، اس میں بہرحال ناخوش گواریاں پیش آتی ہیں، کبھی زندگی کے مسائل کی بنا پر، اور کبھی جنسی کشش زائل ہونے کی بنا پر۔اب اگر میاں اور بیوی ”شادی برائے مقصد“ کے نظریہ کے تحت یکجا ہوتے ہوں تو پیش نظر مقصد کی خاطر دونوں اس کو نظر انداز کریں گے اور ناخوش گواریوں کو برداشت کرتے ہوئے باہم جڑے رہیں گے۔اس کے برعکس جب ”شادی برائے لذت“ کا تصور ہو تو ہر خلاف مزاج بات کو برداشت کرتے ہوئے تعلق کو برقرار رکھنا ضروری سمجھیں۔

مغربی دنیا کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہاں تہذیب جدید کے اثر سے شادی برائے لذت کا اصول رائج ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہاں خاندانی زندگی منتشر ہو کر رہ گئی ہے، کہیں جنسی کشش کے زوال کی بنا پر اور کہیں گھریلو مسائل کی بناء پر۔

آبادی کا مسئلہ

امریکا میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے — پیدائش کا قحط:

Ben J. Wattenberg, *The Birth Dearth* (1987)

یہ کتاب آج کل مختلف حلقوں میں بحث کا زبردست موضوع بنی ہوئی ہے۔ اس میں مصنف نے اعداد و شمار کی روشنی میں دکھایا ہے کہ امریکا اور دوسرے مغربی ملکوں میں پیدائش کی شرح خطرناک حد تک کم ہوگئی ہے۔ دوسری طرف اشترا کی بلاک کی شرح پیدائش بڑھ رہی ہے۔ اور تیسری دنیا کی شرح کا تو یہ حال ہے کہ اگلے پچاس سال میں اس کی آبادی مغربی دنیا سے دس گنا زیادہ ہوجائے گی۔ اس کے نتیجے میں اکیسویں صدی میں پہنچ کر امریکا عالمی طاقتی حیثیت (world-power status) کھودے گا۔ اسی طرح پوری مغربی دنیا عالمی سیاست میں دوسرے درجہ کی حیثیت حاصل کرے گی۔ اس کا حل ایک ناقد کے الفاظ میں یہ ہے کہ مغربی عورتیں دوبارہ بچہ پیدا کرنے والی قدیم عورت کا انداز اختیار کرلیں:

> "...to slip back into a traditional woman as exclusive child raiser."
>
> (*Time*, 24 March, 1987, p. 48)

جدید تہذیب نے عورت کو جو مقام دیا تھا وہ زندگی کی حقیقتوں سے ٹکرا گیا۔ اب مفکرین مغرب کو نظر آرہا ہے کہ اگر کامیاب زندگی حاصل کرنا ہے تو عورت کے قدیم تصور کو دوبارہ اختیار کرنا ہوگا۔

سرپرستی سے محروم

ہفتہ وار ٹائم (23 مارچ 1987) نے امریکا کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے بچوں کی خودکشی (Teen Suicide) اس رپورٹ میں دکھایا گیا

ہے کہ امریکا میں 10 سال اور 20 سال کے درمیان کی عمر کے نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ 1950 کے مقابلہ میں یہ تعداد اب تین گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ 1985 میں ایک لاکھ آبادی پر ساٹھ نوجوانوں (اور اتنے ہی بڑوں) نے خودکشی کی۔ یہاں ہم تین خواتین کے تاثرات درج کرتے ہیں جو امریکی بچوں کی خودکشی کے سلسلے میں مذکورہ رپورٹ میں نقل کیے گئے ہیں:

Says Barbara Wheeler, a suicideprevention specialist in Omaha. "I don't think they think about being dead. They think it's a way of ending pain and solving a problem."

"Everybody is in such a rusk that we don't take the time to listen to our youngsters," says Elaine Leader, co-founder of a teen crisis hotline at Cedars-Sinai Medical Centre in Los Angeles. "When something like this happens, I think a lot about my kids," says Barbara O'Leary, a hostess at a local diner. "I have to hope I raised them right. These are the dangerous years. You don't always know what's going on inside their heads." (*Time*, 23 March, 1987, pp. 18-19)

باربرا وہیلر نے کہا کہ میرا یہ خیال نہیں کہ خودکشی کے وقت یہ بچے سمجھتے ہوں کہ وہ مرنے جا رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ درد کو دور کرنے اور مسئلہ کو حل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ الین لیڈر نے کہا کہ ہر شخص اس طرح دوڑ بھاگ میں ہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو سن سکیں۔ باربرا اولیری نے کہا کہ جب اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو میں اپنے بچوں کے بارے میں بہت زیادہ سوچنے لگتی ہوں۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں ان کو درست طور پر پرورش کرسکوں۔ یہ ان کی زندگی کے خطرناک سال ہیں۔ آپ ہمیشہ یہ جان نہیں سکتے کہ ان کے دماغ میں کس طرح کے خیالات گھوم رہے ہیں۔

ٹائم (23 مارچ 1987) کی مذکورہ رپورٹ پڑھنے کے بعد کچھ امریکی باشندوں نے مذکورہ ہفت روزہ کے نام خطوط لکھے ہیں جو ٹائم (13 اپریل 1987) میں چھپے ہیں۔ ایک مکتوب نگار لکھتے ہیں کہ میرا دل ان خاندانوں کے لیے خون بہاتا ہے جن کے بچوں نے خودکشی کی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ میرے 16 سال کے پوتے نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ ہمارا خاندان زندگی بھر حیران رہے گا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور ہم کبھی اس کو جان نہ سکیں گے:

"My heart bleeds for the families of the teen suicides. I know. My 16-year old grandson committed suicide by hanging. Our family will spend the rest of our lives wondering why, and we will never know" (Eloise Gradin, Pensacola Beach Florida).

ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوانوں میں خودکشی کا رجحان کیوں ہے۔ اس کی واحد وجہ ان کی اپنے سرپرستوں سے محرومی ہے۔ ان ملکوں میں خاندانی انتشار کا مسئلہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا ہے اور یہی چیز ہے جس نے نوجوانوں کے اندر خودکشی کا رجحان پیدا کر دیا ہے۔ وہ خاندان کی شفقت سے محروم ہو کر پرورش پاتے ہیں، اور بڑے ہو کر طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ چیز بعض اوقات انھیں خودکشی تک پہنچا دیتی ہے۔

ان ملکوں میں خاندانی انتشار پیدا ہونے کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے ازدواجی زندگی کی بنیاد ذمہ داری کے بجائے لذت پر قائم کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ازدواجی تعلق میں مستقل تقدس کی قدر باقی نہ رہی۔ لوگ لذّت کی خاطر ایک دوسرے سے ملنے اور لذّت ختم ہونے پر ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے۔ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلاق عام ہو گئی۔ طلاق کے بعد عورت ایک طرف چلی گئی اور مرد دوسری طرف۔ انھوں نے اس دوران میں جو بچہ پیدا کیا تھا، اس کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ وہ والدین کی موجودگی میں یتیم بن کر رہ گیا۔

اس کی دوسری وجہ ان ملکوں میں مشترک زندگی کا خاتمہ ہے۔ انھوں نے زندگی کا جو طرز اختیار کیا اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ بوڑھے ماں باپ دار الضعفاء (old age home) میں بھیجے جانے لگے۔ مشترک خاندان میں دادا اور دادی، نانا اور نانی بچوں کو سنبھالنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ مگر مغرب کی معاشرت میں ان لوگوں کا مقام گھر نہیں بلکہ وہ ضعیف خانے (old age home) ہیں جو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ ایک اور صورت میں والدین کے ساتھ ہوا ہے۔ وہاں کے نظام کے مطابق مرد اگر کام کرتا ہے تو عورت بھی کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں بیشتر اوقات گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اپنے بچوں سے ان کی ملاقات بمشکل صرف "اتوار" کے دن ہوتی ہے۔ گویا مغرب کا بچہ اپنے دادا اور دادی یا نانا اور نانی سے اس لیے محروم ہے کہ وہ دار الضعفاء (old age home) میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اور اپنے ماں باپ سے اس لیے محروم ہے کہ وہ دونوں کام کرنے کے لیے آفس چلے گئے ہیں۔ ایسے بچوں کا وہی انجام ہو سکتا ہے جو اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔

خاتون سنگر کی موت کے بعد

ٹائمس آف انڈیا (30 مارچ 1987) میں ایک رپورٹ جاپان کے متعلق شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کا عنوان ہے:

Suicide Easy Escape for Japanese Youth.

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 19 سال کے اندر کی عمر کے جاپانی نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھے ہیں۔ 1985ء میں ایسے نوجوانوں کی تعداد 557 تھی۔ جب کہ 1986 میں ان کی تعداد 802 تک پہنچ گئی۔

خودکشی کرنے والے اکثر نوجوان وہ تھے جو عمارتوں کی چھتوں سے کود پڑے۔ یہ واقعہ اس کے بعد ہوا جب کہ 18 سالہ خاتون پاپ سنگر یوکیکو اوکادا نے محبت میں ناکامی کے

بعد ایک چھت سے کود کر اپریل 1986 میں اپنی جان دے دی تھی۔ نوجوانوں نے بھی اسی کی نقل کی۔ کچھ لوگ جنھوں نے اس طریقہ سے اپنی جان دی وہ مس اوکادا کی موت سے غم زدہ تھے۔ انھوں نے چاہا کہ وہ بھی موجودہ دنیا سے رخصت ہو جائیں اور جنّت میں پہنچ کر اپنی دل پسند سنگر سے جاملیں۔ کچھ لوگوں نے مرتے وقت ایسی تحریر چھوڑی جس میں مذکورہ پاپ سنگر خاتون کا نام لکھا ہوا تھا:

> Many were youngsters who jumped from roofs of buildings after 18-year old pop singer Yukiko Okada used that method of killing herself in April 1986 because of an unhappy lone affair. Some of the people who died killed themselves because they felt sorry for her (Miss Okada) and wanted to be in heaven with her. A few left notes mentioning the singer.
>
> (*Times of India*, 30 March, 1987, p. 6)

یہ ان بے شمار نقصانات میں سے ایک نقصان ہے جو عورتوں کو "اسکرین" کی چیز بنانے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ عورت اگر گھر کو سنبھالے تو وہ نوجوان نسل کو زندگی دینے والی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھر سے باہر نکل کر لوگوں کی تفریح کا سامان بنے تو وہ نوجوان نسل کو ہلاکت سے دوچار کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

فطرت سے دور ہو کر

انسان کا بچہ تمام جانداروں کے بچے میں سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے۔ اس کو جسمانی پرورش اور ذہنی تربیت دونوں مقصد کے لیے لمبے عرصہ تک اپنے ماں باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے انسان کے اندر اپنے بچے کے لیے خصوصی کشش رکھی ہے۔

قدیم زمانہ میں بچے کے لیے اپنے باپ یا ماں سے محروم ہونا صرف ہنگامی اسباب سے ہوتا تھا۔ جنگ یا کسی اتفاقی حادثے سے قبل از وقت موت۔ عام حالات میں یقین کیا جا سکتا

تھا کہ بچوں کو اپنے والدین کی سر پرستی پختگی کی عمر تک حاصل رہے گی۔

جدید ترقی یافتہ سماج میں یہ استثنا اب عموم بن گیا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے جدید تصورِ زندگی کا جس نے نکاح کے رشتہ کو غیر مقدس بنا دیا ہے۔ اب یا نکاح کے بغیر لڑکے پیدا ہوتے ہیں یا نکاح کے جلد ہی بعد طلاق کی شکل میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے۔ بچوں کی اپنے ماں باپ سے جدائی۔ بچوں کا اپنے والدین کے جیتے جی یتیم ہو جانا۔

اس بڑھتی ہوئی "یتیمی" نے جدید معاشرہ کے لیے طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کو محرومی کا بونا پن (deprivation dwarfism) کا نام دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مغرب کے طبی ماہرین کی ایک تازہ رپورٹ (ایوننگ نیوز 27 جون 1984) سامنے آئی ہے۔

اس رپورٹ میں مغربی طرز حیات کے نتائج کے بارے میں بہت سے انکشافات کیے گئے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ سے محرومی کی بنا پر جن بچوں کو ابتدائی عمر میں محبت نہیں ملتی ان میں مختلف قسم کا نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جسمانی نشو ونما میں کمی، دماغ کا ہلکا پن، حتیٰ کہ یہ چیزیں بعض اوقات ان کی قبل از وقت موت کا باعث ہو جاتی ہیں۔

محرومی کا بونا پن نامی بیماری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ ٹھیک طرح سو نہیں پاتا، اس کا نظام ہضم ٹھیک طرح کام نہیں کرتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اسپتالوں میں جہاں چھوٹے بچے بیڈ پر ڈال دیے جاتے ہیں، پیٹھ کے بل دیر دیر تک پڑے رہنے سے ان کے سر کا پچھلا حصہ گنجا ہو جاتا ہے کیوں کہ وہاں کوئی ماں بار بار کروٹ بدلنے کے لیے موجود نہیں ہوتی۔ ماں باپ سے محروم ہو کر دار الاطفال میں پرورش پانے والے بچے اپنے ذہنی اور جسمانی ارتقاء سے محروم رہتے ہیں۔

Man-made dwarfism

The human baby is the weakest and most tender of all the babies of living creatures. It therefore needs its parents' care and guidance in its physical and mental growth for longer period. That is why nature has endowed parents with a special attraction for their offspring.

In the past, the separation of children from their parents was caused only by emergencies such as war, or occasional premature death, and, in normal circumstances, it was taken for granted that the children would enjoy the protection of their parents for as long as they required it.

However, in advanced societies, a prolonged period of guardianship has become the exception rather than the rule, for the simple reason that the modern concept of living has destroyed the sanctity of marriage. Either children are born out of wedlock and are unwanted right from the very beginning, or they find themselves bandied about between parents who have decided to separate shortly after marriage. Their "orphaned" state during their parents' lifetime soon becomes one of social alienation.

The rising incidence of this kind of orphaning is creating complex problems in modem society, one of which goes by the name of "deprivation dwarfism," a disease, according to medical experts, that can cause sleeplessness and severe bowel disorders, and used to kill many children in orphanages. A recent report by

western medical authorities says, "Lack of love can stunt children's physical growth, retard their intellect, or even kill them." Pediatricians say that as late as 1915, some 90 percent of the children who died in Baltimore orphanages (in Maryland, U.S.A.) within the first year of admission, did so because of lack of love.

In deprivation dwarfism a child does not sleep properly and has trouble with his bowels.

Just as the human body can become dwarfed, so can the human spirit. The only cure for this is the tender, loving care which is engendered by love. There is no substitute for it, and the greatest love of all is the love of God.

(*Evening News*, 27 June, 1984)

ڈاکٹر گارڈنر (Dr. Gardner) کا کہنا ہے کہ مطالعہ بتاتا ہے کہ دماغ کی اعلیٰ سطح سے ارتعاشات (impulses) اٹھتے ہیں۔ یہ ارتعاشات جسمانی نظام میں داخل ہو کر مختلف قسم کے ہارمون پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں جو زندگی کی نشوونما کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جو پروٹین کو شکر میں تبدیل کرتا ہے۔ ماں باپ کی محبت سے محروم ہو کر جو بچے پرورش پاتے ہیں ان میں یہ قدرتی عمل کم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا جسم حاصل شدہ پروٹین کو پوری طرح استعمال نہیں کر پاتا جو ان کے نشوونما کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فطرت کے راستہ سے ہٹنا کس قدر تباہ کن ہے۔ انسان خدا کی بنائی ہوئی دنیا سے ہٹ کر اپنے لیے کوئی دوسری دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اسی دنیا کے ساتھ مطابقت کرے۔ اگر وہ فطرت کی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنے لیے کوئی دوسری شاہراہ بنانا چاہے گا تو وہ صرف ناکامی اور بربادی پر

ختم ہوگا۔ اس کے سوا اس کا کوئی انجام نہیں۔

بے قیدی کا تجربہ

امریکی میگزین نیوز ویک (21 جنوری 1985) صفحہ 35 پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں امریکی خواتین کا ایک جلوس دکھائی دے رہا ہے۔ جلوس کے آگے ایک نوجوان عورت ایک بینر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے:

"Keep your laws and your morality off my body."

اپنے قوانین اور اپنے اخلاق کو میرے جسم سے دور رکھو۔

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکا کے لوگ اس وقت دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک وہ جو کھلے عام اسقاط کے قائل ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو "اسقاط نواز" نہ کہہ کر اپنے کو انتخاب نواز (pro-choice) کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ جو اسقاط کا مخالف ہے وہ اپنے آپ کو زندگی نواز (pro-life) کہتا ہے۔

جدید مغربی مفکرین کا کہنا ہے کہ انھوں نے جو سب سے بڑی چیز دریافت کی ہے وہ آزادی ہے۔ مگر بے قید آزادی کا تجربہ جو جدید مغرب میں ہوا وہ بتاتا ہے کہ بے قید آزادی خیر اعلیٰ نہیں ہوسکتی۔

بے قید آزادی اگر خیر اعلیٰ ہوتو وہ اس قبیح انجام تک کیسے پہنچ جاتی ہے جس کا ایک نمونہ اوپر کے اقتباس میں نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی بے حد قیمتی چیز ہے۔ مگر انسان کے لیے خیر اعلیٰ پابند آزادی ہے، نہ کہ مطلق آزادی۔ یعنی انسان کے مقابلہ میں آزادی مگر خدا کے مقابلہ میں پابندی۔

انسان خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ جہاں تک اپنے جیسے انسانوں کا تعلق ہے، ان کے مقابلہ میں بلاشبہ ہر انسان کو کامل آزادی حاصل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری شدید ترحقیقت یہ ہے کہ خدا کے مقابلے میں انسان مکمل طور پر پابند ہے۔ خدا کے مقابلے میں کسی

انسان کو کوئی آزادی حاصل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو اپنی آزادی کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ وہ ہر حال میں خدا کے احکام کا پابند رہے۔ یہی پابندی آزادی کے صحیح استعمال کی ضمانت ہے۔

خاتون لیڈر کا اعتراف

امریکا کی مشہور ناول نگار خاتون اور تحریک نسواں کی لیڈر رہوڈ الرمن اپریل 1987 میں ہندستان آئیں۔ یہاں نئی دہلی میں انھوں نے ٹائمس آف انڈیا کے ایک اسٹاف رپورٹر کو انٹرویو دیا۔ یہ انٹرویو اخبار مذکور کے شمارہ 30 اپریل 1987 میں شائع ہوا ہے۔ یہ پورا انٹرویو اگلے صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔

رھوڈ الرمن نے کہا کہ میں بہت بری خبر لے کر آئی ہوں۔ سماج میں عورت کے بدلتے ہوئے کردار پر بولتے ہوئے انھوں نے انکشاف کیا کہ امریکا کے غریبوں میں 77 فی صد تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اس کا سبب وہ غیر معمولی فرق ہے جو مردوں اور عورتوں کی کمائی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کمائی 62 فی صد ہے۔ صرف اس لیے کہ انھیں ہلکے قسم کے کام دیے جاتے ہیں۔ یکساں مواقع اور یکساں تنخواہ یکساں کام کے لیے محض ایک افسانہ ہے۔ عورتیں ابھی تک صرف نچلے اور درمیانی انتظامی شعبوں میں داخل ہو سکی ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ یہ امتیاز مردانہ تعصب کی بنا پر ہے جو عورتوں کے خلاف کام کر رہا ہے۔ مردوں کا کہنا ہے کہ عورتوں پر انحصار نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ وہ زچگی کی چھٹی لیتی ہیں اور بچے پالتی ہیں۔ اگر چہ 94 فی صد کام کرنے والی عورتوں کے یہاں بچے ہیں، ان میں سے صرف 67 فی صد اس اندیشہ کے بغیر زچگی کی چھٹی سے فائدہ اُٹھا پاتی ہیں کہ اس سے ان کی ملازمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم سینیر ٹی کا نقصان انھیں ہمیشہ اٹھانا پڑتا ہے۔ زچگی

اور بچوں کی پرورش تنخواہوں میں زبردست فرق کا سبب ہیں۔ معاشی حقیقت روحانی برابری سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ آزادیٔ نسواں کے علم برداروں نے جنسی برابری اور اسقاط کے حق کے لیے شور وغل کیا اور اس کو حاصل کرلیا، وہ اس معاشی تباہی کا اندازہ نہ کر سکے جو کہ اس کے بعد آنے والی تھی۔

انقلابی نسوانی تحریک کے تحت عورت اور مرد برابر مان لیے گئے ہیں، مگر عورت کو اس کے حیاتیاتی فرق کی کوئی رعایت نہیں ملی۔ مثال کے طور پر، امریکا میں ہر دو شادی میں سے ایک شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد بچہ کی پرورش کی ذمہ داری تنہا عورت پر آجاتی ہے۔ نفقہ اور گزارہ محض لفظی قوانین ہیں، وہ بہت ہی کم عمل میں آتے ہیں۔ صرف 5 سے 10 فی صد تک ایسے مرد ہیں جو گزارہ ادا کرتے ہیں، اور وہ بھی صرف پہلے سال تک۔ بعد کے سالوں میں پورا بوجھ صرف ماں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح زندگی کا معیار ایک مطلقہ عورت کے لیے 73 فی صد تک گھٹ جاتا ہے، اور مرد کا اس کے مقابلہ میں 43 فی صد بڑھ جاتا ہے۔ اس قسم کی اکیلے کی زندگی کو مغرب میں مونو پیرنٹ (Monoparent) کہا جانے لگا ہے۔

ایسے گھروں کی تعداد بڑھ رہی ہے جن میں صرف عورت ذمہ دار ہو اور وہ تنہا ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کرے۔ چنانچہ اگلے دس برسوں میں 40 تا 50 فی صد بچے وہ ہوں گے جو ایسے گھروں میں پرورش پائیں گے جن کی ذمہ دار صرف عورت ہو۔ یہ ایک غیر صحت مندانہ مظہر ہے جس کے نتیجہ میں بچوں میں خودکشی کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ خاندانی نظام میں انحصار کے فقدان کی وجہ سے خودکشی بچوں کی خصوصیت بن رہی ہے۔

اشتراکی نسوانیت جو کہ مرد اور عورت کے درمیان پائے جانے والے ناگزیر فرق کو ملحوظ رکھتی ہے آج وقت کی پکار ہے۔ امریکی زندگی کے بارے میں (ابتداءً) ہمارا ایک

بڑھا ہوا خواب تھا— ایک شوہر جو کام کرے، شہر کے کنارے ایک مکان، دولڑکے، دوکاریں اور ماں جو گھر پر رہے اور کیک بنائے (مگر آزادیِ نسواں کی تحریک نے اس خواب کو منتشر کر دیا)۔

خاندانی نظام کے ٹوٹنے کے بعد صرف حکومت کی مدد ہی مسئلہ کو حل کرسکتی ہے۔ حکومت کی طرف سے بچوں کی نگہداشت کے لیے مراکز ہوں، زچگی کی سہولت ہو اور تنہا عورت کی معاشی کمیوں کی تلافی کے لیے اس کو مدد دی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری فتوحات جھوٹی فتوحات بن کر رہ جائیں گی یا ویسی ہی آزادی جس کا تجربہ چیتا کے اوپر ہوتا ہے۔

A Pyrrhic Victory

“I come with very bad news,” says Rhoda Lerman. Speaking on the changing role of women in society, she revealed that 77 percent of the poor in America are women and children.

The reason she offers is the high wage differential between the earnings of men and women. Women earn 62 percent of what men earn, merely because of the "pink-collared" jobs offered to them. “Equal opportunities and equal pay for equal work are just a myth," she declares. Women have been able to infiltrate only the lower and middle management and are offered innumerable jobs in food chains and the secretarial cadres.

This discrimination, she believes, is due to the male bias which works against women, branding them as ‘undependable, since they go in for maternity leave and have children.’ Although 96 percent of the working women have children, only 67 percent of them can enjoy

maternity leave, without fear of jeopardising their jobs. However, seniority almost always suffers, says Ms. Lerman. "Maternity and childcare are the cause of high wage differentials," she adds, "economic reality having nothing to do with spiritual equality." Activists had clamored for sexual equality and abortion rights and won them, without anticipating the economic backlash that would ensue.

With radical feminism accepted as the code, women are treated as equal, without any concessions to their biological differences. For instance, one out of two marriages in America is ending in divorce, with the responsibility of childcare devolving on the mother alone. Alimony and maintenance are merely laws, rarely put into practice. A mere 5-10 percent of the men pay maintenance, and that too, only for the first year.

For the rest, the burden is borne solely by the mother. Thus, the quality of life of a divorced woman reduces by 73 percent and that of a man increases by 43 percent.

Single households, headed by women trying to play the role of "super-moms," are on the increase, she revealed. In the next ten years, therefore, 40-50 percent of the children will be living in female-headed households, an unhealthy phenomenon, which has its repercussions in increased suicides amongst children. "Due to a lapse in the dependency structure, suicide is becoming endemic amongst children," she said.

Socialist feminism, which takes into account the intrinsic differences between men and women, is the call of the hour, Ms. Lerman believes. We have had an excess of the

American dream—of a husband who works, a house in the suburbs, two children, two cars and a mother who stays at home and bakes cookies.

With the family structure falling apart, she feels that only government support in the form of day-care centers, maternity leave benefits and subsidies to override the economic limitations of single women can hold the social fabric together. "Otherwise, our victories will be merely Pyrrhic victories," 34 she predicts, similar, perhaps to the freedom experienced on the funeral pyre.'

(*The Times of India,* New Delhi, April 30. 1987)

امریکا کی خاتون لیڈر نے مذکورہ بیان میں اعتراف کیا ہے کہ تحریک نسواں کی کامیابیاں پرک فتوحات (pyrric victories) بن کر رہ گئی ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح میں ایک یونانی بادشاہ تھا جس کا نام پرھس (Pyrrhus) تھا۔ اس نے 281 ق م میں اٹلی پر حملہ کیا۔ لمبی جنگ کے بعد اس کو فتح حاصل ہوئی۔ مگر فتح تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنا سب کھو چکا تھا۔ چنانچہ بعد کو 275 ق م کی جنگ میں اس کو دوبارہ شکست ہوئی۔ 272 ق م میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ پرک وکٹری اسی کی طرف منسوب ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ ایسی فتح جو بربادی لے کر آئے۔

یہ صحیح ترین لفظ ہے جو جدید عورت کی فتح کے بارے میں بولا جا سکتا ہے۔ جدید عورت نے لمبی جدو جہد کے بعد "مساوات" حاصل کی۔ مگر اس خیالی مساوات کو حاصل کرنے تک وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔ مذکورہ خاتون کا کہنا ہے کہ مغربی عورت کی محرومی کی تلافی کی اب صرف ایک صورت ہے۔ یہ کہ حکومت اس کی سرپرست بن جائے، وہی حکومت جو آج بھی پوری طرح مردوں کے قبضہ میں ہے۔ گھریلو مرد کی سرپرستی پر عورت راضی نہ تھی۔ اس کی قیمت میں عورت کو حکومتی مرد کی سرپرستی پر راضی ہونا پڑا۔

دومثالیں

آزادی کے مصنوعی تصور نے مغربی گھروں میں جو مسائل پیدا کیے ہیں، ان کا تعلق صرف نچلے یا درمیانی طبقہ کے لوگوں میں نہیں ہے۔ اس کے برے اثرات اونچے خاندانوں اور نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں ہم دومثالیں نقل کریں گے۔

حال میں آئن سٹین کے کچھ خطوط ملے ہیں۔ یہ خطوط اس نے ایک عورت (میلیو امیرک) کے نام لکھے تھے جو بعد کو اس کی پہلی بیوی بنی۔ یہ خطوط ان کے تعلقات کی خوشی اورغم کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ یہ خطوط آئن سٹین کی تحریروں کے مجموعہ کے لیے مواد کی تلاش کے دوران حاصل ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے:

'The Collected Papers of Albert Einstein."

میلیو امیرک (Mileva Maric) کی عمر آئن سٹین سے چار سال زیادہ تھی۔ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً آئن سٹین کی ماں اس رشتہ پر راضی نہ تھی جس کی بنا پر انھیں مایوسی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ بعد کو آئن سٹین اور میلیو اکا نکاح ہوا۔ تاہم نکاح سے پہلے ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوچکی تھی۔ اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ لڑکی کے ساتھ کیا پیش آیا۔ بظاہر وہ آئن سٹین کے ساتھ کبھی نہیں رہی۔

آئن سٹین اور مس میرک کی ملاقات 1896 میں فیڈرل ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ (زیورک) میں ہوئی تھی۔ ان کا نکاح جنوری 1903 میں ہوا۔ یہ شادی کامیاب نہ ہوسکی اور 1919 میں ان کے درمیان طلاق ہوگئی:

Einstein had met Ms. Maric in 1896 at the Federal Technical Institute in Zurich. They were married in

January 1903, their marriage ended in divorce in 1919.

(*The Times of India*, May 5, 1987).

دوسری مثال موجودہ برطانی ولی عہد چارلس کی ہے۔ مسز پینی جونر نے حال میں پرنس چارلس کی سوانح عمری شائع کی ہے۔ اس میں وہ کہتی ہیں کہ پرنس چارلس نے ایک غلط عورت سے شادی کی۔ اس سلسلہ میں بی بی سی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پرنس چارلس ایک غم زدہ شخص ہیں۔ وہ زمین پر بالکل تنہا ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایک بیوی سے جو مدد ملنی چاہیے وہ انھیں حاصل نہیں۔ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈائنا ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مسز جونر نے کہا کہ انھوں نے یہ نتیجہ ان لوگوں سے بات کر کے حاصل کیا ہے جو شہزادہ سے بہت قریب ہیں۔ میں نے اپنے کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اور جو نتیجہ نکالا ہے اس کو شاہی محل دیکھ چکا ہے۔ محل کے کسی آدمی نے نہیں کہا کہ میں غلط راستہ پر ہوں۔

Charles, Diana Misfits

"Prince Charles, heir to the British throne, married the wrong woman," said his biographer, Mrs. Penny Junor in a recent interview with BBC. Charles, she said, was a sad character with the loneliest position on earth. He did not have the support he should have from a wife. Prince Charles and Princess Diana were growing more and more apart. Mrs. Junor said she had drawn her conclusions after talking to people who were close to him. "The palace has seen what I have written and the conclusions I have come to. No one has told me that I am on the wrong lines."

(*Time*, New York, 11 May 1987, *Times of India*, *Hindustan Times*, 29 April, 1987)

ناقابل اعتماد کردار

ٹائم "نیویارک" نے اپنے شمارہ 25 مئی 1987 میں پنٹا گان سے متعلق ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے۔ جنس کا تعلق رازداری سے:

Mixing Sex And Secrets.

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکی ادارہ پنٹا گان 2.7 ملین لوگوں کے جنسی اعمال کی بابت محکمہ دفاع کے سیکوریٹی کلیرنس کے معاملہ میں پریشان ہے۔ جنوری 1987 میں پنٹا گان نے اپنے ضوابط کی توسیع کرتے ہوئے فوج کے لوگوں، شہری کارکنوں اور ٹھیکہ کے ملازموں پر یہ شرط عائد کردی ہے کہ وہ کلیرنس کے تحت یہ بتائیں کہ کیا وہ جنسی اعمال مثلاً زنا، اغلام اور محرمات کے ساتھ مباشرت میں مبتلا رہے ہیں۔ ان قوانین کا مقصد یہ اطمینان حاصل کرنا ہے کہ وہ لوگ جن کی پہنچ حکومت کے رازوں تک ہے ان میں یہ کمزوری نہیں ہے کہ ان کو بلیک میل کیا جاسکے:

> "The Pentagon has been fretting about the sexual practices of the 2.7 million people with Defence Department security clearances. In January (1987) the Pentagon expanded its rules to compel service personnel, civilian workers and contract employees with clearances to divulge whether they had engaged in such sexual acts as adultery, sodomy and incest. The rules were intended to ensure, that those with access to secrets are not vulnerable to blackmail."
>
> (*Time*, New York, 25 May, 1987, p. 29)

اباحیت پسند لوگوں کا دعویٰ تھا کہ نکاح سے باہر جنسی تعلقات محض " گناہ " ہیں۔ یعنی وہ خدا کے نزدیک برُے ہوسکتے ہیں، مگر انسانی معاملات میں ان سے کوئی نقصان واقع نہیں

ہوتا۔مگر تجربات نے بتایا کہ جو شخص جنسی تعلق کے معاملہ میں نکاح کے حدود کا پابند نہ ہو وہ ایک نا قابل اعتماد شخص بن جاتا ہے۔اس کے اندر ایک ایسا اخلاقی رخنہ پیدا ہوجاتا ہے جس سے داخل ہوکر دشمن ہمارے نازک ترین رازوں تک پہنچ جائے۔

ایک مثال

مسٹر گاری ہارٹ (Gary Hart) امریکا کے صدارتی الیکشن (1987) کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار تھے۔تمام اندازوں کے مطابق ان کی کامیابی یقینی تھی۔مگر اس درمیان میں ایک واقعہ ہوا۔اس کے بعد امریکا میں اتنا طوفان اٹھا کہ مسٹر ہارٹ کو صدارت کے مقابلہ سے استعفا دینا پڑا۔

50 سالہ مسٹر ہارٹ الیکشن کی مہم میں مصروف تھے۔اس کے لیے انھوں نے ایک ملین ڈالر سے زیادہ قرض لیا تھا۔اس درمیان میں ہفتہ کا آخری دن گزارنے کے لیے یکم مئی کو وہ خاموشی کے ساتھ میامی پہنچے۔یہاں انھوں نے ایک 29 سالہ ایکٹرس مس ڈونا رائس (Donna Rice) کے ساتھ ایک دن اور ایک رات گزاری۔اس کی خبر ایک امریکی اخبار میامی ہیرالڈ (Miami Herald) کو ہوگئی۔اس نے اپنی 3 مئی 1987 کی اشاعت کے صفحہ اوّل پر یہ کہانی حسب ذیل سنسنی خیز سرخی کے ساتھ چھاپ دی:

"Miami woman is linked to Hart."

اس کے فوراً بعد ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔مسٹر ہارٹ کی تصویریں مس ڈونا رائس کے ساتھ چھپنے لگیں۔مسٹر ہارٹ جہاں جاتے وہاں ان سے پوچھا جاتا کہ کیا وہ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔مسٹر ہارٹ عوامی عدالت میں زناکاری کے ملزم کی حیثیت سے کھڑے کر دیے گئے:

"Hart stood in the public dock accused of adultery." (p.6)

میامی ہرالڈ میں اگر یہ خبر چھپتی کہ مسٹر ہارٹ فلاں مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ رات بھر رہے تو کوئی اس پر دھیان نہ دیتا۔ مگر اخبار نے جب یہ خبر چھاپی کہ مسٹر ہارٹ نے میامی کے فلاں مکان میں ایک غیر عورت کے ساتھ رات گزاری تو ہر طرف ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یہ واقعہ اس بات کا تجرباتی ثبوت ہے کہ غیر عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ اگر یہ فعل انسانی فطرت کے خلاف نہ ہوتا تو ہنگامہ کرنے والے کبھی اپنے منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

مسٹر ہارٹ نے اس مصیبت سے بچنے کے لیے اپنی ساری ذہانت صرف کر دی۔ پہلے انھوں نے انکار کیا۔ پھر ٹالنے والے جوابات دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی بیوی لی ہارٹ (Lee Hart) کو راضی کیا کہ وہ 1300 میل کا سفر طے کر کے ہیم شائر سے ڈنور (Denver) پہنچیں اور اخبار نویسوں کے سامنے اپنا یہ بیان دیں کہ یہ بات اگر مجھے پریشان نہیں کرتی، تو میں نہیں سمجھتی کہ کسی اور کو اس سے پریشان ہونا چاہیے:

"If it doesn't bother me, I don't think it ought to bother anyone else." (p. 7)

مسٹر ہارٹ نے جب دیکھا کہ معاملہ کو چھپانے کے بارے میں ان کی ساری تدبیروں کے باوجود راز کھل گیا ہے تو آخر کار انھوں نے اعتراف کر لیا۔ اب انھوں نے کہا کہ زنا کوئی قانونی جرم نہیں ہے۔ وہ صرف ایک گناہ ہے۔ اور وہ میرے اور میری بیوی اور میرے اور خدا کے درمیان ہے:

"Adultery is not a crime. It's a sin. And that is between me and Lee, and me and God." (p. 7)

تاہم مسٹر ہارٹ کی یہ باتیں امریکی عوام کو مطمئن نہ کر سکیں۔ اوپینین پول میں اس سے پہلے امکانی صدر کی حیثیت سے ان کا نام سرفہرست رہتا تھا۔ اب پول کے ذریعہ عوام کی

پیشگی رائے معلوم کی گئی تو اچانک ان کا نام بالکل نیچے آ گیا۔ اس کے بعد مسٹر ہارٹ نے اپنے آپ کو ملک میں تنہا پایا:

And in the end, he found himself alone (p. 10)

ٹائم (18 مئی 1987) کے الفاظ میں ایکٹرس سے جنسی تعلق ان کے لیے ان کی سیاسی موت (political death) کے ہم معنی بن گیا۔ 3 مئی کو اس معاملہ کا انکشاف ہوا اور صرف پانچ دن بعد 8 مئی کو انھوں نے ان الفاظ کے ساتھ صدارتی مقابلہ سے علاحدگی کا اعلان کر دیا:

"I was withdrawing from the race and would then quietly disappear from the stage." (p. 6)

ٹائم نے اس سلسلہ میں اپنی طویل رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ امریکی اب اپنے لیڈروں کے بارے میں وہی گہری معلومات جاننا چاہتے ہیں جو کسی وقت کلارک گیبل (ایکٹر) اور ایلزبتھ ٹیلر (ناول نگار) کی رومانیت کے لیے مخصوص تھیں۔ ہتھیاروں کے کنٹرول کے مسائل سے نبرد آزما ہونے اور معاشی مسائل سے نمٹنے سے زیادہ امریکی عوام ایسے افراد چاہتے ہیں جن پر وہ بھروسہ کر سکیں۔ جن کا فیصلہ اور جن کی دیانت داری ان کے لیے اطمینان بخش ہو:

"Americans now demand the same intimate knowledge about their leaders that once was reserved for the romantic entanglements of Clark Gable or Elizabeth Taylor. Rather than wrestling with the complexities of arms control and a troubled economy, the public tends to look for personalities they can trust, whose judgement and integrity make them feel comfortable." (pp, 7-8)

یہی بات سابق صدر امریکا لنڈن جانسن کے پریس سکریٹری جارج ریڈی (George Reedy) نے اس طرح کہی کہ صدارت کے امیدوار کے لیے جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اس کا کیریکٹر ہے۔ اور یہ سب سے زیادہ عورتوں کے ساتھ اس کے تعلق کے معاملہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس عہدہ پر ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو آپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنے بنک اکاونٹ کے معاملہ میں اس پر بھروسہ کریں، اسی طرح آپ کے بچوں، آپ کی زندگی اور آپ کے ملک کے معاملہ میں بھی چار سال تک۔ اگر خود اس کی اپنی بیوی اس پر اعتماد نہ کر سکے تو یہ بات کس چیز کا پتہ دیتی ہے:

> "What counts with a candidate for President is his character, and nothing shows it like his relationship with women. Here you have a man who is asking you to trust him with your bank account, your children, your life and your country for four years. If his own wife can't trust him, what does that say?" (p. 15)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ایسا کرے کہ وہ نکاح کے دائرہ سے باہر جنسی تعلق قائم کرے، وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے اندر ذہنی ڈسپلن نہیں ہے۔ وہ اپنے جذباتی محرکات پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایسا شخص اپنے کردار کے اعتبار سے ہرگز اعتبار کے قابل نہیں۔ اس کے اندر ایک ایسی نفسیاتی کمزوری ہے جس کی بنا پر شدید اندیشہ ہے کہ وہ اپنی کسی ذاتی خواہش کے لیے بڑے بڑے قومی مفاد کو قربان کردے۔ ایسا شخص عام زندگی میں بھی بھروسہ کے قابل نہیں، کجا کہ ریاست کے اعلیٰ منصب کے لیے اس پر بھروسہ کیا جائے۔

تجربات بتاتے ہیں کہ جنسی تعلقات کے معاملہ میں خدائی حد کو توڑنا سادہ معنوں میں صرف ایک مذہبی برائی نہیں ہے، وہ مہلک قسم کی سماجی برائی بھی ہے۔ وہ صرف ایک گناہ نہیں، وہ ایک جرم بھی ہے۔ بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے سب سے بڑا جرم۔

اجرتی ولادت

جدید دور نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو نیابتِ مادری (surrogacy) کہا جاتا ہے۔ اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ امریکا میں 1976 سے 1986 تک مصنوعی حمل (artificial insemination) کے ذریعہ 500 لڑکے پیدا کیے جاچکے ہیں۔ امریکا میں اس وقت تقریباً ایک درجن اس قسم کے مراکز (surrogate centers) کام کررہے ہیں۔ ان مراکز میں مزید اضافہ کا امکان ہے، کیونکہ امریکا میں تقریباً 15 فی صد شادی شدہ افراد طبی طور پر غیر زرخیز (infertile) ہیں۔ (ٹائم 19 جنوری 1987)

مسٹر ولیم اسٹرن اور ایلزبتھ اسٹرن کے یہاں اولاد نہیں تھی، انھوں نے طے کیا کہ وہ کسی خاتون کو معاوضہ دے کر اس کے رحم کو استعمال کریں گے اور اپنے لیے ایک بچہ حاصل کریں گے۔ 1985 میں 20 ہزار ڈالر ادا کر کے انھوں نے میری بیتھ وہاٹ ہیڈ (Mary Beth Whitehead) سے معاہدہ کیا۔ اس کے رحم میں مسٹر اسٹرن کا مادہ بذریعہ انجکشن داخل کردیا گیا۔ اس عمل کے ذریعہ ایک بچی پیدا ہوئی۔ اب مسز وہائٹ ہیڈ کی مامتا جاگ اٹھی۔ اس نے بچی کو مسٹر اسٹرن اور مسز اسٹرن کے حوالے کرنے سے انکار کردیا۔

یہ معاملہ عدالت تک پہونچا۔ عدالت نے اس کو معاہدہ (Contract) کا معاملہ قرار دے کر بچی کو مسٹر اسٹرن کے حوالے کیے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ پانچ پولیس کے آدمیوں کو لے کر مسز وہائٹ ہیڈ کے گھر آئے تو خاتون بچی کو لے کر گھر کے پچھلے دروازے سے بھاگ گئی۔ تاہم وہ دوسرے شہر میں پکڑی گئی اور آخر کار بچی اسٹرن اور مسز اسٹرن کے حوالے کردی گئی۔

اب امریکا میں اس پر اخلاقی بحثیں شروع ہوگئی ہیں۔ نیوجرسی کے بشپ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مادری نیابت کا طریقہ بچہ کو محض ایک سودا بنا دیتا ہے۔ اور عورت کو محض ایک بچہ ساز:

> Surrogacy exploits a child as a commodity and exploits a woman as a baby-marker (46).

دوسری طرف جو عورت دوسرے شخص کے لیے بچہ پیدا کرتی ہے وہ خود سخت قسم کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ اس قسم کی ایک عورت ایلزبتھ کین (Elizabeth Kane) نے کہا کہ مجھے اپنے بچہ کی یاد ستاتی ہے۔ ان احساسات کو دبانے کے لیے مجھے برسوں کی مدت درکار ہوگی:

> "I miss my baby. I had to suppress those feelings for years."

جنسی آزادی کا غیر فطری نظریہ جو غیر فطری مسائل پیدا کرتا ہے، مذکورہ واقعہ اس کی صرف ایک جزئی مثال ہے۔

ترقی کے بجائے تنزل

امریکی میگزین ٹائم کی اشاعت 29 دسمبر 1986 ایک اسپیشل نمبر تھی جس کو اس نے 2086 کے نام ایک (A Letter to the Year 2086) کا عنوان دیا تھا۔ اس شمارے میں مختلف پہلوؤں سے امریکا کا حال، آنے والی صدی کو بتایا گیا تھا۔ اس کا ایک جزء خاندان کے احوال کے بارے میں بھی تھا۔ اس میں جو احوال لکھے ہوئے تھے، اس کا ایک حصّہ یہ تھا:

"The American family, not 50 years ago the rock on which the country built its church, has fractured into

atoms with separate orbits. The American woman, having shunned motherhood and house-wifehood 15 years ago to establish herself in the labor market, now seeks to balance all three lives like dinner plates on sticks. The American man finds himself in new and scary territory and scrambles for adjustment. When the American man and woman part company, as half the newly married couples are expected to do these days, the American child is suddenly stranded, growing taller without a structure." (pp. 20-21)

پچاس سال پہلے امریکی خاندان ایک چٹان تھا جس پر ملک نے اپنا معبد تعمیر کیا تھا، اب وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ امریکی عورت نے مادری ذمہ داری اور گھر سنبھالنے کی ذمہ داری کو پندرہ سال پہلے چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ روزگار کے بازار میں اپنی جگہ بنا سکے۔ اب وہ ان تینوں ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے نازک کام کی کوشش کر رہی ہے۔ امریکا مرد اپنے آپ کو ایک نئی سخت دنیا میں پا رہا ہے اور بمشکل ہم آہنگی کی کوشش کر رہا ہے۔ جب امریکی مرد اور عورت ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں، جیسا کہ شادی شدہ جوڑوں کی نصف تعداد آج کل کرتی ہے، تو امریکی بچہ اپنے سرپرستوں سے محروم ہو کر ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی سہارے کے بغیر پروان چڑھ رہا ہے۔

بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر امریکا کا دانشور طبقہ اس بات کا اعتراف کر رہا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں امریکا نے جس چیز کو ترقی کا زینہ سمجھ کر اختیار کیا تھا، وہ اس کے لیے صرف بربادی کا زینہ ثابت ہوا ہے۔ عورت کو گھر سے باہر نکالنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکا کا خاندانی نظام بالکل منتشر ہو کر رہ گیا۔ مزید یہ کہ عورت کو "آزاد" کرانے کا خوش نما منصوبہ عملاً ازدواجی زندگی کو غیر مستحکم بنانے کا ذریعہ ثابت ہوا، اور اس کے

نتیجے میں بے شمار معاشرتی خرابیاں پیدا ہوگئیں۔

اب امریکا میں اس سابقہ فکر پر نظرثانی کا ذہن پیدا ہو رہا ہے۔ مگر جدید عورت چونکہ دوبارہ گھریلو عورت بننے کے لیے تیار نہیں ہے، اس لیے جو عورت نئی زندگی کو اختیار کرتی ہے اس کے حصہ میں صرف یہ آرہا ہے کہ وہ باہر کی ذمہ داریوں کے ساتھ گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھائے۔ کیسی عجیب ہے وہ ترقی جس کا نتیجہ بربادی کی صورت میں ظاہر ہو، کیسی عجیب ہے وہ آزادی جو عملاً غیر آزادی بن جائے۔

باب دوم

قرآن وحدیث

قرآن اور حدیث میں نہایت تفصیل کے ساتھ عورت کے متعلق احکام ہیں نیز عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کے بارے میں واضح تعلیمات درج ہیں۔ یہاں ان میں سے کچھ آیتیں اور حدیثیں مع ترجمہ نقل کی جاتی ہیں۔

آیات

- وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (4:19)۔ یعنی، اور عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو۔
- وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (2:228)۔ یعنی، اور عورتوں کے لیے بھی معروف طریقہ پر وہی ہے جو مردوں کے لیے ہے۔ اور مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور اللہ غالب ہے، حکیم ہے۔
- لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا (4:7)۔ یعنی، مردوں کے لیے اس میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا۔ اور عورتوں کے لیے اس میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا۔ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ مقرر ہے۔
- وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ

بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (30:21)۔ یعنی، اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔

- مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ (40:40)۔ یعنی، جس نے برا عمل کیا اس کو اسی کے بقدر بدلہ ملے گا۔ اور جس نے نیک عمل کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ تو ایسے لوگ جنّت میں داخل ہوں گے۔ وہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔
- وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا (4:124)۔ یعنی، اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔
- مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (16:97)۔ یعنی، اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو جِلائیں گے اچھا جلانا اور ان کو اجر دیں گے ان کے بہترین عمل کے مطابق جو وہ کرتے تھے۔
- وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (9:71)۔ یعنی، اور

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا۔ اللہ عزیز وحکیم ہے۔

- فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ (3:195)۔ یعنی، پس ان کے رب نے ان کو جواب دیا کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور وہ لڑے اور مارے گئے، ان کی خطائیں ضرور میں ان سے دور کر دوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کا بدلہ ہے اللہ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے۔

احادیث

- وما أكرَمَ النساءَ إلا كريمٌ، ولا أهانَهنَّ إلا لئيمٌ (الإيماء إلى زوائد الأمالي والأجزاء، حدیث نمبر 4399)۔ یعنی، عورتوں کی عزت وہی شخص کرے گا جو شریف ہو اور عورتوں کو وہی شخص بے عزت کرے گا جو کمینہ ہو۔
- خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي (سنن الترمذی، حدیث نمبر

3495)۔ یعنی، تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو۔ اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے اچھا ہوں۔

- لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1469)۔ یعنی، کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے اگر اس کی کوئی خصلت اس کو ناپسند ہوگی تو کوئی دوسری خصلت اس کی پسند کے مطابق ہوگی۔
- أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِنِسَائِهِمْ (سنن الترمذی، حدیث نمبر، 1142)۔ یعنی، مومنین میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے۔ اور تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے اچھا ہو۔

ایک حدیث میں اچھی عورت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قِيلَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ؟ قَالَ: الَّتِي تَسُرُّهُ إِذَا نَظَرَ، وَتُطِيعُهُ إِذَا أَمَرَ، وَلَا تُخَالِفُهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهَا بِمَا يَكْرَهُ (سنن نسائی، حدیث نمبر 3231)۔ یعنی، حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ سب سے بہتر عورتیں کون ہیں۔ فرمایا وہ عورت کہ مرد جب اسے دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے۔ اور مرد جب کسی کام کے لیے کہے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور اپنے نفس اور اپنے مال میں وہ مرد کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرے۔

عورت کو اسلام میں کتنا باعزت مقام دیا گیا ہے، اس کا اندازہ حسب ذیل روایات سے ہوتا ہے:

- عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الدُّنْيَا مَتَاعٌ. وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1467)۔ یعنی، دنیا کی ہر چیز سامان ہے۔ اور دنیا کا سب سے اچھا سرمایہ نیک عورت ہے۔

- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَلَا أُخْبِرُكَ بِخَيْرِ مَا يَكْنِزُ الْمَرْءُ: الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ إِذَا نَظَرَ إِلَيْهَا سَرَّتْهُ، وَإِذَا أَمَرَهَا أَطَاعَتْهُ، وَإِذَا غَابَ عَنْهَا حَفِظَتْهُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 1664)۔ یعنی، کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ آدمی کے لیے بہتر جمع کرنے والا مال کیا ہے۔ نیک عورت کہ جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے۔ اور جب وہ اس کو حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے۔ اور جب وہ موجود نہ ہو تو وہ اس کی حفاظت کرے۔

- عَنْ ثَوْبَانَ، قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ (9:34) قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ، فَقَالَ بَعْضُ أَصْحَابِهِ: أُنْزِلَتْ فِي الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، لَوْ عَلِمْنَا أَيُّ الْمَالِ خَيْرٌ فَنَتَّخِذَهُ؟ فَقَالَ: أَفْضَلُهُ لِسَانٌ ذَاكِرٌ، وَقَلْبٌ شَاكِرٌ، وَزَوْجَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُعِينُهُ عَلَى إِيمَانِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 22392؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 3094؛ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1856)۔ یعنی، قرآن میں جب یہ آیت اتری کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں ان کے لیے وعید ہے تو بعض صحابہ نے کہا کہ اگر ہم یہ جانتے کہ کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسی کو لیتے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے افضل چیز خدا کی یاد کرنے والی زبان

ہے۔ اور خدا کا شکر کرنے والا دل ہے۔ اور مومن بیوی ہے جو اس کے ایمان پر اس کی مدد کرے۔

- عَنْ أَبِي أُمَامَةَ، عَنِ النَّبِيِّ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: "مَا اسْتَفَادَ الْمُؤْمِنُ بَعْدَ تَقْوَى اللَّهِ، خَيْرًا لَهُ مِنْ زَوْجَةٍ صَالِحَةٍ، إِنْ أَمَرَهَا أَطَاعَتْهُ، وَإِنْ نَظَرَ إِلَيْهَا سَرَّتْهُ، وَإِنْ أَقْسَمَ عَلَيْهَا أَبَرَّتْهُ، وَإِنْ غَابَ عَنْهَا نَصَحَتْهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهِ" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1857)۔ یعنی، اللہ کے تقویٰ کے بعد سب سے بہتر چیز جو ایک مومن پاتا ہے وہ نیک بیوی ہے۔ اگر وہ اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے۔ اور اگر وہ اس پر قسم کھالے تو وہ اس کو پورا کرے اور اگر وہ اس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ اپنے نفس اور اس کے مال میں اس کی خیر خواہی کرے۔
- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "أَرْبَعٌ مَنْ أُعْطِيَهُنَّ فَقَدْ أُعْطِيَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ: قَلْبٌ شَاكِرٌ، وَلِسَانٌ ذَاكِرٌ، وَبَدَنٌ عَلَى الْبَلَاءِ صَابِرٌ، وَزَوْجَةٌ لَا تَبْغِيهِ خَوْنًا فِي نَفْسِهَا وَلَا مَالِهِ (سنن البیہقی، حدیث نمبر 717)۔ یعنی، چار چیزیں ہیں جن کو وہ دی گئیں تو اس کو دنیا اور آخرت کی تمام بھلائی دیدی گئی۔ شکر کرنے والا دل اور ذکر کرنے والی زبان اور مصیبتوں پر صبر کرنے والا بدن اور ایسی بیوی جس کے نفس اور اپنے مال میں اس کو کوئی ڈر نہ ہو۔
- قَالَ عُمَرُ: تَصَنَّعُوا لِلنِّسَاءِ فَإِنَّهُنَّ يُحِبِبْنَ مِنْكُمْ مَا تُحِبُّونَ مِنْهُنَّ۔ (المحاسن والاضداد للجاحظ، صفحہ 212)۔ یعنی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم لوگ

عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، کیوں کہ وہ بھی تم سے وہی چاہتی ہیں جو تم ان سے چاہتے ہو۔

- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3331)۔ یعنی، حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کروں کیوں کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھا اس کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو تو تم اس کو توڑ دو گے اور اگر تم اس کو چھوڑ دو تو وہ ویسی ہی رہے گی پس تم عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو۔

- إِنَّما حُبِّبَ إِلَيَّ مِن دُنياكُمُ النِّساءُ والطِّيبُ، وجُعِلَت قُرَّةُ عَينِي في الصَّلاةِ (سنن الکبری للبیہقی، حدیث نمبر 13583)۔ یعنی، مجھے تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے خوشبو اور عورتیں محبوب بنائی گئی ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

- إِنَّ النِّسَاءَ شَقَائِقُ الرِّجَالِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 113)۔ یعنی، عورتیں مردوں کی نصف ثانی ہیں۔

- خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1978)۔ یعنی، تم میں سب سے اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لیے اچھے ہیں۔

- اتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ (سنن ابو داود، حدیث نمبر 1905)۔ یعنی، عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔
- لَيْسَ مِنْ مَتَاعِ الدُّنْيَا شَيْءٌ أَفْضَلَ مِنَ الْمَرْأَةِ الصَّالِحَةِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1855)۔ یعنی، دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں۔
- الْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ (مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 119)۔ یعنی، جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔
- مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ فَأَدَّبَهُنَّ، وَزَوَّجَهُنَّ، وَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 5147)۔ جس شخص نے تین لڑکیوں کی پرورش کی۔ پھر ان کو ادب سکھایا اور ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔
- مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثَى فَلَمْ يَئِدْهَا، وَلَمْ يُهِنْهَا، وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا، - قَالَ: يَعْنِي الذُّكُورَ - أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ (سنن ابو داود، حدیث نمبر 5146)۔ یعنی، جس شخص کے یہاں لڑکی ہو۔ پھر وہ نہ اس کو زمین میں گاڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اس کو جنّت میں داخل کرے گا۔
- أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى أَفْضَلِ الصَّدَقَةِ؟ ابْنَتُكَ مَرْدُودَةً إِلَيْكَ، لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3667)۔ یعنی، کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ افضل صدقہ کیا ہے۔ تمہاری لڑکی جو (بیوگی یا طلاق کی وجہ سے) تمہاری طرف لوٹا دی جائے۔ تمہارے سوا کوئی اس کا کمانے والا نہ ہو۔

- مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هَذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1352)۔ یعنی، اللہ جس شخص کو ان لڑکیوں کے ذریعہ کچھ آزمائے پھر وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو وہ اس کے لیے آگ سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی۔

مومنہ کی صفات

مرد اور عورت کی باہمی حیثیت کو سمجھنے کے لیے قرآن کی اس آیت پر غور کیجیے:
أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ
(3:195)۔ یعنی، میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

اس آیت میں عورت اور مرد کے لیے بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ کا لفظ آیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا جزء ہو:

You are members, one of another.

یہ مرد اور عورت کی حیثیت کے بارے میں نہایت جامع بیان ہے۔ اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہنا ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں سماجی طور پر ایک دوسرے کے شریکِ عمل ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے برابر کے ساتھی ہیں۔ حیاتیاتی اعتبار سے اگرچہ دونوں کی صنف ایک دوسرے سے مختلف ہے، ایک صنف مذکر ہے، اور دوسری صنف مؤنث۔ مگر انسانی مرتبہ کے لحاظ سے دونوں بالکل یکساں ہیں۔ جو درجہ ایک کا ہے وہی درجہ دوسرے کا ہے۔ حقوق کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں۔

یہی بات حدیث میں ایک اور انداز سے واضح کی گئی ہے۔ ایک حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتیں مردوں کا شقیقہ ہیں: إِنَّمَا النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ (مسند احمد، حدیث نمبر 26195)۔ شَقَّ يَشُقُّ کے اصل معنی ہیں پھاڑنا۔ ایک لکڑی کو درمیان سے پھاڑا جائے تو وہ دو برابر حصے میں تقسیم ہوجائے گی۔ اس اعتبار سے شقیق کے

معنی ہوئے دو حصوں میں پھٹی ہوئی چیز کا آدھا حصہ۔ چنانچہ کسی چیز کے نصف کو شِق الشیئ کہتے ہیں۔ اسی سے مزید وسعت پا کر شقیق بمعنی بھائی اور شقیقہ بمعنی بہن بولا جانے لگا۔

اس تشریح کے مطابق مذکورہ حدیث کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ عورتیں مردوں کا نصف ثانی ہیں یا عورتیں مردوں کا دوسرا نصف ہیں۔ جدید تہذیب میں عورت کو نصف بہتر (better half) کہا گیا ہے۔ مگر یہ ایک ادبی تعبیر ہے، نہ کہ سائنسی تعبیر۔ حدیث کے مطابق، عورت مرد کا نصف ثانی ((second half) ہے، اور یہ یقیناً زیادہ صحیح اور سائنسی تعبیر ہے۔ اسی ایک لفظ سے عورت کے بارے میں اسلام کے پورے نقطۂ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب گویا حدیث کے اسی بیان کی تفصیل ہے۔

تقسیم کار کا اصول

اسلام نے سماجی زندگی میں دونوں صنفوں کے عمل کے درمیان ایک حد تک تقسیم کار کا اصول اختیار کیا ہے۔ مرد کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر باہر ہے اور عورت کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر اندر۔ اس تقسیم کا کوئی بھی تعلق امتیاز سے نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دونوں کی صنفی خصوصیات مجروح نہ ہوں۔ دونوں اپنی پیدائشی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لا سکیں، بغیر اس کے کہ خاندان یا سماج کے اندر کوئی رخنہ واقع ہو۔ بالفاظ دیگر، یہ فرق انتظام کی بنیاد پر ہے، نہ کہ اعزاز کی بنیاد پر۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں مغفرت کے لیے جو چیزیں درکار ہیں وہ عورتوں کے لیے بھی وہی ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ آخرت کی نجات کا مستحق بننے کے لیے عورتوں کو بھی وہی کرنا ہے جو مردوں کو کرنا ہے۔

دنیا میں زندگی کا انتظام چلانے کے لیے عورت اور مرد کے اندر حیاتیاتی فرق رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے بعض امور میں دونوں کے حدود کار ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے

ہیں۔ تاہم خدا کی رضا اور آخرت کی نجات حاصل کرنے کے لیے جو بنیادی شرط درکار ہے، وہ ایک صنف کے لیے بھی وہی ہے جو دوسری صنف کے لیے ہے۔

اسلام کا آغاز حقیقتاً خدا کی شعوری دریافت سے ہوتا ہے جس کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان اگر حقیقی ہو تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ مرد یا عورت خدا کے آگے جھک پڑتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کا اثاثہ خدا کے لیے وقف ہو جاتا ہے۔ خدا کی خاطر وہ صبر کرنے والے بن جاتے ہیں۔

وہ جھوٹ چھوڑ دیتے ہیں اور سچ بولنے والے بن جاتے ہیں۔ وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں سال کے ایک مہینہ میں کھانا پینا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات پر کنٹرول کرتے ہیں۔ اپنی عبدیت کا شعور اور خدا کی معرفت ان کا یہ حال کر دیتی ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر موقع پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

ایک آیت

یہی وہ چیزیں ہیں جو خدا کو ہر فرد کے اندر درکار ہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ قرآن میں یہ بات مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (33:35)۔ یعنی، بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر

کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں وہ تمام بنیادی صفات بتادی گئی ہیں جو اس مرد یا عورت میں ہونی چاہئیں جو اللہ کے یہاں اس کے مقبول بندوں میں شامل ہونا چاہے۔ وہ صفات یہ ہیں:

اسلام — پہلی چیز اسلام بتائی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا نفس اللہ کی اطاعت پر راضی ہوجائے۔ وہ اللہ کے احکام کی پیروی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔

ایمان — اس سے مراد وہ شعوری یافت ہے جب کہ آدمی خدا کو اپنے خالق اور معبود کی حیثیت سے پالے۔ جب آدمی کا فکر خدا کے فکر میں ڈھل جائے۔ جب آدمی اس یقین تک پہنچ جائے کہ سب سے بڑی حقیقت وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ انسان کے لیے ظاہر کی ہے۔

قنوت — یعنی مخلصانہ فرماں برداری۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کرلیا جائے جو خدا اور رسول نے بتایا ہے۔

صدق — اس سے مراد قول اور عمل کی مطابقت ہے۔ یعنی وہی کہنا جو آدمی کرنے والا ہو اور وہی کرنا جو اس نے اپنی زبان سے کہا ہے۔ لوگوں کے درمیان وہ ایک صاحب کردار انسان کی حیثیت سے زندگی گزارے۔

صبر — یعنی دین کے احکام پر چلنے کے لیے اگر تکلیفیں اٹھانی پڑیں تب بھی اس سے نہ

ہٹنا۔ نفس اور شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے دینی تقاضوں پر قائم رہنا۔ غیر خدائی محرکات کی بنا پر خدائی راستہ کو نہ چھوڑنا۔

خشوع — اس کا مفہوم تواضع اور خاکساری ہے۔ یہ کیفیت وہ ہے جو خدا کی بڑائی اور اس کے کامل اختیار کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے اوپر سب سے زیادہ جو چیز چھائی ہوئی ہوتی ہے وہ خدا کا خوف ہے۔ یہ احساس ان کو خدا کے آگے بالکل جھکا دیتا ہے۔ اور دوسرے انسانوں کے سامنے بھی ان کو متواضع اور مہربان بنا دیتا ہے۔

صدقہ — یعنی وہ اپنے مال میں سے بندوں کا حق ادا کرتے ہیں۔ جس طرح اپنی ضرورت کا احساس انھیں اپنے اوپر خرچ کرنے پر مجبور کرتا ہے اسی طرح وہ دوسرے حاجت مندوں کی امداد سے بھی بے پروا نہیں ہوتے۔

صوم — یعنی اللہ کے لیے روزہ رکھنا۔ روزہ رکھ کر آدمی اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جاتا ہے جب کہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی محتاجی کا تجربہ کرے اور پھر اس رزق پر خدا کا شکر ادا کرے جو خدا نے اس کو اپنے پاس سے عطا کیا ہے۔

حفظ فروج — یعنی عفت اور پاک دامنی کا طریقہ اختیار کرنا اور بے حیائی والے اعمال سے بچنا۔ حیا کا فطری پردہ جو خدا نے پیدا کیا ہے، اس کا پورا لحاظ رکھنا۔

ذکر اللہ — خدا کو بہت زیادہ یاد کرنا خدا کی حقیقی دریافت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو کوئی خدا کو حقیقی طور پر پالیتا ہے اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ہر موقع پر اس کو خدا یاد آتا ہے وہ دل اور زبان سے بار بار خدا کو یاد کرنے والا بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ سورہ التحریم (آیت 5) میں عورتوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اس میں تین مزید صفتوں کا ذکر ہے: توبہ، عبادت، سیاحت۔

توبہ — توبہ کے معنی ہیں لَوٹنا۔ یعنی غلطی کر کے پلٹ آنا۔ یہ مومن اور مومنہ کی نہایت

خاص صفت ہے۔ اس دنیا میں ایسے امتحانی اسباب رکھے گئے ہیں کہ آدمی سے بار بار غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر یہ ہونا چاہیے کہ نفس کے غلبہ سے آدمی وقتی طور پر غلطی کر جائے۔ تو اس کے بعد خدا کی پکڑ کا احساس اس پر طاری ہو اور وہ فوراً پلٹ کر خدا سے معافی مانگنے لگے۔ توبہ اپنے مقابلہ میں خدا کی عظمت کا اعتراف ہے۔ وہ اللہ کو بہت پسند ہے۔

عبادت — عبادت سے مراد وہ عمل ہے جو کسی کی فوق الفطری بڑائی کو مان کر اس کے سامنے کیا جائے۔ اسی کو پرستش کہتے ہیں۔ اس قسم کی پرستش اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ مومن اور مومنہ کی عبادت صرف خدا کے لیے ہوتی ہے۔

سیاحت — اس کی بہترین تشریح اس حدیث میں ملتی ہے جو ابوداؤد میں آئی ہے:

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ، أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، ائْذَنْ لِي فِي السِّيَاحَةِ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ سِيَاحَةَ أُمَّتِي الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ تَعَالَى (سنن ابو داود، حدیث نمبر 2486)۔ یعنی، حضرت ابوامامہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول مجھ کو سیاحت (درویشی) کی اجازت دیجیے آپ نے فرمایا: میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد (کوشش کرنا) ہے۔

سیاحت سے مراد اللہ کے راستہ کا وہ عمل ہے جس کی خاطر چلنا پھرنا پڑے۔ مثلاً علم دین حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا۔ دین کی خاطر ایک مقام کو چھوڑ کر دوسرے مقام کی طرف ہجرت کرنا۔ نصیحت کی غرض سے فطرت کے مناظر اور تاریخی عبرت کے مقامات کو دیکھنے کے لیے جانا۔ اللہ کے دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا، وغیرہ۔

امام راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات القرآن (صفحہ 431) میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کی رائے میں سائحون سے وہ لوگ مراد ہیں جو قرآن کی اس آیت کا مصداق ہیں: أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا (22:46)۔

یعنی، کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سمجھتے یا ان کے کان ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سنتے۔

اوپر جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ سب وہ ہیں جن کا تعلق کسی خاص صنف سے نہیں، ان کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ یہی چیزیں اسلام کی اصل ہیں اور یہی فلاح ونجات کا ذریعہ ہیں، عورتوں کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی۔

خواتین اسلام کی مثال

تاہم دین کے معاملہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے جس طرح مردوں کے دو درجے ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی دو درجے ہیں: ایک عام، دوسرا خاص۔

عام درجہ وہ ہے جو ہر خاتون کے لیے ہے۔ یعنی ذاتی معاملہ میں خدا اور بندوں کے حقوق ادا کرنا۔ خدا کے بارے میں عقیدہ کی درستگی۔ خدا کے احکام کی بجا آوری۔ زندگی کے معاملات میں انصاف پر قائم رہنا۔ نفسانی محرکات اور شیطانی وساوس کا مقابلہ کرنا۔ اپنی ذات اور اپنے مال سے خدا کا حق نکالنا۔ ہمیشہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو سامنے رکھنا۔ اپنے گھر اور اپنے متعلقین کے درمیان اسلامی اخلاق کے ساتھ رہنا۔ معاملات میں ہمیشہ وہ کرنا جو اسلام کا تقاضا ہے۔

عورت کا دوسرا اہم فرض اپنے بچوں کی اصلاح وتربیت ہے۔ ہر عورت بالآخر ماں بنتی ہے۔ بچہ سے ماں کا اور ماں سے بچہ کا بے حد گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق بگاڑ کا سبب بھی بن سکتا ہے اور بناؤ کا بھی۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے عورت کا فرض یہ ہے کہ وہ اس تعلق کو صرف بناؤ اور اصلاح کے لیے استعمال کرے۔

تیسری چیز جو ہر عورت کے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ اپنے شوہر کے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے مسئلہ نہ بنے۔ زندگی میں ”کیا کیا جائے“ سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ ”کیا نہ کیا جائے“۔ اس معاملہ میں عورتوں سے جذباتی ہونے کی بنا پر

کوتاہیاں ہوتی ہیں۔عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ اوراپنے گھر والوں کے ساتھ غیر ضروری قسم کے مسائل کھڑے کر دیتی ہیں۔ اس کی وجہ سے گھر کا سکون غارت ہو جاتا ہے۔ بظاہر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے گھر میں کچھ نہیں۔عورت اگر اتنا کرے کہ وہ گھر کے اندر مسئلہ نہ پیدا کرے تب بھی اس نے بہت بڑا کام کیا۔

اگرعورت کے اندر مزید صلاحیت ہواوراس کو وسیع تر مواقع حاصل ہوں تو وہ اس کے آگے کا کام بھی کرسکتی ہے جس کو ہم نے خصوصی درجہ کا نام دیا ہے۔اسلامی تاریخ میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ، حضرت عائشہ نہایت ذہین خاتون تھیں۔ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے بھر پور استفادہ کیا۔ غالباً ان کا حافظہ وہ تھا جس کو موجودہ زمانہ میں عکسی حافظہ (photographic memory) کہا جاتا ہے۔انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی باتوں کو اچھی طرح یاد رکھا۔ وہ چوں کہ رسول اللہ کے مقابلہ میں بہت کم عمر تھیں، اس لیے آپ کی وفات کے بعد تقریباً 50 سال تک زندہ رہیں۔ وہ امت کے لیے ایک زندہ ٹیپ ریکارڈر ثابت ہوئیں۔اور آپ کی وفات کے نصف صدی بعد تک آپ کی باتیں لوگوں کو سناتی رہیں۔عبداللہ ابن عباس صحابہ کے درمیان بہت بڑے عالم تھے۔ وہ حبر الامۃ کہے جاتے ہیں۔اور قرآن کی تفسیر میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ یہ عبداللہ بن عباس حضرت عائشہ کے شاگرد تھے۔انھوں نے علم دین زیادہ تر حضرت عائشہ سے سیکھا، اسی طرح بہت سے صحابہ وتابعین آپ سے علم دین سیکھتے رہے۔اس مثال میں ایک اسلامی خاتون علم دین میں مہارت پیدا کرکے لوگوں کی رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مہر کی مقدار کم ہوتی تھی۔ بعد کو جب فراخی کا

دور آیا تو لوگ مہر کی رقم زیادہ مقرر کرنے لگے۔ عمر فاروق اپنے زمانۂ خلافت میں ایک بار منبر پر آئے اور تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ چار سو درہم مہر پر کس نے زیادتی کی۔ رسول اللہ کا اور آپ کے اصحاب کا مہر آپس میں چار سو درہم یا اس سے کم ہوتا تھا۔ حضرت عمر نے مزید کہا کہ خبردار تم لوگ عورتوں کے مہر میں زیادتی مت کرو۔ جب بھی مجھے معلوم ہوگا کہ کسی نے رسول اللہ کے مہر سے زیادہ مہر باندھا ہے تو میں اس زیادتی کو ضبط کرکے بیت المال میں داخل کردوں گا۔

اس کے بعد مجمع کے گوشہ سے ایک عورت اٹھی۔ اس نے کہا کہ اے امیر المومنین، اللہ کی کتاب زیادہ اتباع کے قابل ہے یا آپ کا قول۔ حضرت عمر نے کہا کہ اللہ کی کتاب۔ عورت نے کہا کہ ابھی آپ نے لوگوں کو منع کیا ہے کہ وہ عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کریں۔ حالانکہ اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا (4:20)۔ یعنی، اور تم اس کو بہت سا مال دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا کہ ہر ایک عمر سے زیادہ عالم ہے (كُلُّ أَحَدٍ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ)۔ پھر انھوں نے اپنا حکم فوراً واپس لے لیا۔ (سنن سعید بن منصور، حدیث نمبر 598)۔ اس مثال میں ایک عورت دینی بات کا مجمع عام میں اعلان و اظہار کر رہی ہے۔

امام ابو جعفر طحاوی (229-321ھ) ایک مشہور محدث ہیں۔ ان کی کتاب طحاوی حدیث کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اور عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ امام طحاوی نے یہ کتاب اپنی بیٹی سے املا کرائی ہے۔ اس کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ باپ حدیث پڑھ کر سناتے اور اس کے مطالب بیان کرتے اور بیٹی ان کے پاس بیٹھی ہوئی لکھتی جاتی۔ اس طرح پوری کتاب تیار ہوگئی — اس مثال میں عورت دین کے معاملہ میں اپنے محرم رشتہ دار کی معاونت کر رہی ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے، کہاں تک آگے جا سکتی ہے۔

عورت کا احترام

اسلام کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ اللہ کا خوف اور انسانوں کا احترام۔ اس کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (4:1)۔ یعنی، اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو۔ جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی (کی جنس) سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیے۔ اور تم اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو۔ اور قرابتوں کے باب میں بھی۔ بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے۔

اس آیت میں وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (خدا نے اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا) کا مطلب بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، اور اس کے بعد ان کے جسم سے ان کی ایک پسلی نکال کر ان کی بیوی حوا کو بنایا۔ مگر یہ تشریح صحیح نہیں۔ یہ بائبل کی بات ہے، نہ کہ قرآن کی بات۔

بائبل میں حضرت حوا کی پیدائش کے بارے میں اسی قسم کی روایت آئی ہے۔ یہاں ہم بائبل کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا۔ اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا۔ اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی۔ ایک عورت بنا کر اسے آدم

کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس لیے وہ ناری کہلائے گی کیوں کہ وہ نر سے نکالی گئی ہے۔ (پیدائش، 23-2:21)

بائبل کی یہی روایت ہے جس کو بعد کے کچھ لوگوں نے قرآن کی تفسیر میں داخل کر دیا۔ اور اس کی روشنی میں قرآنی آیت کی تشریح کرنے لگے۔ مگر یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بائبل ایک محرف کتاب ہے۔ اس میں پیغمبروں کے کلام کے ساتھ عام انسانی کلام کی آمیزش ہوئی ہے، اس لیے اس کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس کی روشنی میں قرآنی آیت کی تشریح کرنا درست ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت یا کسی بھی دوسری آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں جو لفظ ہے وہ منہا (اس سے) ہے، نہ کہ من ضلع ادم (آدم کی پسلی سے)۔ چنانچہ محقق مفسرین نے منہا سے مراد من جنسہا لیا ہے۔ یعنی نفس واحدہ (آدم) کی جنس سے، نہ یہ کہ خود آدم کے اپنے جسم سے۔ ابو مسلم اصفہانی اور بعض دوسرے مفسرین سے یہی قول نقل ہوا ہے اور یہی قرآنی الفاظ کے مطابق ہے۔ وَالْقَوْلُ الثَّانِي: وَهُوَ اخْتِيَارُ أَبِي مُسْلِمٍ الْأَصْفَهَانِيِّ: أَنَّ الْمُرَادَ مِنْ قَوْلِهِ: وَخَلَقَ مِنْهازَوْجَهاأَيْ مِنْ جِنْسِهَا۔ (تفسیر الرازی، ج9، ص 478)

وَيَحْتَمِلُ أَنْ يَكُونَ الْمَعْنَى مِنْ جِنْسِهِ لَا مِنْ نَفْسِهِ حَقِيقَةً (البحر المحیط)

منہا کو من جنسہا کے معنی میں لینے کی تائید بعض دوسری آیتوں سے ہوتی ہے۔ قرآن میں نفس کا لفظ بار بار جنس کے معنی میں آیا ہے۔ اس طرح یہ دوسری آیتیں سورہ نساء کی مذکورہ آیت کی نہایت واضح تشریح کر رہی ہیں۔ یہاں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (16:72)۔ یعنی، اور اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا (30:21) ۔یعنی، اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں بنائیں تا کہ تم سکون حاصل کرو۔

فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا (42:11) ۔یعنی، وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے اور اسی طرح مویشیوں میں سے بھی جوڑے بنائے۔

ان آیتوں پر غور کیجئے۔ ان میں عام مردوں کی ازواج (بیویوں) کے لیے بھی عین وہی لفظ آیا ہے جو سورہ نساء کی آیت میں حضرت آدم کی زوج (بیوی) کے لیے آیا ہے۔ اس کے مطابق حوا کو جس طرح آدم کی ''نفس'' سے پیدا کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے تمام مردوں کی بابت بھی ارشاد ہوا ہے کہ ان کی بیویوں کو ان کے ''انفس'' سے پیدا کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دوسری آیتوں کے یہ معنی نہیں لیے جا سکتے کہ ہر مرد کی بیوی اس کے اپنے جسم کے اندر سے نکالی گئی ہے۔ یہاں لازمی طور اس کو جنس کے معنی میں لینا ہوگا۔ یعنی یہ کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے تمہاری عورتیں بنائیں تا کہ وہ تمہارے لیے حقیقی معنی میں رفیق زندگی بن سکیں۔

جس طرح عام آدمیوں کی بیویاں ان کی ہم جنس ہیں، نہ کی حیاتیاتی معنوں میں ان کے جسم کا حصّہ۔ اسی طرح حضرت آدم کی بیوی (حوا) بھی ان کی ہم جنس تھیں، وہ آدم کے جسم کے اندر سے نکالی نہیں گئیں۔ اللہ نے آدم کی طرح ان کی بیوی کو بھی اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ جس طرح اس نے عام مردوں کی طرح ان کی عورتوں کو اپنی قدرتِ خاص سے پیدا فرمایا ہے۔

احادیث

اب ایک سوال ان احادیث کا ہے جو اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہیں اور جن میں صراحۃً ضلع (پسلی) کا لفظ آیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ان احادیث میں آدم وحوا کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ وہ عام عورتوں کے بارے میں ہیں۔ یعنی ان احادیث میں ہر ہر عورت کی تخلیق نوعیت کا ذکر ہے، نہ کہ مخصوص طور پر حضرت حوا کی تخلیقی نوعیت کا ذکر۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر 19272)۔ یعنی، عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو۔ کیوں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ عورت واقعتاً پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ کیوں کہ پورے فقرہ کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ حدیث کا مدعا عورتوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید کرنا ہے۔ اس لیے اس کی وہی تشریح درست ہوگی جو اس اصل مدعا کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

"عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں" کا فقرہ یہاں مجازی معنوں میں ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا معاملہ پسلی جیسا معاملہ ہے۔ وہ پسلی کی مانند ہیں۔ چنانچہ خود دوسری روایت میں یہ صراحت موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْمَرْأَةُ كَالضِّلَعِ، إِنْ أَقَمْتَهَا كَسَرْتَهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5184؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1468)۔ یعنی، حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت پسلی کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کروگے تو تم اس کو توڑ دوگے۔

بخاری و مسلم کی اس روایت میں واضح طور پر کا لضلع کا لفظ ہے۔ یعنی یہ کہ عورت پسلی کی مانند ہے، نہ یہ کہ وہ خود پسلی سے بنائی گئی ہے۔ پسلی کی مانند ہونے کا مطلب کیا ہے، یہ بھی صراحتاً حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو تم اس کو توڑ دو گے۔

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے'' اور ''عورت پسلی کی مانند ہے'' دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ صرف ادبی اسلوب کا فرق ہے، نہ کہ حقیقت کا فرق۔ ہر زبان میں یہ اسلوب عام ہے کہ جب تشبیہ میں شدت پیدا کرنا مقصود ہو تو ''مثل'' کا لفظ حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کی بہادری بتانے کے لیے کبھی کہا جاتا ہے کہ وہ شیر کی طرح ہے۔ اور جب اس بات کو زیادہ زور دے کر کہنا ہو تو کہہ دیتے ہیں کہ ''وہ شیر ہے''۔ جیسے میر انیس نے کربلا کے میدان کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

عورت کے بارے میں نفسیات اور حیاتیات کا علم بتاتا ہے کہ وہ ''صنف نازک'' ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں کمزور اور نازک ہوتی ہے۔ اس کے مزاج انفعالیت ہے۔ چنانچہ کسی واقعہ سے وہ بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو ہر آدمی جانتا ہے خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا لکھا۔ ہر باپ جانتا ہے کہ بیٹے سے سختی کی جاسکتی ہے مگر بیٹی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ وہ شدت کا تحمل نہیں کرسکتی۔ چنانچہ خودکشی کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ خودکشی کرتی ہیں، وہ ایک معمولی واقعے سے متاثر ہو کر خودکشی کرسکتی ہیں یا ذہنی اختلال کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہی وہ معلوم حقیقت ہے جس کو حدیث میں تمثیل کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ آدمی کے سینے میں پسلی کی ہڈیاں کسی قدر خم دار ہوتی ہیں۔ ان کا خم دار رہنا ہی مصلحت کے مطابق ہے۔

کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں کرتا کہ آپریشن کے ذریعہ ان پسلیوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔

اسی معلوم واقعہ کی مثال دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ ان کی فطرت کے مطابق پیش آؤ۔ عورتوں سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ یہ ذہن میں رکھو کہ عورتیں فطری طور پر نازک اور جذباتی ہوتی ہیں۔ اللہ نے مخصوص مصالح کے تحت انھیں بالا رادہ ایسا ہی بنایا ہے اس لیے تم ان کے ساتھ ہمیشہ نرم برتاؤ کرو۔ کوئی بات بتانا ہو تو نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بتاؤ۔ اگر تم ان کے ساتھ سختی کروگے تو ان کی شخصیت اس کا تحمل نہ کر سکے گی۔ ان کا دل اسی طرح ٹوٹ جائے گا جس طرح پسلی سیدھا کرنے میں ٹوٹ جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار سفر میں تھے۔ کچھ خواتین اونٹ پر بیٹھی ہوئی چل رہی تھیں ساربان نے اونٹ کو زیادہ تیز چلانا چاہا۔ اونٹ جب تیز چلتا ہے تو مسافر کا جسم کافی ہلنے لگتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساربان (حضرت انجشہ) کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: رُوَیْدَکَ یَا أَنْجَشَۃُ رِفْقًا بِالْقَوَارِیرِ (اے انجشہ، یہ آبگینے ہیں، ذرا آہستہ چلو) صحیح البخاری، حدیث نمبر 6161؛ الحاوی الکبیر للماوردی، جلد 17، صفحہ 195۔

جدید تحقیقات

موجودہ زمانہ میں خالص علمی طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان بنیادی پیدائشی فرق پائے جاتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984) میں خواتین کی حالت (status of women) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس مقالہ کا ایک ذیلی عنوان یہ ہے:

“Scientific Studies of Male-Female Differences”

(مرد اور عورت کے فرق کا علمی مطالعہ) مقالہ کے اس حصہ میں مقالہ نگار نے دکھایا ہے کہ جدید تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیان عین پیدائشی بناوٹ کے

اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> "With respect to personality traits," he writes, "men are characterized by greater aggressiveness, dominance and achievement motivation, women by greater dependency, a stronger social orientation, and the tendency to be more easily discouraged by failure than men."
>
> (*Encyclopedia Britannica*, 19/907)

اوصافِ شخصیت کے اعتبار سے، آدمیوں کے اندر جارحیت اور غلبہ کی خصوصیت زیادہ پائی گئی ہے۔ ان میں حاصل کرنے کا جذبہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔اس کے مقابلہ میں عورتیں سہارا چاہتی ہیں۔ان کے اندر معاشرہ پسندی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔اور ناکامی کی صورت میں مردوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ آسانی سے بے ہمت ہو جاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ میں بے شمار تجربات کیے گئے ہیں۔ مثلاً امریکا میں ایک تجربہ کیا گیا کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کا انتخاب کیا گیا۔ دونوں کم عمر تھے۔اور ابھی بولنے کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔تاہم ان کی جسمانی صحت یکساں تھی۔ان کو دو الگ الگ کٹہرے میں رکھ کر نکلنے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔اس کے بعد لڑکی رونے چلانے لگی، جب کہ لڑکے نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اندازہ کرنا شروع کیا کہ کیا کسی طرف سے وہ نکلنے کا راستہ پا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک تجربہ میں پایا گیا کہ بارہ ماہ کی لڑکیاں کسی اجنبی کمرہ میں ہوں اور انھیں خوفزدہ کیا جائے تو وہ اپنی ماؤں کی طرف بھاگتی ہیں جب کہ اسی عمر کے لڑکے کچھ کرنے کی راہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ نیویارک یونیورسٹی میں ریسرچ کرنے والوں نے دیکھا کہ لڑکی اگر بوتل پینے میں مشغول ہے تو وہ اس وقت پینے سے رک جاتی ہے جب کہ کوئی شخص کمرے میں آتا ہوا نظر آئے۔اس کے برعکس، ایک لڑکا کسی آنے والے پر کوئی دھیان نہیں دیتا وہ اپنا کام بدستور جاری رکھتا ہے۔

ماہرین نے بتایا ہے کہ عورت اور مرد کے تمام فرق ان کے جین کے اندر پائے جاتے ہیں، نہ کہ سماجی حالات میں۔ عورتوں کے اندر انفعالیت کا سبب ان کے مخصوص ہارمون ہیں۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون میں یہ فرق پیدائش کے بالکل آغاز سے موجود رہتا ہے۔ (ٹائم میگزین، نیویارک، 20 مارچ 1972)

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے تمام احکام فطری حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فطری تقاضوں کو قانونی صورت دینے ہی کا دوسرا نام شریعت ہے۔ عورت کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بھی اسی بنیادی اصول پر مبنی ہیں۔ نفسیات اور حیاتیات اور عضویات میں موجودہ زمانہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ مرد کے مقابلہ میں عورتیں فطری طور پر منفعل مزاج ہوتی ہیں۔ مخصوص معاشرتی مصالح کی بنا پر خالق نے اس کو نسبتاً نازک پیدا کیا ہے۔

یہی وہ فطری حقیقت ہے جس کی رعایت اسلامی تعلیمات میں رکھی گئی ہے۔ اس بنا پر اسلامی شریعت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو تا کہ وہ بے حوصلہ نہ ہوں، تا کہ وہ دل شکنی سے محفوظ رہیں اور زندگی میں اپنے مخصوص فرائض کو بخوبی طور پر ادا کرسکیں۔ عورتیں لوہے کی مانند نہیں ہیں کہ ان پر ٹھونک پیٹ کا کوئی اثر نہ پڑے، وہ پسلی کی مانند ہیں۔ وہ فطرتاً جیسی ہیں ویسی ہی انھیں رہنے دو۔ اگر تم ان کے ساتھ لوہے جیسا برتاؤ کرو گے تو تم ان کی شخصیت کو توڑ دو گے۔

چیف جسٹس کا ریمارک

محمد احمد - شاہ بانو کیس (کریمنل اپیل نمبر 103۔ 1981۔ مورخہ 23 اپریل 1985) میں فیصلہ دیتے ہوئے سپریم کورٹ کے چیف، جسٹس وائی۔ وی۔ چندرا چوڑ نے ایک خصوصی نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں وہ کہتے ہیں کہ عام دیوانی اور فوجداری قانون کے

تحت کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں یہ سماج کے ایک بڑے حصہ کے لیے دوررس اہمیت کے حامل ہیں جو کہ روایتی طور پر غیر منصفانہ سلوک کا شکار رہا ہے۔عورتیں اسی قسم کا ایک حصہ ہیں۔قانون ساز منو نے کہا کہ عورت آزادی کی مستحق نہیں ہے۔اور اسلام پر یہ الزام ہے کہ اس کا ایک تباہ کن پہلو عورت کو کمتر درجہ دینا ہے۔پیغمبر اسلام کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے، امید افزا طور پر غلطی سے، کہ عورت ایک ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی۔اس لیے تم اپنی بیویوں سے نرم سلوک کرو:

> Some questions which arise under the ordinary civil and criminal law are of a far-reaching significance to large segments of society which have been traditionally subjected to unjust treatment. Women are one such segment. "Na stree swatantramarhati" (The woman does not deserve independence), said Manu, the law giver. And, it is alleged that the "fatal point in Islam is the degradation of woman." To the Prophet is ascribed the statement, hopefully wrongly, that "woman was made from a crooked rib, and if you try to bend it straight, it will break; therefore treat your wives kindly."

واضح ہو کہ چیف جسٹس صاحب کی مذکورہ عبارت میں "امید افزا طور پر غلطی سے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موصوف کے نزدیک پیغمبر کی طرف اس قول کو منسوب کرنا غلط ہے۔ ان کا مطلب یہ کہ پیغمبر نے اگرچہ یہ کہا ہے کہ عورت "ٹیڑھی پسلی" سے پیدا کی گئی ہے۔مگر جو لوگ عورت اور مرد کے درمیان برابری قائم کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ہمارے لیے امید کا پہلو یہ ہے کہ پیغمبر کا یہ ارشاد بطور واقعہ درست نہیں۔ چیف جسٹس کے اس فقرہ کا مقصد "بیان" کی تردید ہے، نہ کہ خود "انتساب" کی تردید۔

ایک چیف جسٹس کا یہ ریمارک خالص قانونی اعتبار سے کس حد تک باموقع ہے، اس کے بارے میں کوئی قانون داں ہی قطعی رائے دے سکتا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ خالص علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

چیف جسٹس صاحب نے پیغمبر اسلام کا یہ قول اس دعویٰ کی تائید میں پیش کیا ہے کہ اسلام سماج کے ایک طبقہ (عورت) کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کی حمایت کرتا ہے۔ حالاں کہ مذکورہ قول اس کے برعکس، عورت کے ساتھ منصفانہ سلوک کی تاکید کر رہا ہے۔ محترم چیف جسٹس کا ریماک منو کے قول کے لیے تو ضرور درست ہے۔ مگر وہ پیغمبر اسلام کے قول پر بالکل صادق نہیں آتا۔

مذکورہ قولِ رسول میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ عورت کے ساتھ نرمی (خیر) کا سلوک کرو۔ پھر اس حدیث کے بارے میں کس طرح یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک یا کمتر درجہ کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی گئی ہے (جیسا کہ منو کے حوالے میں پایا جاتا ہے)۔

جہاں تک عورت کے پسلی کی مانند ہونے کا تعلق ہے، وہ عورت کے ساتھ بہتر سلوک کی توجیہ کے طور پر ہے، نہ کہ بہتر سلوک کی تردید کے طور پر۔ اس کے بارے میں اوپر یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ یہ محض ایک مثال ہے۔ عورت کی مخصوص نفسیات کی بنا پر اس کے معاملہ کو پسلی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس سے نرم سلوک کرو۔ اگر تم عورت کے ساتھ سخت سلوک کرو گے تو یہ عورت کی فطرت کے مطابق نہ ہوگا، اس سے بگاڑ پیدا ہوگا، نہ کہ اصلاح۔

خلاصہ

سورہ نساء کی آیت (وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس جنس سے آدم کو بنایا، اسی جنس سے اس نے آدم کے جوڑے (حوا) کو بھی بنایا تاکہ دونوں میں

موافقت رہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ دونوں دو الگ الگ جنس ہوتے، مثلاً ایک آگ سے بنا یا جاتا اور دوسرا مٹی سے، تو دونوں کے درمیان باہمی توافق نہ ہوتا۔ پھر نہ خاندانی زندگی میں سکون پایا جاتا اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ دونوں مل کر مشترکہ جدو جہد سے تمدن کی تعمیر کریں۔

حدیث ”ضِلَع“ میں عورتوں کے بارے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا مقصد تمثیل کی زبان میں یہ بتانا ہے کہ عورتوں کی مخصوص فطری ساخت کی بنا پر ضروری ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار مختلف انداز سے یہ نصیحت فرمائی ہے اور خود اپنی پوری زندگی میں اس کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں رات کی نمازوں میں شریک ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ نماز کی اقامت کا بہت خاص اہتمام فرماتے تھے، لیکن خواتین کے ساتھ آپ کی رعایت کا یہ حال تھا کہ نماز میں اگر کبھی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو آپ نماز کو جلد ختم کر دیتے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

إِنِّي لَأَقُومُ فِي الصَّلَاةِ، أُرِيدُ أَنْ أُطَوِّلَ فِيهَا، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي كَرَاهِيَةَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمِّهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 707)۔

یعنی، میں مسجد میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، یہ چاہتا ہوں کہ اس کو لمبا کروں، پھر میں بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، اندیشہ کی بنا پر کہ میں اس کی ماں کو تکلیف دوں گا۔

حدیثِ رسول میں عورت کو پسلی (ضِلَع) سے تشبیہ دینا ایک سادہ سی بات ہے۔ اس معاملہ میں جو شبہات پیدا ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ حدیث کو بائبل کے بیان سے جوڑ دیا گیا۔ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا بائبل کے بیان سے کوئی تعلق نہیں۔ حدیث میں جو بات

کہی گئی ہے وہ ایک فطری حقیقت ہے جس کو دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مثلاً میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا کہ عورت پر دل کی دلیل کام کرتی ہے، نہ کی دماغ کی:

"With women the heart argues, not the mind."

خط و کتابت

اوپر ہم نے وہ ریمارک نقل کیا ہے جو ہندستانی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر وائی وی چندراچوڑ نے اس معاملہ میں محمد احمد - شاہ بانو کیس پر فیصلہ صادر کرتے ہوئے دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم نے سابق چیف جسٹس صاحب کو ایک خط روانہ کیا تھا۔ اس خط کو یہاں نقل کیا جارہا ہے:

المرکز الاسلامی

THE ISLAMIC CENTRE

Mr. Y. V. Chandrachud — May 14, 1986
Ex-Chief Justice
A-503, Som Vihar
R. K. Puram
New Delhi - 110 022

Dear Mr. Chandrachud,

I am taking the liberty of addressing myself to you because on going through your verdict on the Muhammad Ahmed-Shah Bano case. I find that one of the statements you make casts unfair aspersions on Islam. You allege that women have been 'traditionally' subjecteed to unjust treatment, and that the 'fatal point in

Islam is the degradation of woman'. To support this, you quote Menu as having stated that woman did not "deserve independence", and the Prophet of Islam as having said, "Woman was made from a crooked rib, and if you try to bend it straight it will break; therefore, treat your wives kindly."

While Manu's statement bears out your statement, I must point out that you have badly misquoted the Prophet. Nowhere in the Hadith is it stated that woman was made from a crooked rib, this being an ancient. Biblical version of God's creation of human life. The word 'rib' was used by the Prophet in a purely metaphorical sense and his actual words were: "Woman is like a rib, if you try to straightem her out, it will break, so treat her kindly."

The Encyclopoaedia Brittanica states: "With respect to personality traits, man are characterized by greater aggressiveness, dominace and achievement, motivation, women by greater dependency, stronger social orientation and the tendency to be more easily discouraged by failure than men (19/907)".

Presumably the Prophet, with his great understanding of human nature had a fine intuitive grasp of the fundamental biological and psychological differences between men and women particularly the latters' fragility and passivity and, for this reason, found it necessary to admonish lesser men to treat wives kindly.

I fail to see how "the degradation of women" can ensue from such an injunction.

It would only be fitting, to say the least, if you were now to contract, or amend, your statement, now that this point has been clarified.

I remain,
Yours faithfully

Wahiduddin Khan
President

C-29 Nizamuddin West, New Delh-110013 (India)
Telephone : 611128

جیسا کہ پچھلی بحث سے واضح ہے۔ چیف جسٹس صاحب کا یہ ریمارک خالص علمی اعتبار سے سراسر بے بنیاد ہے۔ مگر اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ موصوف کو جب بذریعہ خط توجہ دلائی گئی تو انھوں نے اس کا جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرلی۔ پہلی بار یہ خط انھیں 17 اپریل 1986 کو بذریعہ رجسٹری روانہ کیا گیا تھا۔ جب کوئی جواب موصول نہ ہوا تو دوبارہ یہی خط 14 مئی 1986 کو انھیں بھیجا گیا۔ پھر بھی انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بار بار ٹیلی فون کرنے کے بعد بھی کوئی کامیابی نہ ہوسکی۔ ٹیلی فون پر ان سے کہا گیا کہ آپ ملاقات کا وقت دیدیں تاکہ ہم خود گفتگو کے لیے آپ کے یہاں حاضر ہوسکیں۔ مگر انھوں نے ملاقات کا وقت دینے سے معذوری ظاہر کی۔ مجبوراً اب یہ خط اس طرح شائع کیا جارہا ہے کہ اس کے ساتھ جسٹس موصوف کا جواب شامل نہیں۔

دوسروں پر حکم لگانے کے لیے ہر آدمی باانصاف ہے۔ مگر جب خود اپنے آپ پر حکم لگانا ہو تو ہر آدمی بے انصاف بن جاتا ہے۔

عورت کا درجہ

عورت کا درجہ اسلام میں وہی ہے جو مرد کا درجہ ہے (بَعۡضُکُمۡ مِنۡ بَعۡضٍ) آل عمران، 3:195۔ حیثیت اور حقوق اور آخرت کے انعامات میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ اسلام کے نزدیک مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ زندگی کا نظام چلانے میں دونوں برابر کے شریک ہیں تاہم اسلام نے دونوں کے درمیان تقسیم کار کا اصول رکھا ہے، نہ کہ یکسانیتِ کار کا اصول۔

اسلام اس کو پسند نہیں کرتا کہ دونوں میں سے کوئی صنف اپنے کو کم سمجھے اور ایک دوسرے کی نقل کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

لَعَنَ الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ، وَلَعَنَ الْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2784)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مردوں پر لعنت کی ہے جو عورتوں کے مشابہ بنیں، اور ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے جو مردوں کے مشابہ بنیں

انسانیت کو مرد اور عورت کی صنفی تقسیم کے ساتھ پیدا کرنا براہِ راست خالق کی منصوبہ بندی ہے۔ اس تقسیم کو باقی رکھنے ہی میں انسانی زندگی کی ترقی ہے۔ جو مرد یا عورت اس تقسیم کو توڑنے کی کوشش کرے وہ گویا نظامِ فطرت کو توڑتا ہے۔ نظامِ فطرت کو توڑنا صرف تخریب ہے، وہ کسی درجہ میں بھی تعمیر کا کام نہیں۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت ایک دوسرے کا مثنیٰ (duplicates) نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک دوسرے کا تکملہ (complements) ہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ جو مرد ہے وہی عورت ہے اور جو عورت ہے وہی مرد ہے۔ بلکہ دونوں میں ناقابلِ عبور قسم کے حیاتیاتی فرق

پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق تقسیم کار کی حکمت پر مبنی ہیں۔ وہ اس اعتبار سے ہیں کہ مرد کی کمی کی تلافی عورت کرے اور عورت کے اندر جو کمی ہے وہ مرد کے ذریعہ پوری ہو۔

مرد اور عورت کے بارے میں اسلام کا تصور دونوں صنفوں کی فطری ساخت میں ثابت شدہ فرق پر مبنی ہے۔ یہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے کہ مرد اور عورت کی ساخت میں فرق ہے۔ مرد اپنی پیدائشی ساخت کے اعتبار سے "باہر" کے کام کے لیے موزوں ہے۔ اور عورت اپنی پیدائشی ساخت کے اعتبار سے "اندر" کے کام کے لیے موزوں ہے۔ اسی فرق اور تقسیم پر اسلام کے تمام قوانین بنائے گئے ہیں۔ مرد اور عورت کے معاشرتی مقام کے بارے میں اسلام کی تعلیمات تقسیم عمل کے اصول پر مبنی ہیں، نہ کہ اشتراکِ عمل کے اصول پر۔

عہدِ زندگی

قرآن میں نکاح کے معاملہ کو میثاق غلیظ (4:21) کہا گیا ہے، یعنی مضبوط عہد (firm contract)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نکاح کی صورت میں مرد اور عورت کے درمیان جو رشتہ قائم ہوتا ہے اس کی حیثیت اسلام میں کیا ہے۔ یہ حقوق اور ذمہ داریوں کا ایک دوطرفہ معاہدہ ہے اس کے ذریعہ سے ایک مرد اور عورت اپنے آپ کو ساری عمر کے لیے ایک بے حد سنجیدہ رشتہ میں جوڑتے ہیں تاکہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق بنیں۔ دونوں مل کر زندگی کے سفر کو طے کریں۔

معاہدہ ہمیشہ دوطرفہ بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کا معاہدہ بھی دوطرفہ بنیادوں پر قائم ہے۔ امام ترمذی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگاہ، تمہاری عورتوں کے اوپر تمہارا حق ہے اور تمہارے اوپر تمہاری عورتوں کا حق ہے: أَلَا إِنَّ لَكُمْ عَلَى نِسَاءِكُمْ حَقًّا، وَلِنِسَائِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1163)

اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے یہاں چند آیتیں اور حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

ہر حال میں خیر ہے

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (سورہ النساء، 4:19)۔ یعنی، اور تم عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزران کرو۔ اگر وہ تم کو پسند نہ ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو اور اللہ نے اس کے اندر بہت زیادہ بھلائی رکھ دی ہو۔

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں۔ ایک عورت اگر ایک اعتبار سے زیادہ ہے تو وہ دوسرے اعتبار سے کم ہوگی۔ اور اگر وہ کسی اعتبار سے کم ہے تو وہ کسی اور اعتبار سے زیادہ ہوگی۔ اس لیے کسی عورت کی صرف کمی کو دیکھ کر اس سے بیزار نہ ہو جاؤ، بلکہ اس کے روشن پہلو کو دیکھ کر اس کے ساتھ اچھی طرح نباہ کرو۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا اصل راز ہے۔ باہر کی دنیا میں بھی وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو گھر کی دنیا میں اس تجربہ سے سبق لے سکے۔ زندگی کی کامیابی ”تاریکی“ میں ”روشنی“ دیکھنے کا نام ہے، اور یہ اہم سبق ہر آدمی کو اس کے گھر سے سکھایا جاتا ہے۔

عورت مرد سے زیادہ قابلِ احترام

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أَبُوكَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5971)۔ یعنی، حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں کون ہے جو سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق

ہے۔ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ پھر کون۔ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ پھر کون۔ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ پھر کون۔ آپ نے فرمایا: تمہارا باپ۔

ماں کی صورت میں عورت کو سب سے زیادہ قابلِ احترام بنا نا بتاتا ہے کہ اسلام کس قسم کا معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام کے نزدیک سب سے زیادہ بہتر معاشرہ وہ ہے جس میں عورت کو سب سے زیادہ عزت اور احترام کا مقام حاصل ہو۔ جو شخص "ماں" کے روپ میں ایک خاتون کا سب سے زیادہ لحاظ کرے اس کے اندر لازمی طور پر یہ مزاج بنے گا کہ وہ دوسری خواتین کا بھی سب سے زیادہ لحاظ کرے۔ اس طرح پورے معاشرہ میں عورت کو وہ مقام مل جائے گا جو گھر کے اندر ایک ماں کو ملا ہوا ہے۔

اظہارِ خیال کی آزادی

خلیفہ ثانی عمر فاروق منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں سے کہا: عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ السُّلَمِيِّ، قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: لَا تُغَالُوا فِي مُهُورِ النِّسَاءِ، فَقَالَتِ امْرَأَةٌ: لَيْسَ ذَلِكَ لَكَ يَا عُمَرُ، إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ: وَإِنْ آتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا (4:20)۔ وزاد في رواية، فَقَالَ عُمَرُ: امْرَأَةٌ أَصَابَتْ وَرَجُلٌ أَخْطَأَ (مسند الفاروق لابن كثير، حديث نمبر 810)۔ یعنی، تم لوگ عورتوں کے زیادہ مہر نہ باندھو۔ اس کے بعد ایک عورت اٹھی اور اس نے بلند آواز سے کہا کہ اے عمر اس معاملہ میں آپ کو دخل دینے کا حق نہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے عورتوں کو زیادہ مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو (4:20)۔ یہ سن کر حضرت عمر نے اپنی بات واپس لے لی اور کہا: عورت نے صحیح بات کہی اور عمر نے غلطی کی۔

حضرت عمر فاروق اپنے وقت کے حکمراں تھے۔ ان کو ایک عام عورت نے برسرِ عام ٹوک دیا۔ اور حکمراں کو اپنی بات واپس لینی پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اسلامی

معاشرہ میں عورت کو کس قدر زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ حقوق کا آخری درجہ ہے کہ کسی کو اظہار رائے کا مطلق اختیار حاصل ہو اور اسلامی معاشرہ میں ایک عورت کو یہ بات پوری طرح حاصل ہوتی ہے۔

گھر سنبھالنا کم تر درجہ کا کام نہیں

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيدَ الْأَنْصَارِيَّةِ، أَنَّهَا أَتَتِ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم فَقَالَتْ: إِنَّكُمْ مَعَاشِرَ الرِّجَالِ فُضِّلْتُمْ عَلَيْنَا بِالْجُمَعِ، وَالْجَمَاعَاتِ، وَأَفْضَلُ مِنْ ذَلِكَ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ عز وجل، فَمَا نُشَارِكُكُمْ فِي الْأَجْرِ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَقَالَ لَهَا النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم: انْصَرِفِي أَيَّتُهَا الْمَرْأَةُ، وَأَعْلِمِي مَنْ خَلْفَكِ مِنَ النِّسَاءِ، انَّ حُسْنَ تَبَعُّلِ إِحْدَاكُنَّ لِزَوْجِهَا وَطَلَبَهَا مَرْضَاتَهُ، وَاتِّبَاعَهَا مُوَافَقَتَهُ تَعْدِلُ ذَلِكَ كُلَّهُ (معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم الاصفہانی، حدیث نمبر 7512)۔یعنی، حضرت اسماء بنت یزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مرد اجر میں آگے بڑھ گئے، وہ جمعہ اور اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا موقع ہے۔ ہم عورتیں کیسے ان کے برابر اجر پائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اے خاتون، تم جا کر تمام عورتوں کو خبر دے دو کہ جو عورت اپنے شوہر کے ساتھ بہتر طریقہ سے رہے اور اس کی پسندیدگی کا خیال رکھے، اور ان سے اختلاف نہ کرے تو یہ ان تمام اعمال کے برابر ہے جن کا تم نے مردوں کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

موجودہ زمانہ کا یہ ذہنی بگاڑ ہے کہ گھر سنبھالنے کو کم تر درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے اور باہر کے کام کو زیادہ بڑا کام سمجھ لیا گیا ہے۔ مگر اسلام گھر سنبھالنے کے کام کو بھی اتنا ہی عزّت کا

درجہ دیتا ہے جتنا باہر کے کام کو۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں یکساں اہمیت کے کام ہیں۔ ان میں سے کسی فریق کو یہ حق نہیں کہ وہ احساسِ برتری میں مبتلا ہو اور نہ کسی فریق کو یہ چاہیے کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اپنی اہمیت خود اپنی نظر میں گھٹا لے۔

معاشرہ کی تعمیر میں عورت کی اہمیت

عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: إِنَّ إِبْلِیسَ یَضَعُ عَرْشَہُ عَلَی الْمَاءِ، ثُمَّ یَبْعَثُ سَرَایَاہُ، فَأَدْنَاھُمْ مِنْہُ مَنْزِلَةً، أَعْظَمُھُمْ فِتْنَةً، یَجِيءُ أَحَدُھُمْ فَیَقُولُ: فَعَلْتُ کَذَا وَکَذَا، فَیَقُولُ: مَا صَنَعْتَ شَیْئًا. قَالَ: ثُمَّ یَجِيءُ أَحَدُھُمْ فَیَقُولُ: مَا تَرَکْتُہُ حَتَّی فَرَّقْتُ بَیْنَہُ وَبَیْنَ امْرَأَتِہِ. قَالَ: فَیُدْنِیہِ مِنْہُ وَیَقُولُ: نِعْمَ أَنْتَ قَالَ الْأَعْمَشُ: أُرَاہُ قَالَ: فَیَلْتَزِمُہُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2813) ۔یعنی حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ ابلیس کا تخت سمندر کے اوپر ہے۔ وہ اپنے دستے بھیجتا ہے تو وہ انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ابلیس کے نزدیک وہ شیطان سب سے بڑا قرار پاتا ہے۔جس نے سب سے بڑا فتنہ پیدا کیا شیطانوں میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ایسا اور ایسا کیا۔ شیطانوں کا سردار ابلیس اس سے کہتا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ان میں کا ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایک مرد اور ایک عورت کے پیچھے لگا رہا یہاں تک کہ میں نے دونوں کے درمیان جدائی ڈال دی۔ ابلیس اس کو اپنے قریب کرتا ہے اور اس کو لپٹا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں تم نے کیا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسانی معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے۔ وہ ہتھیار یہ ہے کہ وہ مرد اور عورت کے درمیان جھگڑے کھڑے کرے اور دونوں کو ایک دوسرے سے دور کردے۔

قدیم زمانہ میں یہ فتنہ بہت محدود پیمانہ پر پیدا ہوتا تھا۔ یعنی ایک میاں بیوی یا ایک گھر اس فتنہ کا شکار ہوتا تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں نئے نئے نظریات نے پوری نسل اور پوری انسانیت کو اس فتنہ کا شکار بنا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں کی مصنوعی آزادی اور غیر فطری مساوات کا ذہن اتنے بڑے پیمانہ پر بنایا گیا ہے کہ قومیں کی قومیں اس سے متاثر ہو کر رہ گئی ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں شادی شدہ زندگی کو برا سمجھا جاتا ہے۔ جدید ترقی یافتہ سماج میں مردوں اور عورتوں کا یہ حال ہے کہ وہ معمولی معمولی بات پر طلاق لے لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے گھر اجڑتے ہیں۔ بچے اپنے ماں باپ سے چھوٹ کر مجرمین کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جنسی بے قیدی کی بنا پر طرح طرح کی مہلک بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ خاندانی بندھن کا پابند نہ ہونے کا مزاج موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہوا ہے اور وہ بلا شبہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

گھر بگڑنے سے پورا معاشرہ بگڑتا ہے اور معاشرہ بگڑنے سے پوری قوم بگڑ جاتی ہے۔ یہ موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ازدواجی زندگی کا احترام ختم ہو گیا۔ خاندانی بندھن کے ساتھ زندگی گزارنے کو کمتر درجہ کی چیز سمجھا جانے لگا۔

عورت کی حاکمیت

1964 میں ہالی وڈ (امریکہ) نے ایک فلم بنائی تھی جس کا نام تھا:

"Kisses for My President"

اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ایک شادی شدہ امریکی خاتون امریکا کی صدر منتخب ہو گئی ہے۔ مگر اس کے جلد ہی بعد وہ حاملہ ہو جاتی ہے۔ حاملہ ہونے کے مسائل سے وہ اتنا پریشان ہوتی ہے کہ وہ صدارتی آفس چھوڑ کر گھر چلی جاتی ہے، اور بالآخر صدارت کے عہدہ

سے استعفا دے دیتی ہے۔

جدید مغربی دنیا میں ابھی تک اس کو ایک غیر سنجیدہ چیز سمجھا جا تا رہا ہے کہ کسی عورت کو اعلیٰ حکومتی عہدہ دیا جائے۔ 1972 کے ایک پول میں امریکا کے ووٹروں کی اکثریت نے کہا تھا کہ خاتون صدر کے مقابلہ میں انھیں ایک سیاہ فام مرد صدر زیادہ قابل قبول ہے۔ ایک شخص نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ خاتون صدر جب اسپتال میں اپنا بچہ جنے گی تو اسپتال کے بلیٹن میں اعلان کیا جائے گا کہ صدر اور نومولود بچہ دونوں بخیریت ہیں:

"The President and baby are doing well." (p.34)

اصولی معیار کے اعتبار سے، ووٹر یہ چاہیں گے کہ عورت امیدوار میں بھی وہی خصوصیات ہوں جو مرد امیدوار میں ہوتی ہیں۔ استعداد، حوصلہ، تجربہ، استحکام، ذہانت۔ مگر عورت امیدوار کے معاملہ میں ووٹر کی نفسیات نہایت نازک ہوجاتی ہے۔ انھیں ابھی تک یقین نہیں کہ عورت کے اندر بھی اس قسم کی مردانہ صفات ہوسکتی ہیں۔

متعدد سائنس داں خالص سائنسی بنیاد پر عورت کو اعلیٰ حکومتی عہدہ دینے کے خلاف ہیں۔ مثلاً سرجن ایڈ گر برمن آزادیِ نسواں کی حامی خواتین کی نظر میں اس وقت معتوب ہوگئے جب کہ انھوں نے یہ کہا کہ اپنی ہارمون کیمسٹری کی وجہ سے عورتیں زیادہ جذباتی ہوسکتی ہیں اور اس بنا پر وہ اقتدار کے منصب کے لیے غیر موزوں ہوسکتی ہیں:

Surgeon Edgar Berman earned a low place in the bestiary of Women's Liberation two years ago when he suggested that because of their hormonal chemistry women might be too emotional for positions of power.

(*Time*, March 20, 1972, p. 34)

1987 میں امریکہ میں خاص اس مسئلہ پر لوگوں کی رائے معلوم کی گئی۔ معلوم ہوا کہ

امریکی ووٹروں کی تقریباً ایک تہائی تعداد خیال کرتی ہے کہ امریکا کا صدر بننے کے لیے عورت کے مقابلہ میں مرد زیادہ موزوں ہیں۔ یہ بات ایک عوامی رائے شماری کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے، جس کا اِہتمام حقوقِ نسواں کی ایک تنظیم کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ مطالعہ کا یہ نتیجہ جو ایک انجمن خواتین کی طرف سے شائع کیا گیا ہے، بتایا ہے کہ رائے دینے والوں میں صرف آٹھ فی صد تعداد ایسی تھی، جس کا خیال تھا کہ وہائٹ ہاؤس کے عہدہ کے لیے عورت زیادہ بہتر ہوسکتی ہے۔

49 فی صد نے کہا کہ دونوں جنسوں میں کوئی پیدائشی فرق نہیں ہے۔ اور 31 فیصد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مرد صدر بننے کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اس رائے شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں بعض دوسرے سماجی معاملات کے لیے زیادہ لائق ہوسکتی ہیں۔ مثلاً افلاس، صحت، تعلیم، منشیات اور شہری حقوق:

> NAY TO WOMEN: Nearly one third of American voters believed men to be better suited than women to be president of the U.S., according to a poll conducted for a women's rights group, Reuter reports from Washington. The study released by the National Women's Political Caucus (NWPC) said only eight percent of those polled believed a woman could do better than a man in the White House. 40 percent said there was no inherent difference between the sexes, and 31 percent believed men made better presidents. The poll, conducted by the Washington-based Hickman-Maslin political research firm, showed that women were credited with being more capable of dealing with social issues, such as poverty, health care, education, drug abuse, and civil rights.
>
> (*The Times of India,* New Delhi, August 14, 1987)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایران کا بادشاہ کسریٰ مر گیا تو اس کے

درباریوں نے کسریٰ کی لڑکی کو ایران کا بادشاہ بنا دیا۔ یہ خبر آپ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا: وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو عورت کو اپنا حاکم بنائے (لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً) صحیح البخاری، حدیث نمبر 4425۔

دور جدید کی مذکورہ تحقیق اسلام کے اصول کی تصدیق ہے۔ اسلام میں چودہ سو سال پہلے یہ کہا گیا تھا کہ عورت اقتدار اعلیٰ کے منصب کے لیے غیر موزوں ہے۔ یہ بات ماضی میں بظاہر ایک خبر تھی، آج وہ ایک مسلّمہ علمی حقیقت ہے۔ پیغمبر نے جو بات الہامی طور پر کہی تھی، اس کو انسان کے لمبے مطالعے اور تجربے نے اب ایک ثابت شدہ واقعہ بنا دیا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اسلام کے اصول فطری حقائق پر مبنی ہیں، نہ کہ محض مفروضات اور قیاسات پر۔

عورت کی گواہی

اسلام کے قانون شہادت میں دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے۔ قرآن میں قرض کے معاملہ کا قاعدہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ — اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنا لو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں، ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تا کہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے (2:282)۔

حالیہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ قرآن کا یہ قانون بالکل فطری ہے۔ کیونکہ وہ حیاتیاتی حقیقت کے عین مطابق ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (18 جنوری 1985) میں یو پی آئی کے حوالہ سے ایک رپورٹ شائع ہوتی ہے۔ یہ رپورٹ اخبار کے صفحہ 9 پر ہے اور اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

MEMORISING ABILITY: “Men have a greater ability to

memorize and process mathematical information than women, but females are better with words, a Soviet scientist says, reports UPI. "Men dominate in mathematical subjects due to the peculiarities of their memory." Dr Vladimir Konovalov told the Tass news agency. "The stronger sex shows greater difficulties in processing and adapting language material."

عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنس داں نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونو ولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے۔ صنف قوی لسانی مواد کو ترکیب دینے اور استعمال کرنے میں زیادہ مشکل محسوس کرتا ہے۔

مذکورہ آیت کا تعلق قرض سے ہے۔ یعنی وہ صورت جب کہ آج معاملہ کیا جائے اور آئندہ اس کی ادائیگی ہو۔ ایسے معاملہ میں حکم دیا گیا کہ اس کے اوپر دو مرد گواہ ہوں۔ یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں انصاف پسندی کے بعد دوسری چیز جو دیکھنے کی ہے وہ یادداشت ہے۔ اور جب حیاتیاتی طور پر عورت کی یادداشت مرد سے کم ہو تو یہ عین مطابق حقیقت ہے کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنائی جائیں۔ گویا عورت اور مرد میں گواہی کا فرق بر بنائے ضرورت ہے، نہ کہ بر بنائے فضیلت۔

اضافی خصوصیت نہ کہ فضیلت

قرآن کی آیت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اَلرِّجَالُ قَوّٰامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (4:34)۔ یعنی، مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے

ایک کو ایک پر فضیلت دی۔

یہاں فضیلت سے مراد خصوصیت ہے۔ گھر کے نظام کو درست طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک سربراہ اور نگراں ہو۔ یہ سربراہی یا نگرانی اسی فرد خاندان کو سونپی جائے گی جو نسبتاً اس کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو، یہ اہلیت قدرتی تخلیق کے اعتبار سے مرد کے اندر زیادہ ہے۔ اس آیت میں کلّی فضیلت کا ذکر نہیں ہے۔ یہاں صرف اس فضیلت کا ذکر ہے جو مرد کے لیے یہ استحقاق ثابت کرتی ہے کہ اس کو گھر کا قوام بنایا جائے۔

"فَضَّلَ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ" عربی کا ایک اسلوب ہے جو قرآن میں مختلف مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی سے مختلف قسم کی فصلیں اور میوے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

> وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ (13:4)۔ یعنی، اور زمین میں پاس پاس مختلف قطعے ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتی ہے اور کھجوریں ہیں۔ ان میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دہرے سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور ہم بڑھا دیتے ہیں ان میں ایک کو ایک سے میووں میں۔

تمام مفسرین نے یہاں "تفضیل" سے مراد فرق اور تنوع لیا ہے، نہ یہ کہ پھلوں میں سے کسی ایک پھل کو دوسرے تمام پھلوں کے اوپر مطلق برتری حاصل ہے۔ یعنی ہر پھل میں ایک منفرد خصوصیت ہے جو دوسرے میں نہیں، ہر پھل میں رنگ اور مزہ کے اعتبار سے ایک مزید پہلو ہے جو دوسرے پھل سے مختلف ہے۔ عورت اور مرد میں بھی اسی طرح فرق رکھا گیا ہے۔ ایک صنف کے اندر ایک اضافی خصوصیت ہے تو دوسری صنف کے اندر دوسری اضافی خصوصیت۔

اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ جن چیزوں میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے ان میں ہوس نہ کرو۔ مردوں کو ان کی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کو ان کی کمائی کا حصہ: وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (4:32)۔ یعنی، ہر ایک کو کوئی ایسی خصوصیت دی گئی ہے جو دوسرے کو نہیں دی گئی ہے۔ اس لیے دوسرے کو جو کچھ ملا ہے اس پر رشک وحسد نہ کرو بلکہ تم کو جو کچھ ملا ہے اس کو استعمال کرکے اس کے ذریعہ سے تعمیر حیات میں اپنا حصہ ادا کرو۔

یہ صحیح ہے کہ جسمانی اعتبار سے عورت کے اندر بعض کمزوریاں ہیں۔ مگر جسمانی کمزوری کا مطلب غیر افضل ہونا نہیں۔ آنکھ ہمارے جسم کا نہایت کمزور حصہ ہے، اس کے مقابلہ میں ناخن زیادہ طاقتور ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ناخن افضل ہے اور آنکھ غیر افضل۔

جس طرح دو پھلوں میں دو علاحدہ علاحدہ صفت ہوتی ہے اور دونوں میں سے کوئی افضل یا غیر افضل نہیں ہوتا۔ یہی معاملہ عورت اور مرد کا بھی ہے۔ عورت اور مرد دونوں کے اندر کوئی مزید صفت ہے جو ایک کے اندر ہے اور دوسرے کے اندر نہیں ہے۔ ہر ایک کو کسی نہ کسی اعتبار سے فضیلت (اضافی خصوصیت) حاصل ہے۔ دونوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اضافی خصوصیت کے اعتبار سے زندگی کے نظام میں اپنا مقام متعین کریں۔ ہر صنف کو اللہ تعالیٰ نے کسی کار خاص کے لیے موزوں بنایا ہے اور اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی کار خاص میں لگا دے۔

نادانی کا کلمہ

اخبارات میں ایک کیس شائع ہوا ہے۔ یہ نادرہ بیگم قریشی کا کیس ہے۔ وہ بلاسپور (مہاراشٹر) کی رہنے والی ہے۔ اس کے شوہر نے ایک لڑکی کی پیدائش کے بعد اس کو طلاق دے دیا۔ اب وہ عدالت کے ذریعہ اپنے سابقہ شوہر سے گزارہ وصول کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا یکم مئی 1986 کی رپورٹ کے مطابق جب نادرہ بیگم قریشی سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں اندور کی شاہ بانو کے راستہ پر چل رہی ہے اور فوجداری قانون کی دفعہ 125 کے تحت اپنے لیے گذارہ وصول کرنا چاہتی ہے (جب کہ یہ اسلام کے خلاف ہے) تو اس تیزی سے جواب دیا کہ اسلام نے میرے لیے کیا کیا ہے کہ میں اس کے اصولوں کی پابندی کروں۔ نہ جج اور نہ وکیل اس میں کامیاب ہو سکے کہ وہ مسز قریشی کو اپنا مقدمہ واپس لینے پر راضی کر سکیں۔ اس نے مسٹر قریشی کی اس پیش کش کو بھی رد کر دیا کہ وہ اس کو اور اس کی لڑکی کو دوبارہ واپس لینے پر تیار ہیں۔ اس نے پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے عدالت سے درخواست کی کہ وہ اس کو پانچ سو روپیہ ماہوار گذارہ دلائے۔ مسز شاہ بانو کے برعکس وہ ابھی جوان (30 سال) ہے اور اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے:

> "What has Islam done for me that I should follow its tenets? shoots back Mrs Nadira Begum Qureshi when asked why she is following in the footsteps of Mrs Shah Bano of Indore and seeking maintenance allowance under Section 125, Cr. P. C. Neither the judge nor lawyers could persuade Mrs Qureshi to withdraw her case. She rejected Mr Qureshi's offer to take her and her daughter back. The offer rejected, she called upon the court to get her Rs 500 a month as allowance. Unlike Mrs Shah Bano, she is young (30) and educated (Graduate).

یہ ایک نادان عورت کا کلمہ ہے، نہ کہ واقف کار عورت کا کلمہ۔ مذکورہ خاتون اگر تاریخ سے واقف ہوتی تو وہ جانتی کہ عورت کو جو کچھ ملا ہے اسلام ہی کے ذریعہ ملا ہے۔ حتی کہ ایک عورت کا کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ 'اسلام نے میرے لیے کیا کیا' یہ بھی اسلام ہی کا عطیہ ہے۔ اسلام سے پہلے عورت کو یہ درجہ ہی حاصل نہ تھا کہ وہ برسرعام کھڑی ہو کر اس طرح آزادانہ کلام کر سکے۔

خواتینِ اسلام

اسلام کی تاریخ خواتین کے اعلیٰ واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ خواتین کو اسلامی معاشرہ میں کتنا اونچا مقام حاصل ہے۔ اور انھوں نے اسلام کے دائرہ میں رہ کر کتنے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ عائشہ بنت ابی بکر نہایت ذہین خاتون تھیں۔ ان کی ذہانت اسلام میں آکر نہ ضائع ہوئی اور نہ غیر استعمال شدہ رہ گئی۔ بلکہ اس نے اپنے استعمال کا نہایت اعلیٰ اور وسیع میدان پالیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کافی کم عمر تھیں اس بنا پر آپ کی وفات کے بعد تقریباً نصف صدی تک دنیا میں رہیں اور اس پوری مدت میں امت کے لیے دین کو جاننے کا مستند ذریعہ بنی رہیں۔

حضرت عائشہ کی روایتوں کی تعداد 2210 تک شمار کی گئی ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگوؤں اور تقریروں کو نہایت صحت کے ساتھ اپنے ذہن میں محفوظ کرلیتی تھیں اور ان سے مسائل اخذ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ شرعی احکام کا تقریباً چوتھائی حصّہ حضرت عائشہ سے منقول ہے۔ آپ کا علم اور تفقہ اس قدر مسلّم تھا کہ صحابہ کے درمیان جب کسی معاملہ میں سوال پیدا ہوتا تو وہ حضرت عائشہ سے دریافت کرتے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو جب بھی کسی حدیث میں اشکال پیش آتا تو ہم عائشہ سے رجوع کرتے، ان کے یہاں ضرور اس کے متعلق ہم کو کوئی علم مل جاتا: عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ: مَا أَشْكَلَ عَلَيْنَا أَصْحَابَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثٌ قَطُّ، فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ إِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2883)۔

اس قسم کی باتوں کی اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کی ایک معزز خاتون کی

فضیلت کو بتاتی ہیں۔ ان کی اصل اہمیت یہ ہے کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کو کتنا بلند درجہ دیا گیا ہے۔ اوران کی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے اسلام میں کتنا وسیع میدان کھلا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات اسلام کے امتیاز کو بتارہے ہیں، نہ کہ محض کسی ایک شخص کے ذاتی امتیاز کو۔

اسلام نے حضرت عائشہ کی صلاحیتوں کواس حدتک ترقی دی کہ انھوں نے اہم سیاسی اورسماجی خدمات انجام دیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) میں ان کی خدمات کااعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

'Aishah, the third wife of the Prophet Muhammad, who played a role of some political importance after the Prophet's death.'

(*Encyclopedia Britannica,* 1/167)

عائشہ جو پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی تیسری اہلیہ تھیں۔ انھوں نے پیغمبر کی وفات کے بعد کچھ ایسے رول ادا کیے جو سیاسی اہمیت رکھنے والے تھے۔ یہاں خواتین اسلام کے سلسلہ میں چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔

دوخواتین

- سَمِعْتُ عَلِيًّا بِالْكُوفَةِ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: خَيْرُ نِسَائِهَا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَخَيْرُ نِسَائِهَا خَدِيجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2430)۔ حضرت علی سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: اُن کی سب سے بہتر خاتون مریم بنت عمران تھیں اور اِن کی سب سے بہتر خاتون خدیجہ بنت خویلد ہیں۔

فتح الباری میں طیبی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ الضَّمِيرُ الأَوَّلُ رَجَعَ إِلَى الأُمَّةِ الَّتِي

كَانَتْ فِيهَا مَرْيَمُ، وَالثَّانِي إِلَى هَذِهِ الأُمَّةِ۔ یعنی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مریم امت یہود کی سب سے بہتر خاتون تھیں امت مسلمہ کی سب سے بہتر خاتون ہیں۔

یہ افضلیت کیوں تھی، اس پر مندرجہ ذیل دو احادیث سے روشنی پڑتی ہے:

- عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: مَا غِرْتُ عَلَى نِسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا عَلَى خَدِيجَةَ، وَإِنِّي لَمْ أُدْرِكْهَا. قَالَتْ: وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا ذَبَحَ الشَّاةَ فَيَقُولُ: أَرْسِلُوا بِهَا إِلَى أَصْدِقَاءِ خَدِيجَةَ! قَالَتْ. فَأَغْضَبْتُهُ يَوْمًا فَقُلْتُ: خَدِيجَةَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنِّي قَدْ رُزِقْتُ حُبَّهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3816؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2435)۔ یعنی، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں مجھے خدیجہ کے سوا کسی کے اوپر غیرت نہیں آئی۔ حالانکہ میں نے ان کا زمانہ نہیں پایا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بکری ذبح کرتے تو فرماتے کہ اس میں سے خدیجہ کی دوستوں کو بھیج دو۔ وہ کہتی ہیں کہ ایک روز مجھے اس پر غصّہ آ گیا اور میں نے کہا خدیجہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدیجہ کی محبت مجھے پلا دی گئی ہے۔

- عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَكَادُ يَخْرُجُ مِنَ الْبَيْتِ حَتَّى يَذْكُرُ خَدِيجَةَ، فَيُحْسِنُ عَلَيْهَا الثَّنَاءَ، فَذَكَرَهَا يَوْمًا مِنَ الْأَيَّامِ، فَأَدْرَكَتْنِي الْغَيْرَةُ فَقُلْتُ: هَلْ كَانَتْ إِلَّا عَجُوزًا، فَقَدْ أَبْدَلَكَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ خَيْرًا مِنْهَا، فَغَضِبَ ثُمَّ قَالَ: لَا وَاللَّهِ مَا أَخْلَفَ اللَّهُ لِي خَيْرًا مِنْهَا، وَقَدْ آمَنَتْ بِي إِذْ كَفَرَ بِيَ النَّاسُ، وَصَدَّقَتْنِي وَكَذَّبَنِي النَّاسُ، وَوَاسَتْنِي مِنْ مَالِهَا إِذْ حَرَمَنِي النَّاسُ، وَرَزَقَنِي اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ

الْأَوْلَادَ مِنْهَا، إِذْ حَرَمَنِي أَوْلَادَ النِّسَاءِ (الشریعۃ للآجری، حدیث نمبر 1681؛ المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 22)۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدیجہ کی تعریف کیے بغیر گھر سے نہ نکلتے تھے۔ ایک روز آپ نے خدیجہ کا ذکر فرمایا تو مجھے غیرت آ گئی۔ میں نے کہا وہ ایک بڑھیا ہی تو تھیں اور اللہ نے اس کے بدلے آپ کو زیادہ بہتر دیدیا ہے۔ آپ غضب ناک ہو گئے اور فرمایا۔ خدا کی قسم نہیں، خدا نے مجھے خدیجہ سے بہتر نہیں دیا۔ وہ ایمان لائیں جب کہ لوگوں نے انکار کیا۔ انہوں نے میری تصدیق کی جب کہ لوگوں نے مجھے جھٹلا دیا۔ انہوں نے اپنے مال سے میری مدد کی جب کہ لوگوں نے مجھے محروم کیا۔ اور اللہ نے مجھے ان سے اولاد دی جو دوسری بیویوں سے نہ دی۔

حضرت مریم اور حضرت خدیجہ کو تاریخ کی معیاری خواتین کی حیثیت کیوں حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہمہ تن اللہ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں ملا دیا۔

یہود کے آخری زمانہ میں ایک ایسی خاتون درکار تھیں جو حضرت مسیح جیسے معجزاتی پیغمبر کی ماں بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ تھا کہ وہ قوم یہود کے آخری پیغمبر کو باپ کے بغیر پیدا کرے۔ اس مقصد کے لیے ایسی خاتون درکار تھیں جن کی عصمت اور پاکبازی اتنی مسلّم ہو کہ کسی کو ان کے بارے میں ادنیٰ شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ حضرت مریم نے اپنی غیر معمولی زندگی سے اس کا ثبوت دیا۔ اس لیے وہ حضرت مسیح کی ماں بنائے جانے کے لیے چن لی گئیں۔

اسی طرح آخری رسول کے حالات کے اعتبار سے ان کو ایسی خاتون کی ضرورت تھی جو اپنی زندگی اور اپنا اثاثہ پوری طرح پیغمبر کے حوالے کر دیں اور کبھی کسی بات پر شکایت نہ

کریں۔ حضرت خدیجہ کے امتیازی اوصاف کی بنا پر خدا نے ان کو اس خدمت خاص کے لیے چن لیا۔ انہوں نے اپنی زندگی، اپنا اثاثہ، اپنا آرام وراحت، سب کچھ پیغمبر خدا کے لیے وقف کردیا۔ سخت ترین مصائب کے باوجود کبھی اُف نہ کیا۔ ان کی انہیں خصوصیات نے انہیں خدا کی نظر میں اس قابل بنایا کہ وہ پیغمبر آخرالزماں کی رفیقۂ حیات بنیں۔

اسلام کے مشن کے لیے ہر دور میں ایسی عورتوں اور ایسے مردوں کی ضرورت ہوتی ہے جو موجودہ امتحانی دنیا میں زیر عمل لائے جانے والے خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کریں۔ جو خدا کے کاگ (cog) میں اپنا کاگ ملائیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے حد صبر آزما عمل ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآن میں خدا کی مدد کرنا کہا گیا ہے۔ اور بلا شبہ کسی مرد یا عورتوں کے لیے اس سے بڑا اور کوئی درجہ نہیں۔

بہترین رفیقہ حیات

حضرت خدیجہ بنت خویلد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی اہلیہ تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوّت ملی اور فرشتہ جبریل نے آپ کو خدا کی پہلی وحی پہنچائی تو آپ پر اس کا شدید تاثر تھا۔ یہ واقعہ غار حرا میں پیش آیا تھا۔ آپ وہاں سے اتر کر اپنے مکان پر آئے۔ اور حضرت خدیجہ سے تمام واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہ نے جو جملہ کہا وہ تاریخ میں ان الفاظ میں محفوظ ہے:

كَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا، فَوَاللّٰهِ إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَق (سیرت ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 386)۔ یعنی، ہرگز نہیں، خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا

کرتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں،
اور سچ بات بولتے ہیں، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں اور حق کے معاملے میں
ہمیشہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ کو یہ خیال ہوا کہ اس بارے میں عیسائی حضرات سے دریافت کریں۔ کیوں کہ وہ لوگ آسمانی کتابوں کے حامل ہیں اور وحی نبوّت کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک عیسائی راہب کے پاس گئیں جو مکہ سے قریب رہتے تھے۔ راہب نے انھیں دیکھ کر پوچھا کہ اے قریش کی معزز خاتون۔ آپ کس لیے آئی ہیں۔ حضرت خدیجہ نے کہا کہ میں اس لیے آئی ہوں کہ آپ مجھے جبریل کے بارے میں بتائیں کہ وہ کون ہیں۔ راہب نے کہا، سبحان اللہ۔ وہ خدا کا پاک فرشتہ ہے۔ وہ پیغمبروں کے پاس آتا ہے۔ وہ موسیٰ اور عیسیٰ کے پاس آیا تھا۔

حضرت خدیجہ اس کے بعد ایک اور عیسائی کے پاس گئیں جس کا نام عداس تھا۔ اس سے بھی انھوں نے یہی سوال کیا کہ ’’جبریل‘‘ کون ہیں۔ عداس نے کہا کہ جبریل خدا کے فرشتے ہیں۔ وہ موسیٰ کے پاس اس وقت تھے جب کہ اللہ نے فرعون کو غرق کیا۔ وہ عیسیٰ پر اترے اور ان کے ذریعہ اللہ نے عیسیٰ کی مدد فرمائی۔

حضرت خدیجہ اس کے بعد ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ وہ جاہلیت کے زمانہ میں عیسائی ہو گئے تھے۔ وہ ایک بڑے عالم تھے اور انھوں نے انجیل کا ترجمہ سریانی زبان سے عربی میں کیا تھا۔ ورقہ بن نوفل نے حالات سننے کے بعد کہا: اے خدیجہ، اگر تم نے سچ کہا ہے تو یہ وہی فرشتہ ہے جو عیسیٰ پر آیا تھا، اب وہ محمد کے پاس آیا ہے۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر دوبارہ ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ نے آپ کی زبان سے حالات سننے کے بعد کہا، آپ کو خوش خبری ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ

وہی پیغمبر ہیں جن کی مسیح بن مریم نے بشارت دی تھی۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، قوم آپ کو جھٹلائے گی اور آپ سے لڑے گی۔ اگر میں اس وقت زندہ رہا تو میں ضرور آپ کا ساتھ دوں گا۔ (سیرت ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 386)

کامِل آزادی

قدیم عرب میں ایک رواج تھا جس کو ظِہار کہتے تھے۔ ایک شخص اپنی بیوی سے غصہ ہوکر کہہ دیتا کہ أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي (تو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے)۔ جو شخص ایسا کہہ دیتا اس کے متعلق سمجھا جاتا کہ اس کی بیوی اس پر حرام ہوگئی۔

مدینہ میں یہ واقعہ ہوا کہ ایک مسلمان حضرت اوس بن صامت نے کسی بات پر اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کو ایسا ہی کہہ دیا۔ اب بظاہر خولہ اپنے شوہر کے لیے حرام ہوگئیں۔ ان کے کئی بچے تھے، ان کو سخت پریشانی ہوئی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور پورا قصہ بتایا۔ اس وقت تک اس بارے میں قرآن میں کوئی حکم نہیں اترا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ تو اب ان کے لیے حرام ہوگئی۔

یہ سن کر حضرت خولہ فریاد اور شکوہ کرنے لگیں کہ گھر ویران ہوجائے گا۔ میری اولاد تباہ ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، میرے شوہر نے یہ الفاظ تو نہیں کہے کہ میں تم کو طلاق دیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موافق جواب نہیں ملا تو وہ اللہ کے آگے رونے گڑگڑانے لگیں کہ خدایا مجھے اس مصیبت سے بچا۔ میں تجھی سے اس معاملہ کی فریاد کرتی ہوں۔

اس کے بعد سورہ مجادلہ اتری جس میں ظِہار کے بارے میں اسلام کا حکم بتایا گیا ہے۔ یہ سورہ ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑتی تھی اور اللہ سے فریاد کررہی تھی۔ اور اللہ تم دونوں کی باتیں سن رہا

ہے، بے شک وہ سننے اور دیکھنے والا ہے (58:1)۔ تفسیر عبد الرزاق:3165

انھیں حضرت خولہ کا واقعہ ہے۔ بعد کے زمانہ میں جب کہ حضرت عمر فاروق اسلامی سلطنت کے خلیفہ تھے۔ ایک روز آپ کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں حضرت خولہ ملیں جو اس وقت کافی بوڑھی ہو چکی تھیں۔ حضرت عمر نے ان کو سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور پھر کہا: ''اے عمر، ایک وقت تھا کہ میں نے تم کو عکاظ کے بازار میں دیکھا تھا۔ اس وقت تم عُمیر کہے جاتے تھے، تم ہاتھ میں لکڑی لیے ہوئے بکریاں چراتے تھے۔ پھر وہ وقت آیا کہ تم عمر کہے جانے لگے۔ اور تم امیر المومنین کہے جاتے ہو۔ دیکھو، رعایا کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اور یاد رکھو کہ جو شخص اللہ کی پکڑ سے ڈرتا ہے اس کے لیے دور کا آدمی بھی قریبی رشتہ دار کی طرح ہوتا ہے۔ اور جو آدمی موت سے نہیں ڈرتا اس کے بارے میں ڈر ہے کہ وہ اسی چیز کو کھو دے گا جس کو وہ پانا چاہتا ہے''۔

اس وقت ایک صاحب حضرت عمر کے ساتھ تھے جن کا نام جارود عبدِی تھا، انھوں نے کہا کہ اے عورت: تو نے امیر المومنین کے ساتھ بہت زبان درازی کی۔ حضرت عمر نے کہا انھیں بولنے دو تم جانتے ہو کہ یہ کون ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کی بات سات آسمانوں کے اوپر سنی گئی، عمر کو تو بدرجہ اَولی ان کی بات سننا چاہیے۔ (تاریخ المدینۃ لابن شبۃ، جلد 2، صفحہ 394)

تقسیم کار

اسلام میں عورت اور مرد کے دائرہ عمل کو الگ الگ رکھا گیا ہے۔ عورت گھر کے لیے اور مرد باہر کے لیے۔ یہ تقسیم نہ صرف اس لیے صحیح ہے کہ حیاتیاتی اور عضویاتی اعتبار سے دونوں صنفوں میں فرق ہے۔ بلکہ اس میں بہت سے اجتماعی فائدے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اس تقسیم کے ذریعہ دونوں کو ایسے قابل اعتماد ساتھی مل جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے لیے بہترین مشیر بن سکیں۔

خاندان، نسل انسانی کا اکائی ہے اور معاشرہ اس کا مجموعہ۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ زندگی کے ان دونوں میدانوں میں بار بار ایسے گمبھیر مسائل آتے ہیں جن میں وہ شخص بے لاگ رائے قائم نہیں کر پاتا جو خود مسئلہ کے اندر گھرا ہوا ہو۔ ایسے وقت میں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے پاس ایک ایسا مشیر ہو جو خود مسئلہ سے متعلق نہ ہوتا کہ اس کی بابت غیر متاثر ذہن کے ساتھ رائے قائم کر سکے۔

عورت اور مرد کے درمیان تقسیم عمل سے یہ فائدہ بہترین طور پر حاصل ہوجاتا ہے۔ عورت اپنے شعبہ میں مصروف ہوتی ہے اور مرد اپنے شعبہ میں۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے معاملات سے براہ راست طور پر غیر متعلق ہوجاتے ہیں۔ ہر فریق اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ دوسرے فریق کے معاملہ میں غیر متاثر ذہن کے ساتھ سوچے اور اپنے بے لاگ مشوروں سے اس کی مدد کر سکے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے یہاں عورت کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

1۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر جب غار حرا میں پہلی وحی اتری تو آپ کانپتے ہوئے اپنے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھا دو۔ گھر والوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب آپ کی دہشت کم ہوئی تو آپ نے اپنی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد سے وہ پورا قصہ بیان کیا جو غار حرا کی تنہائی میں آپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آپ نے فرمایا، یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ خدیجہ کے اس وقت کے الفاظ جو تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں وہ ایک رفیقۂ حیات کے کردار کی نہایت اعلیٰ مثال ہیں۔ انھوں نے کہا:

كَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا، فَوَاللّٰهِ إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ (سیرت ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 386)۔ یعنی، ہرگز نہیں، خدا

کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ ناداروں کے کام آتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے معاملہ میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قریش مکہ سے وہ معاہدہ کیا جو معاہدہ حُدیبیہ کے نام سے مشہور ہے، تو صحابہ میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ کیونکہ یہ معاہدہ بظاہر دب کر کیا گیا تھا اور اس میں کئی باتیں صریح طور پر مخالفین کے حق میں تھیں۔ لوگوں میں اس قدر غم وغصہ تھا کہ معاہدہ کی تکمیل کے بعد جب آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ قربانی کے جانور جو تم اپنے ساتھ لائے ہو، یہیں ذبح کردو اور سر منڈالو۔ تو ایک شخص بھی اس کے لیے نہ اٹھا۔ آپ نے تین بار اپنے حکم کو دہرایا پھر بھی سب لوگ خاموش رہے اور کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ آپ رنج کی حالت میں وہاں سے لوٹ کر اپنے خیمہ میں گئے جہاں آپ کی اہلیہ ام سلمہ موجود تھیں۔ انھوں نے آپ کو غمگین دیکھ کر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ آج وہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو حکم دیا مگر ان میں سے کوئی بھی میرے حکم کی تعمیل کے لیے نہ اٹھا۔ ام سلمہ نے کہا: اے اللہ کے رسول، اگر آپ کی رائے یہی ہے تو آپ میدان میں تشریف لے جائیں اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنا قربانی کا جانور ذبح کریں اور سر منڈالیں۔ آپ خیمہ سے باہر نکلے اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی قربانی ذبح کی اور نائی کو بلا کر سر منڈایا۔ جب صحابہ نے یہ دیکھا تو سب نے اٹھ کر اپنی اپنی قربانیاں ذبح کر دیں۔ اگرچہ ان کے رنج وغم کا عالم یہ تھا کہ جب وہ ایک دوسرے کا سر مونڈنے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو کاٹ ڈالیں گے۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2731)

خدیجہ اور ام سلمہ کو ان نازک مواقع پر جو قیمتی بات سوجھی وہ اس لیے سوجھی کہ وہ اصل معاملہ سے الگ تھیں۔ اور اس بنا پر اس پوزیشن میں تھیں کہ غیر متاثر ذہن کے تحت اس

کے بارے میں رائے قائم کرسکیں۔ اگر وہ خود بھی معاملہ میں براہِ راست شریک ہوتیں تو اس قسم کی بےلاگ رائے قائم کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

علم اور خاتون

مشہور حدیث ہے کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 224)۔ یعنی علم کو حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ بظاہر اس حدیث میں صرف مسلم کا لفظ ہے، مسلمہ کا لفظ نہیں ہے۔ مگر علم کا حصول مسلم خواتین پر بھی فرض ہے۔ محدثین نے صراحت کی ہے کہ اس حدیث میں "مسلمہ" کا لفظ بھی تبعاً شامل ہے۔

رجال اور طبقات کی کتابوں میں مردوں کی طرح عورتوں کی علمی خدمات کے تذکرے موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوراوّل میں خواتین کے درمیان علم کا کافی رواج تھا۔ امام بخاری (وفات 870ء) نے چودہ سال کی عمر میں علم کے لیے سفر کیا تو وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ بڑے بڑے اساتذہ سے استفادہ کرسکیں۔ ان کے اندر یہ استعداد ان کی والدہ اور ان کی بہن نے پیدا کی تھی۔ امام ابن جوزی (وفات 1201ء) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کو ابتدائی تعلیم اپنی پھوپھی سے ملی۔ مسلم مورخ اور طبیب ابن ابی اصیبعہ (وفات 1270ء) کی بہن اور بیٹی علم طب کی ماہر تھیں اور آج کل کی زبان میں "لیڈی ڈاکٹر" تھیں۔ امام ابن عساکر (وفات 1176ء) نے فن حدیث کی تعلیم جن اساتذہ سے حاصل کی ان میں ایک سے زیادہ خواتین کے نام بھی آتے ہیں۔

دوراوّل میں علمی سرگرمی سب سے زیادہ احادیث اور آثار کی روایت کا نام ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کے ساتھ صحابیات اور مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی کثرت سے احادیث کو محفوظ کرنے اور بیان کرنے کا کام کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیے ہوئے بہت سے علوم امت کو منتقل کیے۔ اسی

طرح اس زمانہ میں بہت سی خواتین ہیں، جنھوں نے اپنے والدین اور اپنے ان رشتہ داروں سے روایات بیان کی ہیں، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا یا آپ کے اصحاب سے علم دین کی کوئی بات پائی تھی۔ ان خواتین نے اپنے رشتہ کے اہل علم سے اسلامی تعلیمات کو سیکھا اور ان کو دوسروں تک پہنچایا۔

اسلامی حوصلہ

خنساء (وفات 24ھ) اسلامی دور کی شاعرہ ہے۔ اس خاتون کا اصل نام تُماضِر بنت عمرو بن الشرید سُلَمِیّہ ہے۔ خنساء اس کا لقب تھا۔ بعد کو وہ اسی سے مشہور ہوگئی۔

وہ ایک بڑے خاندان میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ مضر کے قبیلہ بنو سلیم کا سردار تھا۔ اس کے دو بھائی جاہلی جنگ میں مارے گئے۔ اس کا اسے بہت صدمہ ہوا۔ اپنے بھائیوں کے قتل سے پہلے وہ دو یا تین اشعار سے زیادہ نہ کہتی تھی۔ مگر جب وہ مارے گئے تو اس کی آنکھوں سے آنسو اور دل سے اشعار امنڈنے لگے۔ اس نے دونوں بھائیوں خصوصاً صخر کے لیے انتہائی دردناک مرثیے لکھے۔ وہ برابر مرثیہ کہتی رہی اور روتی رہی یہاں تک کہ اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔

فتح مکہ کے بعد اپنے قبیلہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اسلام قبول کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو اس نے اپنے کچھ اشعار سنائے تو آپ بہت متاثر ہوئے اور فرمایا: "اور سناؤ خُناس (هِیهِ یا خُنَاس)"۔ چنانچہ اس نے مزید اشعار آپ کو سنائے۔

مگر جوانی کی عمر میں جو عورت اپنے بھائی کی موت کو برداشت نہ کرسکی تھی، اسلام نے اس کے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ بڑھاپے کی عمر میں اس نے خود اپنے لڑکوں کو خدا کی راہ میں نثار کردیا۔ اس کے چار جوان بیٹے تھے۔ چاروں کو اس نے جنگ قادسیہ میں جانے کے لیے آمادہ کیا۔ چنانچہ چاروں گئے اور چاروں لڑ کر شہید ہوگئے۔ جب اس کو خبر ملی کہ اس

کے چاروں بیٹے ختم ہو گئے تو اس نے رونے یا مرثیہ کہنے کے بجائے نہایت صبر وسکون کے ساتھ اس خبر کو سنا اور پھر بولی: ''خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزت بخشی، میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے ان سے ملا دے گا۔'' (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، جلد 4، صفحہ 1829)

جنّت کے لیے صبر

عمّار، یاسِر اور سمیّہ کے لڑکے تھے جن کو مکہ میں اسلام دشمنوں نے سخت ترین تکلیفیں پہنچائیں یہاں تک کہ دونوں شہید ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم آلِ یاسر کی طرف سے ایسے وقت میں گزرے جب کہ ان پر تشدد کیا جارہا تھا۔ یاسر کے منہ سے صرف اتنا نکلا:

یا رَسُولَ اللّٰہِ، اَلدَّھْرُ ھٰکَذَا (مسند احمد، حدیث نمبر 439)۔ یعنی، اے خدا کے رسول، زمانہ یہی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' آلِ یاسِر صبر کرو، تم سے جنت کا وعدہ ہو چکا ہے '' (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 1508)۔ یاسر اور ان کی بیوی سمیّہ اسلام میں سب سے پہلے مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، جلد 4، صفحہ 1864)۔ ماں باپ کا روح فرسا انجام دیکھنے کے باوجود عمار کے عزم میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ مزید یقین کے ساتھ اسلام پر جم گئے۔ راویانِ آثار وسیر کا بیان ہے کہ عمار بن یاسر پہلے مکی مسلمان ہیں جنھوں نے اپنے گھر میں مسجد بنائی (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 5762)۔ اسبابِ نزول کی روایات کے مطابق ذیل کی آیت انھیں کے بارے میں اتری تھی:

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ (39:9)۔ یعنی، بھلا کوئی شخص رات کی گھڑیوں میں سجدہ اور قیام کی حالت میں عاجزی کررہا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہو (وہ اور غافل لوگ یکساں ہیں)۔ کہو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت تو وہی لوگ پکڑتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ (الطبقات الکبری لابن سعد، جلد 3، صفحہ 231)

میدان عمل میں

اسماء بنت ابوبکر ہجرت سے 27 سال پہلے پیدا ہوئیں۔ مکہ میں جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو مسلمانوں کی تعداد سترہ تھی۔ حضرت ابوبکر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ان کے پاس تقریباً چھ ہزار درہم تھے، وہ سب ساتھ لے گئے تھے۔

حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ جو نابینا ہو گئے تھے۔ بعد کو پوتیوں کے پاس تسلی کے لیے آئے اور کہنے لگے: میرا خیال ہے کہ ابوبکر نے اپنے جانے کا صدمہ بھی تم کو پہنچایا اور مال بھی شاید سب لے گیا۔ اسماء کہتی ہیں کہ میں نے اپنے دادا سے کہا، وہ تو ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کیے۔ اور اس طاق میں بھر دیا جس میں میرے والد کے درہم پڑے رہتے تھے۔ اور ان کے اوپر ایک کپڑا ڈال کر دادا کا ہاتھ اس کپڑے پر رکھ دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ درہم سے بھرے ہوئے ہیں۔ کہا خیر یہ ابوبکر نے اچھا کیا۔ اس سے تم لوگوں کے گزارہ کی صورت ہو جائے گی۔ اسماء کہتی ہیں کہ خدا کی قسم کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے صرف دادا کی تسلی کے لیے یہ صورت اختیار کی تھی۔ (سیرت ابن ہشام جلد 1، صفحہ 489)

حضرت اسماء کی شادی حضرت زبیر سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب دونوں ہجرت کر کے

مدینہ پہنچے تو اس وقت جو حال ہوا وہ صحیح بخاری میں ان کی زبان سے اس طرح نقل ہوا ہے:

"جب میرا نکاح زبیر سے ہوا تو ان کے پاس نہ مال تھا نہ جائیداد۔ نہ کوئی خادم کام کرنے والا۔ نہ کوئی اور چیز۔ ایک اونٹ پانی لاد کر لانے کے لیے تھا اور ایک گھوڑا۔ میں ہی اونٹ کے لیے گھاس وغیرہ لاتی تھی اور کھجور کی گٹھلیاں کوٹ کر دانہ کے طور پر کھلاتی تھی۔ میں ہی پانی بھر کر لاتی اور پانی کا ڈول پھٹ جاتا تو اس کو آپ ہی سیتی تھی۔ مجھ ہی کو گھوڑے کی ساری خدمت کرنی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ گھر کا سارا کام بھی انجام دینا ہوتا۔ ان سب کاموں میں گھوڑے کی خبر گیری میرے لیے زیادہ مشقت کی چیز تھی۔ روٹی البتہ مجھ کو اچھی طرح پکانا نہیں آتی تھی۔ اس لیے جب روٹی پکانا ہوتا تو میں آٹا گوندھ کر اپنے پڑوس کی انصار عورتوں کے یہاں لے جاتی۔ وہ بڑی مخلص عورتیں تھیں۔ میری روٹی بھی پکا دیتیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے پر زبیر کو ایک زمین جاگیر کے طور پر دے دی جو مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر تھی۔ میں وہاں کام کے لیے جایا کرتی اور وہاں سے اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں لاد کر لاتی۔ ایک بار میں اس طرح آرہی تھی اور گٹھری میرے سر پر تھی۔ راستہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے۔ وہ اونٹ پر آرہے تھے اور انصار کی ایک جماعت ساتھ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر اونٹ کو ٹھہرایا۔ اور اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تاکہ میں اس پر بیٹھ جاؤں۔ مجھے مردوں کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آئی اور یہ بھی خیال آیا کہ زبیر کو غیرت بہت زیادہ ہے ان کو یہ ناگوار نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے انداز سے سمجھ گئے کہ مجھ کو اونٹ پر بیٹھتے ہوئے شرم آرہی ہے چنانچہ آپ آگے بڑھ گئے۔

میں گھر پر آئی اور زبیر کو پورا قصہ سنایا۔ میں نے کہا کہ مجھے مردوں کے ساتھ اونٹ

پر بیٹھتے ہوئے شرم آئی اور تمہاری غیرت کا بھی خیال آیا۔ زبیر نے کہا، خدا کی قسم، تمہارا گٹھلیاں سر پر رکھ کر لانا میرے لیے اس سے بھی زیادہ گراں ہے۔" (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4928)

مدینہ کی زندگی میں عورتوں کے اس طرح کے کثرت سے واقعات ہیں۔ اس وقت عورتیں نہ صرف گھر کا بلکہ باہر کا بھی اکثر کام کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرد زیادہ تر جہاد اور تبلیغ دین وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ ان کو موقع نہیں ملتا تھا کہ گھر کی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ چنانچہ ان کی عورتوں نے گھر کے کاروبار کو سنبھال لیا تھا۔ حتی کہ جانوروں کی دیکھ بھال اور زراعت اور باغبانی بھی وہ کرنے لگی تھیں۔

عورت کا مقام

"جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ انھیں سخت عذاب کی خوشخبری دے دو۔" (9:34) قرآن کی یہ آیت اتری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تَبًّا لِلذَّهَبِ تَبًّا لِلْفِضَّةِ (برا ہو سونے کا اور برا ہو چاندی کا)۔ یہ بات جب آپ کے اصحاب کو معلوم ہوئی تو وہ تشویش میں پڑ گئے۔ انھوں نے آپس میں کہا: فَأَيُّ مَالٍ نَتَّخِذُ (اب ہم کون سا مال جمع کریں؟) حضرت عمر اس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا، اگر تم لوگ پسند کرو تو میں اس کی بابت رسول اللہ سے سوال کروں؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ چنانچہ وہ آپؐ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے اصحاب کہہ رہے ہیں کہ کاش ہم جانتے کہ کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسی کو جمع کرتے آپ نے فرمایا:

يَتَّخِذُ أَحَدُكُمْ لِسَانًا ذَاكِرًا، وَقَلْبًا شَاكِرًا، وَزَوْجَةً مُؤْمِنَةً تُعِينُ أَحَدَهُمْ عَلَى إِيمَانِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 22392)۔ وفي رواية: لِيَتَّخِذْ أَحَدُكُمْ قَلْبًا شَاكِرًا، وَلِسَانًا ذَاكِرًا، وَزَوْجَةً مُؤْمِنَةً، تُعِينُ أَحَدَكُمْ عَلَى أَمْرِ الْآخِرَةِ۔ (سنن

ابن ماجہ، حدیث نمبر 1856)

تم میں سے ہر ایک یہ کرے کہ یاد کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل اپنائے اور ایسی بیوی اختیار کرے جو اس کے ایمان پر اس کی مدد کرے۔ ایک اور روایت میں ایمان کے بجائے آخرت کا لفظ ہے۔

عورت ہر میدان میں

1۔ حضرت اُم سلمہ ایک بار کسی عورت سے اپنے بال گندھوا رہی تھیں اتنے میں مسجد سے خطبہ کی آواز آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: أَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگوں) یہ سنتے ہی فرمایا۔ بس جیسے ہیں ویسے ہی باندھ دو، عورت نے کہا اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تو آپ نے أَيُّهَا النَّاسُ کہا ہے۔ انھوں نے کہا ''خوب، کیا ہمارا شمار آدمیوں میں نہیں۔'' یہ کہہ کر خود ہی بال باندھ کر کھڑی ہوگئیں اور قریب ہو کر خطبہ سننے لگیں (مسند ابن المبارک، حدیث نمبر 249)۔ حضرت اُم سلمہ کی مرویات کی تعداد 378 ہے۔ وہ فتویٰ بھی دیا کرتی تھیں۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اگر ان کے فتوے جمع کیے جائیں تو ایک رسالہ تیار ہو جائے گا۔ (اعلام الموقعین، جلد 1، صفحہ 20)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں حضرت عائشہ سب سے زیادہ ذہین تھیں۔ ان کی مرویات کی تعداد 2210 تک شمار کی گئی ہے۔ ان سے تقریباً ایک سو صحابہ اور تابعین نے روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن عباس، عروہ بن زبیر، سعید بن مسیب، عبداللہ بن عامر، مسروق بن اجدع، عکرمہ، علقمہ جیسے لوگ آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ حضرت عائشہ ایک اعلیٰ درجہ کی فقیہہ تھیں۔ جب کوئی حدیث بیان کرتیں تو اس کی علّت وحکمت بھی بیان کر دیتیں۔ حضرت ابوسعید خدری اور حضرت عبداللہ بن عمر سے جمعہ کے غسل کے بارے میں صرف اس قدر مروی ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا چاہیے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 894؛

صحیح مسلم، حدیث نمبر 846)۔ مگر اسی حدیث کو حضرت عائشہ نے بیان کیا تو یہ بھی فرمایا کہ لوگ دور دور کی آبادیوں سے نماز جمعہ کے لیے مدینہ آتے تھے۔ وہ گرد و غبار سے اٹے ہوتے اور پسینہ سے تر ہوتے اس لیے آپ نے فرمایا کہ تم لوگ نہا لیا کرو (صحیح البخاری، حدیث نمبر 903؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 847)۔

2۔ بنی غفار کی ایک عورت کہتی ہیں کہ میں اپنے قبیلہ کی کچھ عورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ آپ خیبر کے جہاد کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے خدا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ چلیں، تاکہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں، اور جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی مدد کریں۔ آپ نے فرمایا— عَلَى بَرَكَةِ اللّٰهِ: اللہ برکت دے، چلو (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 8، صفحہ 292)۔ انصاری خاتون ام عطیہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزووں میں شرکت کی ہے۔ میں مجاہدین کے کجاووں کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہتی، ان کے لیے کھانا پکاتی، زخمیوں کا علاج کرتی، اور مصیبت زدوں کی نگرانی کرتی (مسند احمد، حدیث نمبر 20792)۔ اسماء بنت یزید بن سکن حضرت معاذ بن جبل کے چچا کی بیٹی تھیں ان کی بابت حضرت مہاجر بتاتے ہیں کہ انھوں جنگ یرموک میں خیمہ کی لکڑی سے نو رومیوں کو قتل کیا (الاصابۃ لابن حجر العسقلانی، جلد 8، صفحہ 22)۔

3۔ مدینہ کے یہودیوں سے جنگ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ عورتوں اور بچوں کو ایک قلعہ کی چھت پر جمع کر کے حسان بن ثابت کو ان کی دیکھ بھال کے لیے وہاں رکھا گیا تھا۔ صفیہ بنت عبد المطلب بھی اسی قلعہ کی چھت پر تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ہمارے قریب سے ایک یہودی گزرا اور ہمارے قلعہ کا چکر لگانے لگا۔ اس وقت بنی قریظہ نے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راستہ

کٹ گیا تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا جو یہود کے مقابلے میں ہماری مدافعت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان دشمن کے مقابلہ پر تھے، وہ ان کو چھوڑ کر ہماری طرف نہیں آسکتے تھے۔ اتنے میں آنے والا یہودی سامنے سے گزرا۔ میں نے کہا اے حسان! دیکھو یہ یہودی ہمارے قلعہ کا چکّر لگا رہا ہے اور میں خدا کی قسم اس سے مامون نہیں۔ کہیں وہ ہماری اس غیر محفوظ حالت کو یہودیوں سے جا کر کہہ نہ دے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب جنگ میں مشغول ہیں۔ پس اترو اور اس کو جا کر قتل کر دو۔ حسان بن ثابت نے کہا: وَاللّٰه لَقَدْ عَرَفْتِ مَا أَنَا بِصَاحِبِ هٰذَا (خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ میں اس کام کا نہیں)۔ وہ کہتی ہیں کہ جب انھوں نے مجھ کو یہ جواب دیا اور میں نے ان کے پاس مارنے کی کوئی چیز نہ دیکھی تو میں کمر سے کپڑا کسا اور ایک لکڑی ہاتھ میں لی۔ پھر قلعہ سے اتر کر اس کے پاس پہنچی اور اس لکڑی سے اس کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کو ہلاک کر دیا۔ پھر جب میں اس سے فارغ ہو گئی تو میں قلعہ میں واپس آئی اور حسان بن ثابت سے کہا کہ قلعہ سے اتر کر جاؤ اور اس کا سامان لاؤ۔ میں صرف اس لیے اس کا سامان اتارنے سے رک گئی کہ وہ مرد تھا۔ حسان بن ثابت نے کہا: اے عبد المطلب کی بیٹی؛ مجھے اس کے سامان کی ضرورت نہیں۔ (البدایہ والنہایہ، جلد 4، صفحہ 109-108)

خدا کی مدد

ہجرت کے چھٹے سال حدیبیہ کے مقام پر جو دس سالہ معاہدہ کیا گیا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی۔ "قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے گا۔ اس کو آپ واپس کر دیں گے اور آپ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس چلا جائے گا اس کو وہ واپس نہ کریں گے: اس معاہدے کی تکمیل کے وقت قریش کی نمائندگی سہیل بن عمرو کر رہے تھے معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ سہیل بن عمرو کے لڑکے

ابوجندل آ گئے۔ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ مگر مکہّ والوں نے ان کو قید کر رکھا تھا۔ مکہ سے حدیبیہ (موجودہ شمیسی) تک 13 میل کا فاصلہ طے کر کے وہ اس طرح آپ کے کیمپ میں پہنچے کہ اب بھی ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور جسم پر مار پیٹ کے نشانات تھے۔ انھوں نے آپ سے فریاد کی کہ مجھ کو اس قید سے نجات دلائی جائے۔ صحابہ کے لیے بھی اپنے مومن بھائی کی یہ حالت دیکھ کر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ مگر سہیل بن عمرو نے کہا کہ معاہدہ کی تحریر چاہے مکمل نہ ہوئی ہو، شرائط تو ہمارے اور آپ کے درمیان طے ہو چکی ہیں۔ اس لیے ابوجندل کو ہمارے حوالہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے ابوجندل کو ان کے حوالہ کر دیا۔

اور وہ روتے ہوئے مکہ واپس گئے۔ اسی طرح ابوبصیر اور دوسرے مسلمان جو قریش کی قید سے بھاگ کر مدینہ آئے، ان کو حسب معاہدہ قریش کو واپس کیا جاتا رہا۔

مگر اس کے برعکس مسلمان عورتوں کے معاملہ میں اس اصول کی پابندی نہیں کی گئی۔ قرآن میں آیت اتری:

> ”اے ایمان والو، جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کی جانچ کرلو، پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو ان کو کفار کی طرف واپس نہ کرو۔“ (60:10)

اس سلسلے میں، مثال کے طور پر یہ واقعہ آتا ہے کہ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچیں مکہ والوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے معاہدہ کا حوالہ دے کر ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ام کلثوم کے دو بھائی ولید بن عقبہ اور عمارہ بن عقبہ انھیں واپس لے جانے کے لیے مدینہ آئے۔ اس کے باوجود ان کو واپس نہیں کیا گیا (مغازی للواقدی، جلد 2، صفحہ 631)۔

بظاہر یہ معاہدہ کی خلاف ورزی تھی۔ اور قریش کے لیے زبردست موقع تھا کہ وہ آپ

کی بدعہدی کا شور مچا کر آپ کو بدنام کریں۔ مگر قریش آپ کے ساتھ انتہائی دشمنی کے باوجود بالکل خاموش ہو گئے انھوں نے اس کے خلاف احتجاج تک نہ کیا۔ ایسا کیوں کر ہوا۔ سیرت اور تفسیر کی عام کتابوں میں اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے لکھا ہے کہ قریش اس لیے خاموش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس معاملہ میں ان کی زبان بند کر دی تھی (احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 229)۔ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی مدد تھی۔ مگر ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں لفظ ''معجزہ'' عام طور پر بولا جاتا ہے۔

معاہدہ کے الفاظ پر غور کر کے اس کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔ دوسری اکثر روایات کی طرح معاہدہ حدیبیہ کی شرائط بھی اکثر راویوں نے اپنے اپنے الفاظ میں بیان کی ہیں۔ مثال کے طور پر زیر بحث شرط کے متعلق مختلف روایتوں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

1۔ مَنْ جَاءَ مِنْكُمْ لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكُمْ، وَمَنْ جَاءَكُمْ مِنَّا رَدَدْتُمُوهُ عَلَيْنَا
(صحیح مسلم، حدیث نمبر 1784)

2۔ مَنْ أَتَى مُحَمَّدًا مِنْهُمْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهِ رَدَّهُ إِلَيْهِ
(مغازی الواقدی، جلد 2، صفحہ 611)۔

3۔ مَنْ أَتَى مُحَمَّدًا مِنْ قُرَيْشٍ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهِ رَدَّهُ عَلَيْهِمْ
(سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 317)

4۔ لَا يَأْتِيكَ مِنَّا رَجُلٌ، وَإِنْ كَانَ عَلَى دِينِكَ إِلَّا رَدَدْتَهُ إِلَيْنَا
(صحیح البخاری، حدیث نمبر 32-2731)۔

آخری روایت بخاری (کتاب الشروط، بَابُ الشُّرُوطِ فِي الْجِهَادِ وَالْمُصَالَحَةِ) کی ہے اور باعتبار سند قوی ہونے کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ غالباً معاہدہ کی مذکورہ شرط کے اصل الفاظ یہی تھے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو اس فقرہ میں رجل (مرد) کے لفظ نے مسلمانوں

کوموقع دیا کہ وہ مکہ سے آئی ہوئی مسلم خواتین کواس دفعہ سے مستثنیٰ قرار دے سکیں۔

معاہدہ کی یہ شرط مسلمانوں کی طرف سے نہ تھی بلکہ مکہ والوں کی طرف سے تھی۔ ان کی جانب سے سہیل بن عمرو نے معاہدہ میں دفعہ کے یہ الفاظ لکھوائے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ دفعہ کے الفاظ لکھواتے وقت سہیل کے ذہن میں ”کوئی شخص“ کا مفہوم ہو جس میں عورت اور مرد دونوں شامل ہوتے ہیں مگر اپنے اس ذہنی مفہوم کو لفظ کی شکل دیتے ہوئے اس کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ ”رجل“ تھا جو عربی زبان میں صرف مرد کے لیے بولا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ام کلثوم بنت عُقبہ کے مدینہ پہنچنے کے بعد جب آپ کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بہن کی واپسی کا مطالبہ کیا تو امام زُہری کی روایت کے مطابق، آپ نے ان کو واپس دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا: كَانَ الشَّرْطُ فِي الرِّجَالِ دُونَ النِّسَاءِ (شرط مردوں کے بارے میں تھی، نہ کہ عورتوں کے بارے میں) احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 229؛ تفسیر رازی، جلد 29، صفحہ 522)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تک خود قریش بھی غالباً اس غلط فہمی میں تھے کہ معاہدہ کی یہ دفعہ ہر طرح کے مہاجرین کے بارے میں ہے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ مگر جب آپ نے توجہ دلائی کہ معاہدہ میں رجل (مرد) کا لفظ لکھا ہوا ہے تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک لفظ کے ذریعہ مسلم خواتین کو ذلّت کی واپسی سے بچالیا۔

گھر کے باہر

حضرت عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جب قرآن کی یہ آیت اتری: کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے تو وہ اس کو کئی گُنا بڑھا کر واپس کرے (2:245)۔ اس آیت کو سن کر حضرت ابوالدحداح نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا اللہ ہم سے قرض چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں اے ابوالدحداح۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے اپنا ہاتھ دکھا

ئیے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نہ کہا کہ پھر میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔

ابوالدحداح کا ایک باغ تھا جس میں چھ سو کھجور کے درخت تھے۔ اس وقت ان کی بیوی ام الدحداح اپنے بچوں کے ساتھ اس باغ میں تھیں۔ روای کہتے ہیں کہ ابو الدحداح آئے اور آواز دی کہ اے ام الدحداح۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ ابو الدحداح نے کہا کہ اس باغ سے نکلو۔ کیوں کہ میں نے اسے اپنے رب کو قرض میں دیدیا۔ ام الدحداح نے کہا کہ اے ابوالدحداح، آپ کا سودا کامیاب رہا۔ اور اپنا سامان اور بچے لے کر وہاں سے چلی آئیں (سنن سعید بن منصور، حدیث نمبر 417؛ مسند احمد، حدیث نمبر 12482)۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوالدحداح کی بیوی کھجوروں کے باغ میں کام کرتی تھیں۔ اس طرح کے واقعات کثرت سے دوراول کی مسلم خواتین کے حالات کے تحت ملتے ہیں جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے معیاری دور میں عورتیں گھر کے اندر بند ہو کر پڑی نہیں رہتی تھیں۔ بلکہ وہ گھر کے باہر کے ضروری کام بھی انجام دیتی تھیں۔ تاہم خواتین کی یہ بیرونی سرگرمیاں برائے ضرورت تھیں، نہ کہ برائے تفریح۔ وہ ایک صالح خاندان کی تعمیر کے لیے ہوتی تھیں، نہ کہ باہر کی دنیا میں مصنوعی مساوات کا مظاہرہ کرنے کے لیے۔

عورت کا مقام

اسلام نے عورت کو جو باعزت مقام دیا ہے اس کی ایک علامتی مثال وہ ہے جو حضرت ہاجرہ کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ اسلام کی عبادتوں میں ایک عظیم ترین عبادت حج ہے۔ ہر صاحب استطاعت آدمی پر فرض ہے کہ وہ زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور مکہ جا کر حج کے مراسم ادا کرے۔ حج کے دوران جو اعمال کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک خاص عمل وہ ہے جس کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی خواہ عالم ہو یا جاہل۔ امیر

ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا کوئی معمولی آدمی ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات بار دوڑے۔ یہ دوڑنا کیا ہے، یہ ایک خاتون کے عمل کی تقلید ہے جس کا نام ہاجرہ تھا۔ وہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان پانی کی تلاش میں سات بار دوڑی تھیں۔ اس لیے ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ جب وہاں جائے تو وہ بھی وہاں سات بار دوڑے۔ گویا ایک عورت کے نقشِ قدم پر چلنے کا حکم تمام انسانوں کو دے دیا گیا۔ چار ہزار سال پہلے مکہ بالکل غیر آباد تھا۔ اس وقت حضرت ابراہیم خدا کے حکم سے حضرت ہاجرہ اور ان کے چھوٹے بچے (اسماعیل) کو لے کر یہاں آئے اور اس بے آب و گیاہ علاقہ میں ان کو بسا دیا تا کہ یہاں کے آزاد ماحول میں ایک زندہ قوم بنے اور بعد کو پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر انقلابی کردار ادا کرے۔

حضرت ابراہیم جب حضرت ہاجرہ کو اس خشک مقام پر چھوڑ کر چلے گئے تو ایک بار پانی کی تلاش میں وہ صفا اور مردہ پہاڑیوں کے درمیان سات بار دوڑیں۔ یہی وہ عمل ہے جس کی تقلید میں ہر حاجی آج بھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ اللہ کے لیے سرگرم ہونے کا ایک سبق ہے جو تمام مردوں اور عورتوں کو ایک خاتون کے عمل کی پیروی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔

عورت کی عظمت کا شاید اس سے بڑا کوئی مظاہرہ نہیں ہوسکتا کہ ہمیشہ کے لیے تمام مردوں کو ایک عورت کے نقشِ قدم پر چلنے کا حکم دے دیا جائے۔

تجربہ کی زبان میں

اسلام میں عورت کی حیثیت کے بارے میں پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ راقم الحروف کے لیے محض ایک نظری بات نہیں اور نہ وہ صرف ایک تاریخی بات ہے جس کو میں نے قدیم اوراق میں پڑھ لیا ہو۔ اسی کے ساتھ یہ میرا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تعلیمات کو میں نے نہ صرف قرآن وحدیث میں اور اسلام کی تاریخ میں پڑھا ہے بلکہ ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے واقعہ بنتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

میرا یہ تجربہ قدرتی طور پر میرے اپنے گھر کی خواتین سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلامی حدود کی بنا پر ایک مسلمان اپنے گھر کی خواتین ہی سے پوری طرح باخبر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں اپنے گھر کے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کی حدود میں رہ کر عورتیں وہ سب کچھ کر سکتی ہیں جن کی زندگی کی تعمیر کے لیے ضرورت ہے یا کبھی ضرورت ہو سکتی ہے۔

ان تجربات کو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ، ان شاء اللہ، اپنی سوانح عمری میں لکھوں گا۔ البتہ ایک تجربہ یہاں تحریر کرتا ہوں جو میری والدہ مرحومہ سے متعلق ہے۔ میری والدہ کا نام زیب النساء (بنت خدابخش) تھا۔ وہ اعظم گڑھ کے ایک دیہات (سنجر پور) میں انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئیں۔ اور 18 اکتوبر 1985 کو دہلی میں انتقال فرمایا۔ بوقت انتقال ان کی عمر تقریباً ایک سو سال تھی۔

والدہ کی تعلیم بس اتنی ہی ہوئی تھی کہ وہ قرآن کی تلاوت کر سکتی تھیں اور معمولی اردو کی کتاب اٹک اٹک کر پڑھ لیتی تھیں۔ تاہم وہ پوری طرح ایک مذہبی خاتون تھیں۔ نماز روزہ کی سختی سے پابند تھیں۔ حج بھی نہایت ذوق وشوق سے کیا تھا۔ ان کو میں نے کبھی جھوٹ بولتے یا اور کوئی غیر اخلاقی فعل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ساری عمر وہ مکمل طور پر پردہ دار

رہیں۔ وہ پورے معنوں میں ایک بااصول اور ایک باکردار خاتون تھیں۔

میرے والد فرید الدین خاں مرحوم کا انتقال 30 دسمبر 1929 کو ہوا۔ وہ اپنے علاقہ کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ ایک روز وہ حسب معمول قریب کے گاؤں (نوادہ) اپنی چھاؤنی پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان پر فالج کا دورہ پڑا۔ بے ہوشی کی حالت میں چارپائی پر لٹا کر گھر لائے گئے۔

اس کے بعد وہ کچھ بول نہ سکے۔ بے ہوشی کی حالت ہی میں اگلے دن ان کا انتقال ہو گیا۔ والدہ اچانک بیوہ ہو گئیں۔ اس وقت ہم لوگ پانچ بھائی بہن تھے۔ بڑے بھائی عبدالعزیز خاں کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ میری عمر پانچ سال اور چھوٹے بھائی عبدالمحیط خاں کی عمر صرف ایک سال۔ اسی طرح دونوں بہنیں بھی چھوٹی عمر میں تھیں۔ بہنوں کا انتقال والدہ کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ ہم تینوں بھائی خدا کے فضل سے تادم تحریر زندہ ہیں۔

اس وقت والد کا انتقال ہمارے لیے ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص تاڑ سے اچانک زمین پر گر پڑے۔ اس کی وجہ تمام تر مصنوعی تھی، نہ کہ حقیقی۔ مخصوص اسباب کے تحت جو دورِ زراعت میں اکثر مشترک خاندانوں میں پیش آتے رہے ہیں، والد کے انتقال کے بعد ہمارے گھر کا ماحول ہمارے لیے غیر موافق ہو گیا۔ بعض رشتہ داروں کے زیر اثر ایسا ہوا کہ گھر کے اکثر افراد کا سلوک ہمارے ساتھ وہ نہ رہا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ صورت حال اتنی بڑھی کہ ہم گھر کے اندر اجنبی بن گئے۔ حتیٰ کہ زمین دار ہوتے ہوئے، کم از کم وقتی طور پر، ہمارا یہ حال ہوا جیسے کہ ہم بے زمین ہوں۔ جیسے کہ گھر کی چیزوں میں ہمارا کوئی حصّہ ہی نہ ہو۔ ہم لوگ اپنے ماحول میں بے سروسامان بھی ہو گئے اور اسی کے ساتھ حقیر بھی۔

ہمارا آبائی مکان بہت بڑا تھا۔ مگر والد کے انتقال کے بعد ہم نے اپنے آپ کو ایک ایسے گھر میں پایا جو گھوڑے کے اصطبل کے لیے بنایا گیا تھا اور اب کھنڈر ہو جانے کی وجہ

سے اصطبل کے طور پر استعمال نہیں ہو رہا تھا۔ مزید یہ کہ گھر میں نہ کھانے کے لیے سامان تھا اور نہ ضروری چیزوں کی خریداری کے لیے پیسہ۔ اس حالت میں لوگ والدہ کو طرح طرح کے مشورے دینے لگے۔ کسی نے کہا کہ آپ دوسرا نکاح کرلیں۔ کسی نے کہا کہ میکے چلی جائیں۔ کسی نے کہا کہ مقدمہ کے ذریعہ اپنی جائداد حاصل کریں۔ مگر والدہ نے اس قسم کے تمام مشوروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ایک بہادر اسلامی خاتون کی طرح انھوں نے حالات سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ میں ان کا سارا انحصار صرف دو چیزوں پر تھا— اللہ سے دعا اور اپنے دست و بازو کی محنت۔

والدہ کے میکہ میں بہت بڑی زمین داری تھی۔ مزید یہ کہ ہمارے نانا مرحوم نے اپنی موت سے پہلے تقریباً 20 ایکڑ زمین والدہ کے نام لکھ دی تھی۔ مگر والدہ نے اس معاملہ میں مکمل استغناء کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اپنے میکہ سے نہ کبھی زمین کا مطالبہ کیا اور نہ اپنی حالت بیان کر کے ان سے مدد کی درخواست کی۔ وہ توکل علی اللہ کا زندہ نمونہ بن گئیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ وہ صبح اندھیرے بستر سے اٹھ جاتیں اور فجر کی نماز پڑھ کر سارے دن مسلسل کام کرتی رہتیں۔ رات کو دیر سے عشاء کی نماز پڑھ کر سوتیں۔ وہ کیا کام تھا جس میں وہ اپنے گھر کے اندر سارے دن مصروف رہتی تھیں۔ انھوں نے یہ کیا کہ گھر کے اندر مرغیاں پال لیں۔ اسی کے ساتھ ان کے یہاں بہت سی بکریاں پلی ہوئی تھیں۔ یہ ان کا مستقل کاروبار تھا۔ والدہ کے اسی ذوق کی وجہ سے مجھے پیغمبروں کی اس سنت پر عمل کرنے کا موقع ملا کہ میں نے اپنے بچپن میں بکریاں چرائیں۔ اپنے سب بھائیوں میں صرف مجھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔

اسی کے ساتھ والدہ نے سلائی کا کام بھی شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں سلائی کی مشین عام نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ گاؤں کے لوگوں کے کپڑے وہ ہاتھ سے سیتی تھیں۔ اس سلائی کی

کوئی اجرت مقرر نہ تھی۔ وہ رضا کارانہ طور پر لوگوں کے کپڑے سیتی تھیں اور لوگ بھی رضا کارانہ طور پر غلہ وغیرہ ہمارے یہاں پہنچا دیا کرتے تھے۔ بعد کو والدہ نے بھینس بھی پال لی۔ اسی کے ساتھ وسیع کھلے ہوئے صحن میں وہ مختلف قسم کی سبزیاں اور پپیتے وغیرہ بو دیتی تھیں جس سے کافی فصل نکلتی تھی۔ والدہ مرحومہ کی اس زندگی سے متاثر ہو کر ایک بار یہ شعر میری زبان پر آ گیا تھا:

مرغی بکری سبزی پھل   ہے مومن کی معاش کا حل

اس زمانہ میں ایک عورت نے والدہ کی حالت کو دیکھ کر کہا تھا آپ کو بلّی کے بچوں کی رکھوالی ملی ہے۔ یہ تبصرہ لفظ بلفظ درست تھا۔ ہم لوگ اس زمانہ میں واقعۃً بلی کے بچوں کی مانند تھے۔ والدہ نے اگر غیر معمولی قربانی کے ذریعہ ہماری پرورش نہ کی ہوتی تو شاید ہم لوگوں کا وہی انجام ہوتا جو بلی کے چھوٹے بچوں کا اس وقت ہوتا ہے۔ جب کہ وہ اپنی ماں کی سرپرستی سے محروم ہو گئے ہوں۔

ہم لوگوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے سلسلہ میں والدہ نے برسہا برس تک جو کچھ کیا اور جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا، ان کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ وہ خود ایک مستقل کتاب ہے۔ اس وقت ہماری جو معاشی حالت تھی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار مجھے غلیل بنانے کا شوق ہوا۔ غلیل کا ربر اس وقت ایک پیسہ میں ملتا تھا۔ مگر ہمارے گھر میں ایک پیسہ موجود نہ تھا جس کے ذریعہ میں ربر خرید سکوں۔ ایک صاحب کے علم میں یہ بات آئی تو انھوں نے مجھے ایک پیسہ دیا اور میں نے دکان جا کر غلیل کا ربر خریدا۔ یہ میرا حال اس وقت تھا جب کہ میں علاقہ کے سب سے بڑے زمیندار خاندان کا ایک فرد تھا۔

والد مرحوم کے انتقال کے بعد ہم معاشی اعتبار سے صفر کے درجہ میں پہنچا دیے گئے تھے۔ ایسی حالت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ والدہ کو کیا کچھ مشقت اٹھانی پڑی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے عورت ہوتے ہوئے مردوالا کام کیا۔ گھر میں رہ کر باہر کی دنیا پر اثرانداز ہوئیں۔ حالات نے انھیں اپنا معمول بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا، مگر انھوں نے خود حالات کو اپنا معمول بنالیا۔ انھوں نے اسلام کے حدود میں رہ کر وہ سب کچھ کیا جس کو کرنے کے لیے غیرضروری طور پر خواتین کو اسلام کی حدود سے باہر نکالنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔

والدہ نے جو کچھ کیا وہ اسلامی جذبہ کے تحت کیا۔ وہ ہمیشہ انسانوں کے بجائے خدا کی طرف دیکھتی تھیں، اور دنیا کے اعتبار سے سوچنے کے بجائے آخرت کے اعتبار سے سوچتی تھیں۔ تاہم انھوں نے جو کچھ کیا وہ سادہ طور پر محض روایتی دینی ذہن کے تحت تھا۔ وہ کوئی صاحب علم خاتون نہ تھیں کہ اپنے عمل کے فلسفیانہ پہلوؤں پر غور کرسکیں۔ مگر آج جب میں اپنی ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر سوچتا ہوں تو مجھے ان کا عمل انتہائی عظیم نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے مقابلے میں مجھے یہ بات بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں اور پھر کسی دفتر کی شاندار کرسی پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔

والدہ نے اپنی مذکورہ قربانی سے نہ صرف بچپن میں ہماری پرورش کی بلکہ ان کے اسلامی مزاج نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ ہمیں اس سے بھی زیادہ بڑا عطیہ دے سکیں۔ یعنی خدا کی دنیا میں کامیابی اور ترقی کا راز۔ وہ راز تھا مثبت طرز فکر اور حقیقت پسندی کا مزاج جو ہم تینوں بھائیوں کو مشترک طور پر ملا۔ ہمیں یہ عطیہ دینے والی تنہا ہماری والدہ تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ والد کے انتقال کے بعد ہمارے رشتہ کے ایک ماموں (شیخ عبد الغفور) برابر ہمارے یہاں آنے لگے۔ وہ زبردست مقدمہ باز آدمی تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ والدہ اپنے میکہ کی بیس ایکڑ زمین کے لیے عدالت میں مقدمہ کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ صرف دعوے کے کاغذ پر دستخط کر دیجیے، باقی سب کام میں خود کروں گا اور یہ ساری زمین آپ کو مل جائے گی۔ غالباً وہ برسوں تک ہمارے یہاں آتے رہے۔ مگر والدہ کسی

قیمت پر مقدمہ کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئیں۔

دوسری طرف ہم لوگوں کی اپنی آبائی جائداد کا معاملہ تھا جس سے محرومی ہر آن زندہ اشتعال بن کر ہمارے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور یہ دعوت دیتی تھی کہ اپنا حق وصول کرنے کے لیے لڑو۔ بعد کو بعض لوگوں کے کہنے سے ہمیں کچھ زمینیں دی گئیں مگر وہ عملاً نہ دینے کے برابر تھا۔ کیوں کہ جتنی بے کار اور بنجر زمینیں تھیں وہ چھانٹ کر ہمارے حوالے کر دی گئیں۔ یہ صورت حال فریق ثانی کے خلاف لامتناہی لڑائی چھیڑنے کے لیے بالکل کافی تھی۔ مگر والدہ نے یہاں بھی صبر کے سوا کسی اور چیز کے لیے کبھی نہیں سوچا۔ وہ اکثر ہم لوگوں کو صبر کی تلقین کرتیں اور اس سلسلہ میں ایک دیہاتی شاعر کا یہ شعر ہمیں سناتیں:

صبر بدلے میں دائم بھشت پائم

اس وقت ہمارے جو خاندانی حالات تھے وہ مکمل طور پر ہم کو منفی سوچ کی طرف لے جانے والے تھے۔ یہی وہ حالات ہیں جن میں کسی خاندان کے افراد مقدمہ بازیوں میں اُلجھتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والے لڑائی جھگڑے برپا ہوتے ہیں۔ قیمتی زندگیاں ہلاک ہوتی ہیں۔ لوگ مستقل طور پر تخریبی کارروائیوں کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ والدہ اگر اس وقت ردعمل کا طریقہ اختیار کرتیں تو ان کے بچوں کا جو حال ہوتا وہ یہ کہ وہ منفی ماحول میں پلتے۔ ان کے اندر تخریبی احساسات جنم لیتے۔ ہم میں سے ہر ایک ضد اور انتقام کی نفسیات کا کارخانہ بن کر رہ جاتا۔

مگر والدہ مرحومہ کے یک طرفہ صبر نے ہماری زندگیوں کا رخ بدل دیا۔ والدہ کے زیرِ سایہ ہم سب بھائیوں کے اندر یہ سوچ ابھرنے لگی کہ ہمیں دوسروں سے نہیں لڑنا ہے۔ ہمیں خود اپنی محنت کے بل پر اپنے آپ کو اوپر اٹھانا ہے۔ جو کچھ ہم سے چھینا گیا تھا اس سے ہماری نظریں ہٹ گئیں۔ ہماری ساری توجہ اس چیز پر لگ گئی جو چھننے کے بعد بھی

ہمارے پاس ابھی تک باقی تھا، یعنی خدا کا دیا ہوا انسانی وجود۔

آج تو میں اس حقیقت کو شعوری طور پر جان رہا ہوں۔ مگر اُس وقت یہ مزاج غیر شعوری طور پر صرف والدہ کی تربیت کے نتیجے میں ہمارے اندر پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم تینوں بھائیوں کا معاملہ یہ ہوا کہ ہم لوگ مقامِ نزاع سے ہٹ گئے۔ ہم میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی غیر نزاعی مقام پر اپنے لیے عمل کا میدان تلاش کرلیا۔ ہم تینوں بھائیوں کی راہ اگرچہ الگ الگ بنی۔ مگر ذہن سب کا ایک تھا۔ یعنی اندرونی بے انصافیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے باہر کی وسیع دنیا میں اپنے لیے راہ عمل تلاش کرنا۔ انسان سے نہ پا کر خدا سے پانے کا طلب گار بننا۔

ہمارے بڑے بھائی عبد العزیز خاں صاحب اپنی زندگی کے اگلے مرحلہ میں تجارت کے راستہ پر لگ گئے۔ 1944 میں وہ "ہجرت" کر کے شہر اعظم گڑھ گئے۔ وہاں انھوں نے تقریباً بلا سرمایہ ایک تجارتی کام کا آغاز کیا۔ وہ برابر شدید جدو جہد کرتے رہے۔ 40 برس بعد اب الٰہ آباد میں ان کا لائٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ کے نام سے بجلی کا سامان بنانے کا کارخانہ ہے اور وہ اس کے چیئرمین ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد وہ اپنے خاندان کے سب سے زیادہ حقیر فرد شمار کیے جاتے تھے، آج وہ وسیع خاندان کے سب سے زیادہ معزز فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے آبائی جائداد کی نئی تقسیم کرا کر اپنا پورا حق دوبارہ لے لیا جو اس سے پہلے انھیں نہیں دیا گیا تھا۔

میرے چھوٹے بھائی عبد المحیط خاں سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم کی طرف گئے۔ لمبی جدو جہد کے بعد انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ انجینئرنگ کی ڈگری لی اور اب وہ حکومت یو پی کے ٹیکنیکل ایجوکیشن کے محکمہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ اپنے انتھک عمل، اپنے بے داغ کردار اور اپنی با اصول زندگی کے نتیجے میں وہ پورے محکمہ میں ایک ممتاز شخصیت کے مالک بن گئے ہیں۔

راقم الحروف کی توجہ دینی تعلیم کی طرف ہوئی۔ اولاً میں نے عربی درس گاہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد میں نے زبردست کوشش سے انگریزی زبان وعلوم کو پڑھا۔ اب اللہ کی توفیق سے میں جوکام کررہا ہوں اس سے ان سطروں کے قارئین بخوبی واقف ہیں۔

1976 میں ماہنامہ الرسالہ کے اجراء کے بعد سے جو کام میں کررہا ہوں، اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو یہ سبق دے رہا ہوں کہ وہ منفی سوچ سے اوپر اٹھیں اور مثبت سوچ کا طریقہ اختیار کریں۔ الرسالہ کی یہ تحریک اب خدا کے فضل سے مسلم دنیا کی ایک طاقتور تحریک بن چکی ہے۔ مجھ کو اکثر اہل علم کی طرف سے زبانی یا تحریری طور پر ایسے تبصرے ملتے رہتے ہیں جن میں اس بات کا اعتراف ہوتا ہے کہ دورجدید میں الرسالہ کی تحریک پہلی اسلامی تحریک ہے جس نے مسلمانوں کو منفی کارروائیوں سے ہٹا کر مثبت تعمیر کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی۔

ایسے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اگر یہ واقعہ ہے تو اس کا کریڈٹ سب سے زیادہ اس مسلم خاتون کو جاتا ہے جس کا نام زیب النساء تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس عالم مادی میں اگر کوئی ہے جس کو الرسالہ کی تعمیری تحریک کا ابتدائی بانی کہا جاسکے تو وہ یقیناً میری والدہ زیب النساء ہیں، وہ زیب النساء جو نام نہاد آزادیِ نسواں کی تحریک سے نہ صرف بہت دور تھیں بلکہ وہ اس کا نام بھی نہیں جانتی تھیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ والدہ محترمہ کے لیے وہ ایک غیر شعوری معاملہ تھا، اور میری ذات میں اللہ تعالیٰ نے اس کو شعوری دریافت تک پہنچایا ہے۔

میں اپنے قریبی رشتہ داروں میں ایک سے زیادہ ایسے افراد کو جانتا ہوں جو کم عمری میں ماں کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پوری زندگی بربادی کا نشان بن کر رہ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ماں کے روپ میں عورت کا رول انسانی زندگی میں بہت زیادہ

ہے۔ عبداللہ بن زبیر کی ماں (اسماء) نے ان کو ایک بڑے اقدام پر ابھارا۔ چنانچہ ایک شخص جو اقدام کا ارادہ چھوڑ چکا تھا، وہ دوبارہ اقدام کے لیے آمادہ ہوگیا (الطبقات الکبری، جلد 2، صفحہ 2-501)۔ شہنشاہ اکبر کی ماں (مریم مکانی) نے اکبر کو ملّا عبدالنبی کے خلاف کارروائی سے روکا۔ چنانچہ اکبر ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے سے باز رہا، وغیرہ وغیرہ (مآثرالامراء، جلد 2، صفحہ 560)۔

راقم الحروف اگر بچپن میں ماں سے محروم ہوجاتا۔ یا اگر مجھ کو ایسی ماں ملتی جو مجھے اپنے "دشمنوں" کے خلاف لڑنے جھگڑنے پر اکساتی رہتی تو یقینی طور پر میری زندگی کا رخ بالکل دوسرا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسے انجام سے بچایا، اور مجھ کو اپنی ایک صداقت کے اظہار کا ذریعہ بنادیا۔ تاہم اس عالم اسباب میں جو ہستی اس واقعہ کا ابتدائی ذریعہ بنی وہ یقیناً ایک خاتون تھی اور وہ بھی اسلامی اصول کے مطابق ایک خانہ نشین خاتون۔

باب سوم

زوجین کے حقوق

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ عورتیں مردوں کے لیے لباس ہیں اور مرد عورتوں کے لیے لباس ہیں:

هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ (2:187)۔

یہ الفاظ تمثیل کے انداز میں بتاتے ہیں کہ قرآن کے نزدیک عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے کیا ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے لباس کی مانند ہیں۔ جسم لباس کے بغیر ادھورا ہے اور لباس جسم کے بغیر بے معنی ہے۔ یہی معاملہ مرد اور عورت کا ہے۔ لباس اور جسم کے درمیان جو مادی تعلق ہوتا ہے، وہی تعلق زیادہ گہرے نفسیاتی معنی میں عورت اور مرد کے درمیان پایا جاتا ہے۔

ایک چڑیا اپنے پروں کے ساتھ قدر خوبصورت معلوم ہوتی ہے لیکن اگر چڑیا کے تمام پرَ اس کے جسم سے جدا کر دیے جائیں تو اس کا پورا حُلیہ بگڑ کر رہ جائے گا۔ چڑیا کے لیے اس کے پروں کی جو اہمیت ہے وہی اہمیت انسان کے لیے اس کے لباس کی ہے۔ لباس کے بغیر انسان ویسا ہی ہے جیسے پرَ وں کے بغیر چڑیا۔

لباس کی مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے کتنی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کے سب سے زیادہ قریبی ساتھی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے آخری حد تک جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں۔ عورت کے بغیر مرد کا وجود ادھورا ہے اور مرد کے بغیر عورت کا وجود ادھورا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت ملتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا پردہ ہیں۔ ایک

انگریزی مفسر کے الفاظ میں، دونوں ایک دوسرے کے لیے اسی طرح موزوں ہیں جس طرح لباس جسم کے اوپر موزوں ہوتا ہے۔

"Fitting into each other as a garment fits the body."

مرد اور عورت کے درمیان پیدائشی طور پر صنفی کشش رکھی گئی ہے۔ مرد کے لیے عورت کے اندر کشش ہے اور عورت کے لیے مرد کے اندر کشش ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (30:21) یعنی، اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے پیدا کیا تمہاری جنس سے جوڑے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔

اس فطری تعلق کی بنا پر عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان آزادانہ اختلاط ہو۔ مگر یہ طریقہ فطرتِ انسانی کے سراسر خلاف ہے۔ انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ جو چیز اس کی ہے وہ صرف اسی کے لیے خاص رہے۔ اس لیے آزادانہ صنفی تعلق کا طریقہ انسانی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اکثر غلط طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انسان ایک اخلاقی حیوان ہے۔ انسان اور حیوان میں جسمانی مشابہت ہے۔ مگر اخلاقی اعتبار سے انسان کا معاملہ حیوانات سے یکسر مختلف ہے۔ حیوانات اپنے اندر کوئی اخلاقی احساس نہیں رکھتے۔ مگر انسان کے اندر اخلاقی احساس موجود ہے۔ اس اخلاقی

احساس اور دوسرے تمدنی مصالح کا تقاضا ہے کہ مرد اور عورت آزادانہ طور پر جنسی تعلق قائم نہ کریں۔ بلکہ اخلاقی پابندیوں کے دائرے میں رہ کر اپنے جنسی تقاضے پورے کریں۔ اسی مصلحت کی بنا پر شریعت میں نکاح کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ کچھ متعین رشتوں کو حرام قرار دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ مرد اور عورت آپس میں نکاح کا رشتہ قائم کرکے خاندانی زندگی گزاریں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (4:24)۔ اور ان (حرام عورتوں) کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں، بشرطیکہ تم اپنے مال کے ذریعہ سے ان کے طالب بنو۔ ان کو قید نکاح میں لے کر، نہ کہ بدکاری کے طور پر۔

عورت اور مرد کے درمیان فطری طور پر صنفی کشش پائی جاتی ہے۔ اسی صنفی کشش کی اخلاقی تنظیم کا دوسرا نام نکاح ہے۔ انسانی نفسیات، حیاتیاتی حقائق اور تمدنی مصالح سب کا مشترک تقاضا ہے کہ عورت اور مرد کا صنفی تعلق منظم انداز میں ہو، اور اس تنظیم کے لیے نکاح سے بہتر کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ نکاح کا طریقہ انسانی طریقہ ہے اور نکاح کے بغیر جنسی تعلق کرنا غیر انسانی طریقہ۔

شریکِ حیات

مرد اور عورت (یا میاں اور بیوی) کے حقوق و فرائض جس بنیادی اصول کے تحت متعین ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں۔ یہ بنیادی اصول قرآن کی اس آیت سے نکلتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عورت اور مرد آپس میں ایک دوسرے کا جزء ہیں: بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ (3:195)۔ عورت اور مرد کی یہ باہمی حیثیت کہ وہ ایک دوسرے کی زندگی کا حصہ یا ایک دوسرے کے رفیقِ حیات ہیں، یہی وہ بنیادی اصول

ہے جس سے یہ متعین ہوتا ہے کہ ایک کے اوپر دوسرے کا حق کیا ہے، اور ایک کو دوسرے کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔

اس اعتبار سے جدید تہذیب اور اسلامی شریعت کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ جدید تہذیب عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا ہمسر قرار دیتی ہے۔ اور اسلامی شریعت کے نزدیک عورت اور مرد ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں۔ اسی فرق میں دونوں کے معاشرتی نظام کے فرق کو دیکھا جا سکتا ہے۔

دینِ فطرت

اسلام فطرت کا دین ہے۔ اسلام کی تعلیمات فطرت کے سادہ اصولوں پر مبنی ہیں۔ عورت اور مرد کے باہمی تعلق کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس معاملہ میں اسلام نے چند سادہ اصول مقرر کر دیے ہیں۔ یہ سادہ اصول ہر ایک کے لیے قابل عمل ہیں۔ اگر ان کو سنجیدگی کے ساتھ اختیار کر لیا جائے تو ہر خاندان سکون اور عافیت کا گہوارہ بن جائے گا۔

عورت اور مرد کے تعلق کے بارے میں فقہاء اسلام نے بہت سی تفصیلات وضع کی ہیں۔ مگر یہاں ہم کو ان فقہی تفصیلات سے کوئی بحث نہیں ہے۔ ہم صرف وہ بنیادی اصول بیان کریں گے جو قرآن وحدیث میں مقرر کیے گئے ہیں۔ اور جو دراصل اسلامی طرز معاشرت کی اساس ہیں۔ اس معاملہ کی فقہی اور جزئی تفصیلات پر ہر زبان میں کتابیں موجود ہیں۔ دلچسپی رکھنے والے لوگ انھیں ان کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

عورت کے مقابلہ میں مرد کی حیثیت

عورت اور مرد جب باہم ازدواجی زندگی میں منسلک ہوتے ہیں تو اس کے بعد لازمی طور پر ایک اجتماعی ادارہ وجود میں آتا ہے جس کا نام خاندان ہے۔ ہر اجتماعی ادارے کی طرح اس اجتماعی ادارے کی بھی ایک ضرورت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس ادارے کا ناظم اور

نگراں کون ہو۔ اسلام نے خاندانی ادارہ کے انتظام اور نگرانی کے لیے مرد کا انتخاب کیا ہے:
الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (4:34)۔ یعنی، مرد، عورتوں کے اوپر قوام ہیں۔

مرد کو قوّام بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد عورت سے افضل ہے۔ یہ تقرر انتظامی بنیاد پر ہے، نہ کہ افضلیت کی بنیاد پر۔ جمہوری نظام میں ہر آدمی کے لیے یکساں درجہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جب حکومت قائم کی جاتی ہے تو ایک شخص کو حاکم (بالفاظ دیگر قوّام) مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ حاکم دوسرے شہریوں کے مقابلہ میں افضل یا برتر ہے۔ جمہوری نظام میں صدر یا وزیر اعظم کا ووٹ بھی ایک ہوتا ہے جس طرح عام افراد قوم کا صرف ایک ووٹ ہوتا ہے، اس کے باوجود انتظامی مصلحت کے تحت ایک شخص کو دوسروں کے اوپر حاکمانہ اختیار تفویض کیا جاتا ہے۔

انتظامی تقسیم کے علاوہ درجہ کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عورت اگر ایک مرد کو قتل کرے تو جرم ثابت ہونے کے بعد عورت سے قصاص لیا جائے گا۔ اسی طرح ایک مرد اگر ایک عورت کو قتل کر دے تو جرم ثابت ہونے کے بعد مرد سے اس کا قصاص لیا جائے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:
أَنَّ الرَّجُلَ يُقْتَلُ بِالْمَرْأَةِ (بے شک عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے گا) سنن الدارمی، حدیث نمبر 2399۔

شریعت کی نظر میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی قانونی تفریق نہیں۔ جو قانون مرد کے لیے ہے وہی قانون عورت کے لیے بھی ہے۔ جو چیز ایک کے لیے ہے وہی دوسرے کے لیے ہے، جو چیز ایک کے لیے نہیں وہ دوسرے کے لیے بھی نہیں۔

مہر

نکاح کے بعد سب سے پہلی ذمہ داری جو مرد کے اوپر اپنی بیوی کے سلسلہ میں عاید

ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ مقررہ مہر اسے ادا کرے: وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (4:4)۔ یعنی، اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔

یہ مہر عورت کے اوپر حقوق زوجیت حاصل کرنے کا معاوضہ نہیں ہے۔ حقوق زوجیت کا معاملہ اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ مہر کی مروجہ رقم اس کا معاوضہ بن سکے۔ مہر کی یہ رقم دراصل ایک علامتی رقم ہے۔ وہ ہونے والی بیوی کے لیے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کی ایک مادی علامت ہے جو مرد کو زندگی کے آخری لمحہ تک ادا کرنا ہے۔

یہ ذمہ داری کیا ہے۔ یہ ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تاحیات عورت کا نگراں اور کفیل رہے گا۔ خاندانی تنظیم میں شریعت نے اصلاً عورت کے ذمہ یہ کام کیا ہے کہ وہ گھر کو سنبھالے۔ وہ اگلی نسل کی پرورش اور تربیت کرے۔ یہ کام ایک غیر نفع آور کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کی کفالت کو مرد کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ اگر عورت کے اوپر بیک وقت دونوں ذمہ داری ڈال دی جائے۔ وہ گھر کے نظام کو بھی سنبھالے اور اسی کے ساتھ وہ اپنی معاش بھی پیدا کرے۔ تو وہ دونوں میں سے کسی کام کو بھی ٹھیک طور پر انجام نہ دے سکے گی۔ اس لیے اس کی معاشی کفالت کو مرد کے ذمہ رکھا گیا ہے تاکہ گھر کے نظام کے اعلیٰ بندوبست کی ضمانت ہو سکے۔ ازدواجی تعلق کے آغاز میں مہر کی صورت میں ایک رقم دے کر مرد علامتی طور پر یہ عہد کرتا ہے۔

نفقہ

مہر کے ذریعہ مرد جو علامتی عہد کرتا ہے، اسی کی متعین مالیاتی صورت کو نفقہ کہا جاتا ہے۔ ہر عہدہ اپنے ساتھ ذمہ داری لاتا ہے۔

مرد کا قوام ہونا ایک عہدہ ہے اور اس عہدہ کی ذمہ داری کا نام نفقہ ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا

مِنۡ أَمۡوَالِهِمۡ (4:34)۔ یعنی، مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے۔

گھر کی ریاست میں مرد کو قوام (سربراہ) بنایا گیا ہے۔ اس کی وجہ عورت کے اوپر مرد کی پیدائشی فضیلت ہے۔ تاہم اس سے مراد مطلق یا کلّی فضیلت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف وہ فضیلت یا خصوصیت ہے جو مرد کے لیے قوامیت کا استحقاق ثابت کرتی ہے۔ آیت میں ''بعض کو بعض پر فضیلت'' کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی اعتبار سے دوسرے کے اوپر فضیلت حاصل ہے۔ قوّامیت کے لیے جو صفات درکار ہیں وہ مرد کے اندر زیادہ ہیں، اس لیے مرد کو گھر کا قوّام بنایا گیا ہے۔ اس کے برعکس، گھر سنبھالنے اور نئی نسل کی پرورش اور تربیت کے لیے جو صفات درکار ہیں وہ مقابلۃً عورت کے اندر زیادہ ہیں۔ عورت کی اسی افضیلت کی بنا پر اس کو گھر کے اندرونی امور کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

عورت کے لیے نفقہ کا حق مرد کے اوپر اس کا ایک قانونی حق ہے۔ مرد اگر اس کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو عورت اس کو عدالت کے ذریعہ وصول کرسکتی ہے۔ تاہم اس کی مقدار کا تعین مرد کی استطاعت کے لحاظ سے ہوگا۔ استطاعت اگر زیادہ ہے تو اس کی مقدار زیادہ ہوگی۔ اور استطاعت اگر کم ہے تو اس کی مقدار بھی اسی نسبت سے کم ہوجائے گی۔

حسن سلوک

مرد کو ہر حال میں اس کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ عورت کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ اختیار کرے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالۡمَعۡرُوفِ فَإِنۡ كَرِهۡتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنۡ تَكۡرَهُوا شَيۡـًٔا وَيَجۡعَلَ اللهُ فِيهِ خَيۡرًا كَثِيرًا (4:19)۔ یعنی، عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بڑی بھلائی رکھ دی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کا حکم صرف پسندیدہ حالات میں نہیں ہے بلکہ اس وقت بھی ہے جب کہ بظاہر وہ مرد کے لیے زیادہ پسندیدہ نہ ہوں۔ یہ ایک مطلق حکم ہے۔ اس پر ایک مرد کو اس وقت بھی عمل کرنا ہے جب کہ اس کی بیوی اس کے لیے ایک پسندیدہ عورت ہو، اور اس وقت بھی جب کہ کسی وجہ سے وہ اس کی پسند سے مطابقت نہ کرے۔

عورت کے ساتھ حسن سلوک کا یہ حکم اتنا زیادہ اہم ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی کے لیے اس کو شرط لازم قرار دیدیا گیا ہے۔ یعنی ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت صرف اس شخص کے لیے ہے جو ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرسکے۔ جو ہر ایک کے ساتھ کامل عدل کا رویہ اختیار کرے۔ جو شخص عدل کا رویہ اختیار نہ کرسکے اس کے لیے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہیں۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم ان کے درمیان انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (4:3)۔

معاشرت بالمعروف کا لفظ ایک عام لفظ ہے۔ اس میں وہ تمام مطلوب چیزیں شامل ہوجاتی ہیں جن کا انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے یا جو خاندانی نظام کی درستگی کے لیے عقلاً یا شرعاً ضروری سمجھی جائیں۔ یہ معاشرت بالمعروف اسلام میں اتنا زیادہ اہم ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے اہل وعیال کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں (خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي) سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1977۔

عورت کی ذمہ داریاں

عورت کو مرد کے ساتھ (ایک بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ) کس طرح رہنا چاہیے۔ یہ فطرت کی زبان میں ہر عورت کے اندر پیشگی طور پر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر عورت فی الواقع سنجیدہ ہو تو خود اس کی اندرونی فطرت اس معاملہ میں اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہوجائے گی۔ یہی

مطلب ہے اس آیت کا کہ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ فرماں بردار ہوتی ہیں اور رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں (سورہ النساء، 4:34)۔

مرد کے حق میں عورت کی جو ذمہ داریاں قرآن وسنت میں بتائی گئی ہیں، وہ دراصل اسی فطرت نسوانی کا تعین ہیں۔ اگر عورت کی فطرت زندہ ہو، اور وہ حقیقت پسند بن کر زندگی گزارنا چاہے تو وہ اسلام کی ان تعلیمات کو اپنے لیے اجنبی نہیں پائے گی بلکہ ان کو خود اپنے دل کی آواز سمجھ کر انھیں قبول کرلے گی۔ یہاں ہم ان اسلامی اصولوں کو چند عنوانات کے تحت مختصراً درج کرتے ہیں۔

اطاعت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ نیک بخت عورتیں قانتات (4:34) ہوتی ہیں۔ قانتات کی تشریح حضرت عبداللہ بن عباس نے المُطِیعاتُ لأَزْوَاجِهِنَّ کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی نیک بخت عورتیں اللہ کی نظر میں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرماں بردار ہوں۔

یہ اس تقسیم کا فطری تقاضا ہے جس کے تحت مرد کو خاندانی نظام میں قوّام بنایا گیا ہے۔ ملک کا حکمراں ملک کے نظام کو اسی وقت درست طور پر چلا سکتا ہے جب کہ ملک کے عوام حکمراں کی اطاعت کرنے پر راضی ہوں۔ اگر عوام اطاعت نہ کریں تو بہتر سے بہتر حکمراں بھی ملک کے نظام کو درست کرنے میں ناکام رہے گا۔

یہی معاملہ گھر کے نظام کا بھی ہے۔ گھر کسی قوم کی وسیع تر اجتماعیت کی ابتدائی وحدت ہے۔ چھوٹی چھوٹی وحدتیں جب درست ہوں گی، اسی وقت بڑی اجتماعیت درست ہوسکتی ہے۔ اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ گھر کے اندر اطاعت اور موافقت کی فضا ہو۔ عورت کو بلاشبہ اختلاف اور مشورہ کا حق ہے۔ مگر جب مرد ایک بات کا فیصلہ کردے تو عورت کے اوپر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ پوری وفاداری کے ساتھ مرد کے فیصلہ کی پابند بن جائے۔

مرد باہر کی دنیا کے تجربات کی بنا پر نسبتاً وسیع ذہن کے ساتھ سوچتا ہے۔ اس کے طرز فکر

میں حقیقت پسندی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں عورت کی سوچ میں اکثر محدودیت آجاتی ہے۔ وہ جذباتیت کا شکار ہونے لگتی ہے۔ یہ ایک حد تک عورت کے پیدائشی مزاج اور اس کے دائرہ کار کا خاصہ ہے۔ تاہم عورت کے اندر اپنی اس کمی کا احساس ہونا چاہیے۔ وہ مرد کو مشورہ دے سکتی ہے۔ مگر مرد کے مقابلے میں بے لچک اصرار اس کے لیے درست نہیں۔

گھر کا نظام ایک چھوٹی سی جمہوریت ہے۔ مگر ہر جمہوریت کا ایک لیڈر رہوتا ہے۔ اور گھر کی جمہوریت کا لیڈر اسلامی شریعت نے مرد کو بنایا ہے۔

راز کی حفاظت

عورت کے اوپر مرد کا دوسرا حق ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللهُ (4:34)۔ یعنی، صالح عورتیں مرد کے رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان کے رازوں کی حفاظت کی ہے۔

عورت مرد کا لباس ہوتی ہے۔ جس طرح لباس آدمی کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اسی طرح عورت آدمی کے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ میاں اور بیوی وہ واحد ساتھی ہیں جن کے لیے باہم ایک دوسرے کی شرمگاہوں تک کو بے نقاب کرنا جائز قرار دیا گیا ہے۔

اس تعلق اور نزدیکی کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ عورت آخری حد تک مرد کے رازوں سے واقف ہوجاتی ہے۔ وہ مرد کی انتہائی چھپی ہوئی باتوں تک سے آگاہ ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت نازک صورت حال ہے۔ ہر آدمی کے بہت سے چھپے ہوئے راز ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ دوسرے لوگ ان سے مطّلع ہوں۔ مگر ہر آدمی مجبور ہے کہ اس کی بیوی اس کی تمام چھپی ہوئی باتوں سے مطّلع ہوجائے۔ کوئی مرد اپنے رازوں کو اپنی بیوی سے چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ ایسا کرنا نہ تو مفید ہے اور نہ عملی طور پر ممکن ہے۔

اس کا حل اسلامی شریعت میں یہ نکالا گیا ہے کہ عورت کو خصوصی طور پر پابند کیا گیا

ہے کہ وہ مرد کے رازوں کی حفاظت کرے۔ وہ کسی حال میں ان کو دوسروں کے اوپر نہ کھولے۔ اگر وہ مرد کے راز کو دوسروں کے اوپر کھولے گی تو اس کو ڈرنا چاہیے کہ خدا اس کے رازوں کو کھول دے۔ خدا اس کو آخرت میں بے نقاب کردے۔ اور کون ہے جو اس بے نقابی کا تحمل کرسکتا ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب دو آدمی ساتھ مل کر رہتے ہیں تو ان میں اختلاف اور شکایت کے واقعات بھی لازماً پیش آتے ہیں۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھا جائے تو اس ہدایت کا پورا مطلب یہ ہوگا کہ مرد سے شکایت ہو تب بھی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے رازوں کو کھولے، مرد سے اختلاف ہو تب بھی عورت کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ مرد کی چھپی ہوئی باتوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرے۔

عورت مرد کی رازدار ہے، مزید یہ کہ اسے اس رازداری کو آخر وقت تک نبھانا ہے، مرد سے شکایت کے واقعات پیش آنے کے بعد بھی اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ مرد کے راز کو کسی تیسرے شخص سے بیان کرنے لگے۔

گھر کا انتظام

قرآن میں عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (33:33)۔ یعنی، اور تم اپنے گھر میں قرار سے رہو۔ مفسرین نے اس کی تشریح الْزَمْنَ بُيُوتَكُنَّ یاأُمِرِ بِالْقَرَارِ فِي الْبُيُوتِ کے الفاظ سے کی ہے۔ یعنی اپنے گھروں میں ٹھہرو، اپنے گھروں کو اپنا دائرہ عمل بناؤ۔

موجودہ زمانہ میں عورت بیرونی نمائش کا ایک سامان بن کر رہ گئی ہے۔ اسلام کا نقشہ اس کے مقابلہ میں یہ ہے کہ عورت گھر کے اندر رہے اور داخلی ذمہ داریوں کو سنبھالے۔ گھر کا انتظام، افراد خاندان کی خانگی ضروریات، امور خانہ داری کا بندوبست، بچوں کی دیکھ بھال، یہ

سب عورت کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ سب وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ میں شامل ہے۔

گھر کو سنبھالنا، چھوٹے پیمانہ پر ایک ریاست کو سنبھالنا ہے۔ یہ اتنا ہی اہم اور معزز کام ہے جتنا ملکی ریاست کا کام ہوسکتا ہے۔ عورت کو چاہیے کہ وہ گھر کے معاملات کا انتظام ایک باعزت ذمہ داری کے طور پر کرے۔ گھر کو معیاری گھر بنانے میں وہ اپنی پوری صلاحیت وقف کردے۔ وہ گھر کے باغ کی مالی بن جائے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المَرْأَةُ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا رَاعِيَةٌ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5188؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1829)۔ یعنی، عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور وہ اس کی جواب دہ ہے۔

گھر گرہستی یا امور خانہ داری کی مہارت عورت کا سب سے بڑا زیور ہے، جو مسلم عورت اس زیور سے مزین ہو وہی کامل عورت ہے۔ جو عورت اس امتحان میں پوری اترے وہی اللہ کے یہاں عزت اور کامیابی کی مستحق قرار دی جائے گی۔ جو عورت دنیا میں ایک مکان کو آباد کرے وہی جنت کے زیادہ اعلیٰ مکان میں آبادکاری کے لیے منتخب کی جائے گی۔

بہترین عورت

ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ؟ قَالَ: الَّتِي تَسُرُّهُ إِذَا نَظَرَ إِلَيْهَا وَتُطِيعُهُ إِذَا أَمَرَ، وَلَا تُخَالِفُهُ فِيمَا يَكْرَهُ فِي نَفْسِهَا، وَلَا فِي مَالِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 9587)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ عورتوں میں سب سے بہتر عورت کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جو اپنے شوہر کو خوش کردے جب کہ وہ اسے دیکھے۔ اور وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے جب کہ وہ اس کو حکم دے۔ اور وہ اپنے نفس اور اس کے مال میں شوہر کے خلاف نہ کرے۔

اس حدیث میں نہایت عمدہ طور پر وہ حقوق بتا دیے گئے ہیں جو عورت کے اوپر مرد کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔

مرد باہر کی دنیا کی تلخیاں جھیل کر گھر کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اب بہترین بیوی وہ ہے جو مرد کی تلخیوں کو مسرت میں تبدیل کردے، وہ اپنے شوہر کے لیے سکون کا گوشہ بن جائے۔ اسی طرح مرد مختلف تقاضوں کے تحت اپنی بیوی کو ایک ہدایت دیتا ہے۔ اس کے پیچھے بہت سی داخلی اور خارجی مصلحتیں شامل رہتی ہیں۔ اب عورت کو چاہیے کہ وہ کامیاب رفیقۂ حیات کی طرح اس کی تعمیل میں لگ جائے، وہ گھر کے اندر کوئی مسئلہ کھڑا کیے بغیر مرد کے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچائے۔ اسی طرح عورت کا اپنا وجود اور گھر کا پورا اثاثہ عورت کے پاس گویا مرد کی امانت ہے۔ مرد اپنی بیرونی مصروفیات کی وجہ سے ان چیزوں کی رکھوالی نہیں کرسکتا۔ اب عورت کی وفا شعاری کا تقاضا ہے کہ ان امور میں وہ پوری طرح اپنے شوہر کی امین بن جائے۔ وہ اپنی ذات کو بھی صرف اپنے شوہر کے لیے محفوظ رکھے اور گھر کے تمام سازوسامان کو بھی۔ عورت مرد کے لیے ذریعۂ سکون ہے۔ اسی کے ساتھ وہ گھر کے اندر مرد کے نائب کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہترین عورت وہ ہے جو ان دونوں قسم کی ذمہ داریوں میں پوری اترے۔ یہی وہ عورت ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ: لَيْسَ مِنْ مَتَاعِ الدُّنْيَا شَيْءٌ أَفْضَلَ مِنَ الْمَرْأَةِ الصَّالِحَةِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1855)۔ یعنی، دنیا کے سرمایے میں کوئی چیز صالح بیوی سے زیادہ بہتر نہیں۔

ظاہر سے زیادہ باطن کو دیکھنا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ عورتوں کے ساتھ اچھے طریقہ سے رہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (4:19)۔

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے کہ کوئی مومن کسی مومنہ سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی ایک خصلت مرد کو پسند نہ آئے تو اس کی دوسری خصلت اس کی پسند کے مطابق ہوگی: لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، إِنْ سَخِطَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1469)۔

اس تعلیم کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ کسی ظاہری ناپسندیدگی کو دیکھ کر اس سے بیزار نہ ہو جاؤ۔ کیوں کہ خدا نے کسی کو ہر اعتبار سے ناقص نہیں بنایا۔ ہر عورت یا مرد کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ایک اعتبار سے اس کے اندر کمی ہے تو کسی اور اعتبار سے اس میں زیادتی بھی ضرور موجود ہوگی۔

ایک شخص نے شادی کی۔ اس کی بیوی آئی تو اس نے دیکھا کہ وہ نازک اندام نہیں ہے بلکہ مضبوط ہاتھ پاؤں والی ہے اور دیکھنے میں نیم مرد معلوم ہوتی ہے۔ وہ نازک اندام بیوی چاہتا تھا۔ اس لیے بھاری بھر کم قسم کی بیوی کو دیکھ کر اس سے بیزار رہنے لگا۔ مگر جلد ہی حالات بدلے۔ مرد کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے وہ زیادہ کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ اب بیوی نے طے کیا کہ وہ اپنے شوہر کا سہارا بنے گی۔ اس نے بھر پور محنت کر کے روزی کمانا شروع کیا وہ چونکہ طاقتور اور مضبوط ہاتھ پاؤں والی تھی، اپنے کام میں کامیاب رہی۔ اس کی وجہ سے گھر میں معقول پیسے آنے لگے۔ شوہر کا روزگار چھوٹنے کا کوئی اثر گھر کے مالیاتی نظام پر نہیں پڑا۔ اب شوہر کو معلوم ہوا کہ وہ بیوی جس کو اس نے اپنے لیے زحمت سمجھ لیا تھا، وہ اس کے لیے عظیم رحمت تھی۔ اس کی بیوی کے اندر اگرچہ نازک اندامی کی صفت نہ تھی۔ مگر اس کے اندر ایک اور نہایت قیمتی صفت تھی۔ یعنی شوہر کی معذوری کے وقت اس کا معاشی سہارا بننا۔

زندگی کی یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (24:32)۔ یعنی، تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو صالح ہوں ان کا نکاح کردو۔ اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کردے گا۔

یہی بات ایک حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے:

ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللَّهِ -عَزَّ وَجَلَّ- عَوْنُهُمْ: الْمُكَاتَبُ الَّذِي يُرِيدُ الأَدَاءَ، وَالنَّاكِحُ الَّذِي يُرِيدُ الْعَفَافَ، وَالْمُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 4995)۔ یعنی، تین شخص ہیں کہ ان کی مدد اللہ کے ذمہ ہے۔ وہ نکاح کرنے والا جو طالب عفت ہو اور وہ مکاتب جو مال ادا کرکے آزاد ہونا چاہتا ہو اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا۔

متوازن تعلیم

کسی معاملہ میں جب دو فریق ہوں تو سوچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی طرف دیکھیں۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دونوں دوسرے کی طرف دیکھیں۔ پہلے طریقہ میں آدمی کی نگاہ اپنی ذمہ داریوں پر ہوتی ہے اور دوسرے طریقہ میں آدمی کی نگاہ اپنے حقوق پر۔ پہلا طریقہ اصلاح کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا طریقہ فساد کی طرف۔

جب آدمی کی نظر اپنے حقوق پر ہو تو اس کی تمام تر توجہ معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف چلی جاتی ہے۔ وہ ہر چیز کا ذمہ دار فریق ثانی کو ٹھہرانے لگتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر ضد اور انتقام کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اپنے حصہ کا کام انجام نہیں دیتا۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ سب کچھ صرف فریق ثانی کرے، خود اسے کچھ نہ کرنا ہو۔

اس کے برعکس، جب آدمی کی نظر اپنی ذمہ داریوں پر ہو تو اس کی ساری توجہ خود اپنے

آپ پر لگ جاتی ہے۔ وہ اپنے حصہ کی کوتاہیوں کو تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اندر سنجیدگی اور خود احتسابی کی نفسیات جاگتی ہے۔ وہ اپنی طاقتوں کو تخریب کے بجائے تعمیر پر لگانے کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ اس کا یہ عمل دوسرے فریق کو بھی سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے حصہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرکے دوسرے فریق کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ بھی اپنے حصہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرے۔

یہی دوسرا طریقہ اسلام کا طریقہ ہے۔ اسلام اگر دیکھتا ہے کہ کسی معاملہ میں ایک فریق نسبتاً کمزور ہے تو اس کو صبر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اور دوسرا فریق اگر کسی وجہ سے طاقتور حیثیت کا مالک ہے تو اس کو وہ عدل اور انصاف کی تاکید کرتا ہے۔

شوہر اور بیوی کے تعلقات کے بارے میں اسلام کی جو ہدایات ہیں، وہ بعض پہلوؤں سے اسی اصول پر مبنی ہیں۔ صنفی بناوٹ کے اعتبار سے عورت کمزور فریق ہے اور مرد طاقتور فریق۔ اس لیے اسلام نے اپنی ہدایات میں دونوں کے اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے تاکہ دونوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی اور موافقت کی فضا پیدا ہو اور کسی رکاوٹ کے بغیر گھر کی تعمیر ممکن ہو سکے۔

عورتوں کے بارے میں اسلام یہ تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنے اندر انقیاد کا مزاج پیدا کریں۔ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت کرنے والی بنیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ (4:34)۔ یعنی، صالح عورتیں اپنے شوہروں کی فرماں بردار ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے اس آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: الْمُطِيعَاتُ لِأَزْوَاجِهِنَّ (اپنے شوہروں کی اطاعت کرنے والی عورتیں) تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 293۔

عورت کو اپنے شوہر کا اطاعت گزار بنانے کا مطلب دراصل اس کے اندر اس صالح مزاج کو پرورش کرنا ہے جس کے بعد وہ اپنے شوہر کی سچی رفیق بن سکے۔ جس کے نتیجہ میں

اس کے گھر کے اندر تعمیری فضا پیدا ہو، نہ کہ لڑائی جھگڑے کی فضا۔ اطاعت گزار بیوی اپنے شوہر کے دل کو جیت کر گھر کی مالک بن جاتی ہے۔ وہ گھر کے اندر سب سے اونچی جگہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس، غیر اطاعت گزار بیوی کے حصہ میں صرف یہ آتا ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر اپنے شوہر سے لڑتی رہے اور اس کا نتیجہ اس کو یہ ملے کہ اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تلخ ہو کر رہ جائے۔

دوسری طرف اسلام مرد کے اندر یہ مزاج بنانا چاہتا ہے کہ وہ کسی حال میں عدل سے نہ ہٹے۔ وہ گھر کے اندر اپنی قوّامیت کو استعمال کرتے ہوئے یہ نہ بھولے کہ موت کے بعد اس کا معاملہ سب سے بڑے قوّام اور سب سے بڑے حاکم کے سامنے پیش آنے والا ہے۔ وہاں اس آدمی کا معاملہ سخت ہوگا جو دنیا میں اپنے زیر دستوں کے ساتھ سختی کرے۔ اور وہاں اس کا معاملہ نرم ہوگا جو دنیا میں اپنے زیر دستوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے:

> عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3895؛ سنن الدارمی، حدیث نمبر 2282؛ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1977)۔ یعنی، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں۔

اس حدیث کے مطابق آدمی کا گھر اس کا مقام حکومت نہیں بلکہ اس کا مقام تربیت ہے۔ جو شخص گھر کے نظام میں بہتر ثابت ہو وہ پورے سماج اور پوری قوم کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص گھر کے نظام میں برا ثابت ہو وہ سماج اور قوم کے لیے بھی ایک برا انسان ہوگا۔ پہلا آدمی وسیع تر انسانیت کے لیے رحمت ہے اور دوسرا آدمی وسیع تر

انسانیت کے لیے عذاب۔

عورت اور مرد کے حقوق کا معاملہ، باعتبار حقیقت، کسی فقہی فہرست کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ حسنِ معاشرت کا معاملہ ہے۔ اس سلسلہ میں جو ”فہرست“ بتائی گئی ہے وہ اسی حسنِ معاشرت کے علامتی پہلو ہیں، نہ کہ بذات خود کوئی مکمل فہرست۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں کبھی کوئی مکمل فہرست نہیں بنائی جاسکتی۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ دونوں فریق فطری حقیقتوں کا اعتراف کریں۔ دونوں فریق حقوق سے زیادہ ذمہ داریوں پر نگاہ رکھیں۔ دونوں فریق اپنی ذات سے زیادہ مشترک مقصد (خاندانی نظام کی برقراری) کو اصل اہمیت کی چیز بنائیں اور اس مقصد کی خاطر ہر ذاتی قربانی کے لیے ہمیشہ تیار رہیں۔

اچھا گھر اچھا مزاج رکھنے والے لوگوں کے ذریعہ بنتا ہے۔ ایک اچھے خاندان کی تعمیر وہ مرد اور عورت کرتے ہیں جو اس سے پہلے خود اپنے شعور کی تعمیر کر چکے ہوں۔ شادی شدہ زندگی کی کامیابی کا راز ”فہرست احکام“ سے واقفیت سے زیادہ اس پر منحصر ہے کہ عورت اور مرد ”حقائق حیات“ سے واقف ہوں۔ جو لوگ زندگی کی حقیقتوں کو جانیں وہ کبھی ناکام نہیں ہوسکتے۔ اور جو لوگ زندگی کی حقیقتوں کو نہ جانیں، ان کے لیے اس دنیا میں کامیاب ہونا بھی مقدر نہیں۔

نکاح وطلاق

ایک مرد اور ایک عورت جب اپنے آپ کو نکاح کے رشتہ میں وابستہ کرتے ہیں تو ہمیشہ اسی جذبہ کے تحت وابستہ کرتے ہیں کہ دونوں ساری عمر ایک ساتھ رہیں گے اور ایک ساتھ زندگی گزاریں گے۔ اس کے بعد جب قدرت ان کے درمیان ایک بچہ پیدا کرتی ہے تو یہ گویا ایک قسم کی زنجیر ہوتی ہے جو اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ دونوں زیادہ گہرائی اور پائیداری کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) میں مغربی ملکوں کے اعداد وشمار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ بے اولاد جوڑوں میں طلاق کا رجحان اس سے زیادہ پایا گیا جتنا کہ ان جوڑوں میں جو صاحب اولاد ہیں:

"Childless couples tend to have a higher divorce rate than couples with children."

(*Encyclopedia Britannica*, 7/163-64).

ایک مغربی جج نے اپنے فیصلہ میں اس فطری حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ ہر چھوٹا بچہ جو ایک جوڑے کے یہاں پیدا ہو وہ ایک مزید ضمانت ہے کہ ان کی شادی کسی طلاق کی عدالت میں کبھی ختم نہ ہوگی:

Every little youngster born to a couple is an added assurance that their marriage will never be dissolved in a divorce court.

تاہم اس قسم کی تمام فطری اور نفسیاتی بندھنوں کے باوجود کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مرد یا عورت یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جانا چاہیے۔ قدیم زمانہ میں یہ صورت حال بہت کم پیش آتی تھی۔ مگر موجودہ زمانے میں، خاص

طور پر مغربی ملکوں میں، طلاقوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

طلاق زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ مگر طلاق کی کثرت بلاشبہ ایک نئی چیز ہے جو موجودہ زمانے میں مختلف اسباب کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک سبب عورتوں کے لیے روزگار کی آسانی بھی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ صنعتی دور نے عورتوں کے لیے یہ بات زیادہ آسان کردی کہ وہ اپنی معاش خود حاصل کرسکیں، خواہ وہ تنہا ہوں یا شادی شدہ ہوں یا مطلقہ ہوں یا بیوہ ہوں۔ اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپی کے ساتھ نوٹ کرنے کی ہے کہ 1930 کے بعد کے زمانہ میں پیدا ہونے والی عظیم کسا د بازاری نے امریکا میں طلاقوں کے اضافہ کی تعداد کو ایک عرصہ کے لیے روک دیا تھا:

> Industrialization has made it easier for women to support themselvewhether they are single, married, divorced, or widowed. In this connection, it is interesting to note that the Great Depression of the 1930s stopped the rise in the number of divorces in the United States for a time.
>
> (*Encyclopedia Britannica*, 7/163)

طلاق کا حکم

نکاح کا مسئلہ زندگی کا اصل مسئلہ ہے جب کہ طلاق کا مسئلہ صرف ایک استثناء ہے۔ تاہم چوں کہ ایسا استثناء بار بار پیش آتا ہے اس لیے الٰہی قانون اور وضعی قانون دونوں میں اس کی بابت احکام مقرر کیے گئے ہیں۔

الٰہی شریعت کی صحیح اور کامل نمائندگی اب صرف وہ ہے جو قرآن کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے۔ قرآن میں، اور اسی طرح اس کی مستند شرح کے طور پر سنت میں، طلاق کی بابت بہت سے احکام دیے گئے ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ — طلاق انتہائی ناگزیز حالات میں دی جائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کو أَبْغَضُ

الْمُبَاحَاتِ (سب سے زیادہ ناپسندیدہ حلال) کہا گیا ہے(سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 2178) ۔اور دوسری چیزیہ کہ جب طلاق کا معاملہ کیا جائے تو اس طرح کیا جائے کہ دونوں عزت اورشرافت کے ساتھ علاحدہ ہوجائیں ۔ ایسا نہ ہو کہ ایک یا دوسرے کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہوجائے اور وہ فریق ثانی کو بے عزت یا بے سہارا کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

قرآن میں طلاق کے حکم کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے:

وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (33:28) ۔یعنی، جب انھیں طلاق دے کر رخصت کرو تو بھلے طریقہ سے اورشریفانہ انداز سے رخصت کرو۔

طلاق کی دوصورتیں

عملی اعتبار سے طلاق کی دوصورتیں ہیں۔ ایک وقتی جذبے کے تحت طلاق، دوسری مستقل فیصلہ کے تحت طلاق۔ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے الگ ہے۔

خاندانی زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ تلخیاں اور ناخوش گواریاں پیش آتی ہیں۔ یہ تلخیاں اور ناخوش گواریاں اجتماعی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ان کو کسی حال میں بھی اجتماعی زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناخوش گواریاں جب سامنے آتی ہیں تو سمجھ دار آدمی صبراوراعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یا سخت الفاظ بول کر اپنے دل کے طوفان کے لیے نکاس (outlet) کا راستہ تلاش کرلیتا ہے۔ اس طرح خاندانی زندگی میں کوئی واقعی پیچیدگی پیدا ہونے نہیں پاتی۔

مگر نادان یا جھوٹے پندار میں مبتلا ہونے والے لوگ نہ صبر کر پاتے اور نہ سخت الفاظ بول کران کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ وہ اپنے غصہ کے مکمل اظہار یا فریق ثانی کو آخری سزا دینے کے لیے فوراً کہہ بیٹھتے ہیں— تم کو طلاق، طلاق، طلاق۔ اس قسم کی طلاق درحقیقت

غیظ وغضب کے اظہار کی انتہائی صورت ہے جو ان لوگوں کے اندر ظاہر ہوتی ہے جو اپنے جذبات کو تھامنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ مسٹر قریشی کا واقعہ جو اخبارات میں آیا تھا وہ اسی کی مثال ہے (دیکھیے، زیر نظر کتاب کا صفحہ 230)۔ اگر وہ وقتی نہ ہوتا تو مسٹر قریشی نادرہ بیگم کو دوبارہ اپنی زوجیت میں لینے کا ارادہ ظاہر نہ کرتے۔ (ٹائمس آف انڈیا، یکم مئی 1986)

اسلام کا مقرر کردہ طریقِ طلاق اس برائی کو روکنے کی انتہائی کامیاب فطری تدبیر ہے۔ اسلام کا یہ طریقہ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (2:229)۔ یعنی، طلاق دوبار ہے۔ پھر یا تو معروف کے مطابق عورت کو روک لینا ہے یا اچھے طریقے سے اس کو رخصت کر دینا ہے۔

أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَرَأَيتَ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالَى: الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ، فأين الثالثة؟ قال: فَإِمْساكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسانٍ، هِيَ الثَّالِثَةُ (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر 19216)۔ یعنی، ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اللہ نے طلاق کی آیت میں دوبار کا ذکر کیا ہے۔ پھر تیسری بار کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ معروف کے ساتھ روک لینا یا احسان کے ساتھ رخصت کرنا یہی تیسرا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی شخص کے دل میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا خیال آئے تو اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ ایک ہی بار آخری طلاق دے کر اسے رخصت کر دے۔ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ طلاق دینے کے عمل کو تین مہینے کی مدت میں مکمل

کرے۔ طلاق دینے والے کو چاہیے کہ وہ الگ الگ دوطہر (پاکی) میں دومرتبہ طلاق دے۔ اور پھر تیسری طُہر میں یا تو رجوع کرے۔ اور اگر وہ رجوع کرنا نہیں چاہتا تو تیسری بار طلاق دے کر اسے رخصت کر دے۔

اگر آدمی کے دل میں طلاق دینے کا خیال اس وقت آیا ہو جب کہ عورت حیض کے ایام سے گزر رہی ہو تو اس وقت طلاق دینا درست نہیں۔ مرد کو انتظار کرنا چاہیے کہ عورت حیض سے فارغ ہو کر معتدل حالت میں آجائے جس کو پاکی کا دور یا طہر کہا جاتا ہے۔ اس وقت آدمی اپنی عورت سے کہے کہ میں تم کو ایک طلاق دیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی عورت اس کے گھر میں رہے گی اور مرد دوسرے طُہر کا انتظار کرے گا۔ اگلے مہینہ جب دوسرے طُہر کا زمانہ آئے تو اس وقت مرد کہے کہ میں تم کو دوسری بار طلاق دیتا ہوں۔ اب پھر مرد اگلے مہینہ کے زمانہ طُہر کا انتظار کرے۔ تیسرے مہینہ میں جب طُہر کا زمانہ آجائے اس وقت مرد یا تو اپنے سابقہ طلاق کو واپس لے اور عورت کو دوبارہ اپنی بیوی بنا لے یا تیسری بار طلاق دے کر اسے عزت کے ساتھ رخصت کر دے۔

طلاق بذات خود اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض حلال طلاق ہے: أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 2178)۔ اس کے بعد اگر آدمی ایسا کرے کہ وہ ایک ہی وقت میں تین طلاق دیدے تو یہ حد درجہ سرکشی کی بات ہے۔ شریعت میں اس کو بے حد برا قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عمر کے بارے میں مروی ہے کہ جب ان کے پاس ایسا شخص لایا جاتا جس نے اپنی عورت کو بیک وقت تین طلاق دی ہو تو وہ اس کی پیٹھ پر کوڑا مارتے تھے:

وَكَانَ عُمَرُ إِذَا أُتِيَ بِرَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا أَوْجَعَ ظَهْرَهُ۔ (سنن سعید بن منصور، جلد 1، صفحہ 302)

جو شخص نکاح وطلاق کے معاملہ میں اسلام کے اصول پر چلنا چاہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ مذکورہ اصول کی پابندی کرے۔

تین طُہر میں طلاق دینے کا یہ طریقہ حد درجہ فطری اور مناسب ہے۔ اس طریقہ میں وہ تمام طلاق اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں جو وقتی جذبہ کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔ غصہ اور جوش میں اگر آدمی کے اندر طلاق کا ارادہ پیدا ہو گیا ہو تو وہ ایک مہینہ یا دو مہینہ میں اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ ذہن میں اعتدال آتے ہی آدمی اپنے پچھلے جذبہ پر پچھتائے گا۔ اور اس سے رجوع کر کے اپنی بیوی سے دوبارہ تعلقات درست کر لے گا۔

البتہ اگر طلاق کا سبب بہت زیادہ بنیادی ہو اور آدمی نے سوچ سمجھ کر علاحدگی کا فیصلہ کیا ہو تو وہ دو مہینہ گزرنے کے بعد بھی اپنے فیصلہ پر باقی رہے گا۔ اس کے بعد جب تیسرے مہینہ وہ آخری بار جدائی کا اعلان کرے گا تو وہ حقیقی جدائی ہوگی۔ وہ مصنوعی جدائی نہ ہوگی جس پر آدمی ساری عمر افسوس کرتا رہے۔

ایک واقعہ

دہلی کے ایک مسلمان وکیل نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا۔ ان کے یہاں ایک مسلمان آئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں، آپ طلاق نامہ کا مضمون بنا دیجئے۔ مذکورہ مسلمان اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاق دینا چاہتے تھے۔

وکیل صاحب اسلام کے قانون کو جانتے تھے۔ انھوں نے مذکورہ مسلمان سے کہا کہ ایک وقت میں تین طلاق دینا اسلام میں سخت برا ہے۔ آپ کو اگر طلاق دینا ہے تو اسلام کے مقررہ طریقہ کے مطابق تین طُہر میں اس کی تکمیل کیجیے۔ وہ راضی ہو گئے۔ واپس جا کر انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تم کو ایک طلاق دیتا ہوں۔ مگر جب اگلا مہینہ آیا تو ان کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ انھوں نے اپنے سابقہ فیصلہ سے رجوع کر لیا اور اپنی

بیوی سے دوبارہ تعلقات قائم کر لیے۔ وہ وکیل صاحب سے دوبارہ ملے اور کہا کہ آپ نے میرے ساتھ بہت احسان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر میں نے جوش کی حالت میں اپنی بیوی کو اسی وقت آخری طلاق دے دیا ہوتا تو میرا گھر برباد ہو جاتا۔

متاع کا مطلب

طلاق کے احکام میں سے ایک حکم وہ ہے جس کے لیے قرآن میں ''متاع'' کا لفظ آیا ہے۔ اس سلسلہ میں سورہ البقرہ کی دو آیتیں حسب ذیل ہیں:

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (2:236)۔ یعنی، تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اس وقت طلاق دو کہ ان کو تم نے ہاتھ نہ لگایا ہو اور ان کے لیے کچھ مہر مقرر نہ کیا ہو۔ اور ان کو کچھ دو، وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق ہے، دستور کے مطابق۔ لازم ہے نیکی کرنے والوں پر۔

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (2:241)۔ یعنی، اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو فائدہ دینا ہے دستور کے موافق۔ لازم ہے پرہیز گاروں کے لیے۔

فقہی تفصیلات سے قطعِ نظر، پہلی آیت (2:236) کا سادہ مطلب یہ ہے کہ نکاح کے وقت اگر مہر نہیں ٹھہرایا گیا تھا اور نہ مرد نے عورت کو ہاتھ لگایا تھا، اور اس سے پہلے مرد نے طلاق دے دیا تو مرد پر لازم ہے کہ عورت کو رخصت کرتے ہوئے اسے کچھ دے۔ یہ دینا اپنی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ ایسی صورت میں مہر دینا لازم نہیں۔

دوسری آیت (2:241) میں یہی حکم عمومی انداز میں طلاق کے تمام واقعات کے

لیے ہے۔ جب بھی کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے تو آخری علیحدگی کے وقت اس کو چاہیے کہ حسنِ جدائی کی علامت کے طور پر عورت کو کچھ دے۔ مثلا کپڑا یا اور کوئی چیز۔ بعض فقہاء کے نزدیک پہلی صورت میں "متاع" دینا ضروری ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں متاع دینا صرف مستحب ہے۔

مزاجِ شریعت

اس آیت کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان ضمنی اختلافات ہیں۔ تاہم یہ بات تمام فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے کہ اس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد وقتی طور پر سابق بیوی سے کیا سلوک کیا جائے۔ اس مسئلے سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ طلاق اور علاحدگی کی تکمیل کے باوجود مطلقہ عورت کو مرد کی طرف سے مستقل گزارہ (Maintenance) دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسرا تصور تمام تر جدید تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہ تصور کبھی بھی الٰہی شریعت میں نہیں پایا گیا ہے۔ نہ اسلام میں اور نہ اسلام سے پہلے کی آسمانی شریعتوں میں۔ مسلم فقہاء کے درمیان آیت کے عملی انطباق کے سلسلے میں بہت کچھ جزئی اختلافات ہیں۔ مگر فقہاء میں سے کسی کی بھی یہ رائے نہیں ہے کہ اس آیت کے تحت مرد کے اوپر لازم ہے کہ وہ باقاعدہ طلاق واقع ہونے کے بعد بھی مستقل طور پر اپنی سابقہ بیوی کو گزارہ دیتا رہے۔ ایک شخص بطور خود اس قسم کا خیال ظاہر کر سکتا ہے۔ مگر قرآن یا حدیث کے اندر اس کے حق میں کوئی دلیل یا ماخذ موجود نہیں۔ اور نہ اسلامی فقہاء میں سے کسی بھی فقیہ کی یہ رائے ہے۔

اسلامی فقہ میں اسی لیے اس مُتعہ کو مُتعہ طلاق کہتے ہیں، نہ کہ مُتعہ حیات، یعنی وہ مُتعہ (کچھ مال) جو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت عورت کو دیا جائے۔

قرآن ہر مسئلہ کو فطری انداز میں حل کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات سراسر قرآنی

روح کے خلاف ہے کہ جس مرد سے نباہ نہ ہونے کی بنا پر عورت کی جدائی ہوئی ہے اسی مرد سے اس عورت کا نفقہ دلوایا جائے۔ یہ چیز سماج میں منفی ذہنیت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ چنانچہ قرآن میں نکاح وطلاق کے احکام کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے:

وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا (4:130)۔ یعنی اور اگر دونوں جدا ہوجائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کردے گا اور اللہ وسعت والا حکمت والا ہے۔

اللہ کی وسعت سے مراد وہ وسیع فطری نظام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے بندوں کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔ عورت کو جب طلاق ہوجائے تو اس کے تمام خونی رشتوں میں فطری طور پر اس سے ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ کسی دباؤ کے بغیر اس کی مدد اور سرپرستی کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ خود عورت کے اندر نئی قوت ارادی ابھرتی ہے اور وہ اپنے مسئلہ کے حل کے لیے اکثر ایسے کام کر ڈالتی ہے جو اس نے اس سے پہلے سوچا بھی نہیں تھا۔ سابقہ تجربات اس کو زیادہ سمجھ دار اور محتاط بنا دیتے ہیں اور اس طرح وہ اس قابل ہوجاتی ہے کہ اگر وہ دوبارہ کسی سے رشتہ نکاح میں منسلک ہو تو زیادہ کامیابی کے ساتھ رشتہ کو نباہ سکے۔ وغیرہ۔

طلاق کے بعد

اس سلسلہ میں دوسرا سوال یہ ہے کہ طلاق کے بعد ایک عورت کے لیے اپنے ضروری اخراجات پورا کرنے کی صورت کیا ہے۔ اس کا ایک جواب اسلام کا قانونِ وراثت ہے۔ اسلام نے خاندانی جائیداد میں عورتوں کا جو حصہ مقرر کیا ہے اگر اس پر باقاعدہ عمل درآمد ہو تو عورت کے لیے بے سہارا ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ خاندانی جائداد میں عورت کا مستقل حصہ مقرر کرنا ایک اعتبار سے اسی لیے ہے کہ عورت ہنگامی حالات میں اپنی کفالت آپ کر سکے۔

تاہم اسلام نے عورت کے معاشی مسئلہ کو تمام تر وراثت پر منحصر نہیں رکھا۔ کیوں کہ وراثت کا معاملہ ہمیشہ یقینی نہیں ہوتا۔ اس کا مزید انتظام اسلام کے قانون نفقات سے ہے۔ آدمی کو اس کا جواب اسلام کے قانونِ نفقات میں تلاش کرنا چاہیے، نہ کہ اسلام کے قانون طلاق میں۔ یہاں ہم مختصراً چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

1۔ مطلقہ عورت اگر بے اولاد ہے یا اولاد کمانے کے قابل نہیں ہے تو اسلامی شریعت کے مطابق اس کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے والد پر ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہی صورت دوبارہ لوٹ آئے گی جو شادی سے پہلے تھی۔ شادی سے پہلے باپ اپنی لڑکی کا کفیل تھا۔ طلاق کے بعد دوبارہ وہ اپنی لڑکی کا کفیل ہوجائے گا:

فَالْإِنَاثُ عَلَيْهِ نَفَقَتُهُنَّ إِلَى أَنْ يَتَزَوَّجْنَ إِذَا لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ مَالٌ، وَلَيْسَ لَهُ أَنْ يُؤَاجِرَهُنَّ فِي عَمَلٍ وَلَا خِدْمَةٍ وَإِنْ كَانَ لَهُنَّ قُدْرَةٌ، وَإِذَا طَلُقَتْ وَانْقَضَتْ عِدَّتُهَا عَادَتْ نَفَقَتُهَا عَلَى الْأَبِ۔ (فتح القدیر للکمال ابن الہمام جلد 4، صفحہ 410)۔ یعنی، باپ پر اس کی لڑکیوں کا نفقہ اس وقت تک ہے جب تک وہ شادی نہ کریں جب کہ لڑکیوں کے پاس مال نہ ہو۔ اور باپ کو حق نہیں کہ وہ انھیں کسی عمل یا خدمت پر لگائے، اگرچہ ان کے اندر اس کی قدرت کیوں نہ ہو۔ اور جب لڑکی کو طلاق ہوجائے اور اس کی عدت پوری ہوجائے تو اس کا نفقہ دوبارہ باپ پر لوٹ آئے گا۔

2۔ مطلقہ عورت اگر ماں ہے۔ یعنی وہ ایسی اولاد رکھتی ہے جو صاحب معاش ہے تو ایسی صورت میں اس کے اخراجات کی پوری ذمہ داری اس کی اولاد پر ہوگی:

أَنَّ جَمِيعَ مَا وَجَبَ لِلْمَرْأَةِ وَجَبَ لِلْأَبِ وَالْأُمِّ عَلَى الْوَلَدِ مِنْ طَعَامٍ وَشَرَابٍ وَكُسْوَةٍ وَسُكْنَى حَتَّى الْخَادِمِ (الدر المختار و حاشیۃ ابن عابدین "رد المختار"، جلد

3، صفحہ 622)۔ یعنی، وہ سب جو بیوی کے لیے واجب ہے وہ سب باپ اور ماں کے لیے لڑکے پر واجب ہوگا، یعنی کھانا، پینا، کپڑا، مکان، یہاں تک کہ خادم بھی۔

3۔ اگر مطلقہ عورت کا باپ نہ ہو یا اس کی اولاد اس کی کفالت کرنے کے قابل نہ ہو تو دوسرے قریبی اور محرم اعزّہ اس کی معاشی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ مثلاً چچا، بھائی، وغیرہ۔ اگر یہ تیسری صورت بھی موجود نہ ہو تو اسلامی شریعت کی رو سے ریاست کا بیت المال اس کے اخراجات کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ مطلقہ عورت کو قانونی طور پر یہ حق ہوگا کہ وہ ریاست سے اس کو وصول کرے۔

شریعت کے اسی اہتمام وانتظام کی وجہ سے اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ آج ایسا ہے کہ مسلمان عورتیں طلاق پا کر بے سہارا پڑی ہوئی ہوں اور کوئی ان کی کفالت اور سر پرستی کرنے والا موجود نہ ہو۔

تہذیب جدید کا مسئلہ

موجودہ زمانے میں مغربی تہذیب نے بہت سے مسئلے پیدا کیے ہیں۔ یہ مسئلے حقیقی سے زیادہ مصنوعی ہیں۔ مغربی تہذیب نے بہت سے معاملات میں غیر فطری انداز اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں غیر فطری مسائل پیدا ہوئے۔ اس کے بعد مزید غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے غیر فطری طور پر ان کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح مسائل میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انھیں میں سے ایک طلاق کا مسئلہ بھی ہے۔ مغرب میں آزادیِ نسواں کے نام پر جو تحریک شروع ہوئی وہ اپنے ابتدائی جذبہ کے اعتبار سے بالکل غلط نہ تھی۔ مگر اس کے علم بردار اس کی حد کو نہ جانتے تھے۔ چنانچہ آزاد سماج بنانے کی کوشش بالآخر اباحیت پسند سماج (permissive society) تک جا پہنچی۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان لامحدود اختلاط شروع ہو گیا۔ اس نے نکاح کے بندھن کو کمزور کر دیا۔ مرد اور عورت میاں اور بیوی

نہ رہے بلکہ حدیث کے الفاظ میں ذوّاقین اور ذوّاقات بن گئے(المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 7848)۔اس کومزید تقویت صنعتی دور کی اس آسانی سے حاصل ہوئی کہ عورت فوراً ہی اپنے لیے آزاد معاش حاصل کرسکتی تھی۔ جدید صنعتی معاشرہ میں ایک عورت جتنی آسانی سے اپنے لیے ذریعہ معاش حاصل کرلیتی ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی عورت کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کی وجہ سے مرد کی قوّامیت متاثر ہوئی اور عورتیں مرد کے زیر اثر رہنے پر راضی نہ ہوسکیں اور معاشرتی زندگی میں وہ مسائل پیدا ہوئے جنھوں نے طلاقوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھادی۔

طلاق کو روکنے کے لیے مغربی حکماء نے یہ تدبیر کی کہ مرد پر یہ قانونی پابندی لگادی کہ طلاق کے بعد بھی اس پر لازم ہوگا کہ وہ عورت کو گزارہ دیتا رہے۔ یہ گزارہ مغربی معیار کے مطابق مقرر ہوا۔ چنانچہ اکثر حالات میں طلاق کے معنی مرد کے لیے یہ ہوگئے کہ وہ اپنے سرمایہ کا بڑا حصہ اپنی مطلقہ بیوی کو دیدے اور مزید زندگی بھر کما کما کر اس کا حصہ اسے ادا کرتا رہے۔

اس غیر فطری صورت حال کی ایک مثال لارڈ برٹرینڈ رسل ہے۔

برٹرینڈ رسل (1970-1872) ایک نہایت ذہین اور تعلیم یافتہ انگریز تھا۔ اس کو ایک ایسی عورت درکار تھی جو اس کی ذہنی سطح کے مطابق اس کی رفیق حیات بن سکے۔ اس نے شادی کی مگر تجربہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اس کی پسند کے مطابق نہیں ہے۔ ناموافقت ظاہر ہونے کے بعد اس نے فوراً اس سے علاحدگی اختیار نہیں کی۔ سخت ذہنی اذیت کے باوجود اس کے بعد وہ تقریباً دس سال تک اس کے ساتھ نباہ کرتا رہا۔ آخر کار اس نے اس کو طلاق دے کر دوسری شادی کی۔ دوسری عورت سے بھی نباہ نہ ہوسکا اور پھر اس کو چھوڑ کر برٹرینڈ رسل کو تیسری شادی کرنی پڑی۔

یہ طلاق برٹرینڈ رسل کو بہت مہنگا پڑا۔ طلاق کے بعد اس کو ازروئے قانون اپنی

بیویوں کو جو رقم ادا کرنی پڑی اس نے برٹرینڈ رسل کی معاشیات کو برباد کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:

The financial burden was heavy and rather disturbing: I had given £ 10,000 of my Nobel Prize cheque for a little more than £ 11,000 to my third wife, and I was now paying alimony to her and to my second wife as well as paying for the education of my younger son Added to this. there were heavy expenses in connection with my elder son's illness: and the income taxes which for many years he had neglected to pay now fell to me to pay.

(Bertrand Russell, *Autobiography*, 1978, pp. 563-64)

"مالیاتی بوجھ میرے اوپر بہت بھاری اور پریشان کن تھا۔ مجھ کو اپنے نوبیل انعام کے گیارہ ہزار پاؤنڈ میں سے دس ہزار پاؤنڈ اپنی تیسری بیوی کو دے دینا پڑا۔ اور اب میں اس کو اور اپنی دوسری بیوی کو نان نفقہ کی رقم بھی ادا کر رہا تھا۔ اور اسی کے ساتھ اپنے چھوٹے بچے کی تعلیم کی ادائیگی بھی میرے ذمہ تھی۔ مزید اضافہ یہ کہ میرے بڑے لڑکے کی بیماری کے سلسلہ میں بھی بھاری اخراجات تھے۔ اور اس لڑکے کئی سال کا انکم ٹیکس جو وہ ادا نہیں کر سکا تھا وہ بھی مجھ کو ہی ادا کرنا پڑا۔"

مغرب کا یہ قانون بظاہر عائلی زندگی میں اصلاح کے لیے بنایا گیا تھا۔ مگر وہ مغربی ممالک کے لیے الٹا پڑا۔ برٹرینڈ رسل کے مذکورہ تجربہ جیسے تجربات بے شمار لوگوں کو پیش آئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں انھیں اس کی بہت بڑی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ لوگوں کو نکاح کا طریقہ بے حد مہنگا معلوم ہوا۔ حتیٰ کہ ان کے اندر نکاح کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت اور مرد نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہنے لگے۔ چنانچہ آج مغرب کی نئی نسل میں تقریباً 50 فی صد وہ لوگ ہیں جو غیر منکوحہ بیویوں کے

ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ جدید مغربی عورت کے بارے میں ایک رپورٹ کا خلاصہ اخبارات میں حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے:

فرانس میں ایسے مردوں اور عورتوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جو نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ فرانس میں 12 ملین شادی شدہ جوڑے ہیں اور ایک ملین سے زیادہ غیر شادی شدہ جوڑے۔ 1972 سے روایتی نکاح کی تعداد میں بہت کمی واقع ہوئی ہے۔ امریکا کے بارے میں اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ امریکی عورتوں میں نکاح کی شرح تیزی سے کم ہو رہی ہے کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ نکاح کی تعداد میں کمی کی وجہ یہ ہے کہ امریکی عورتیں شادی اور روزگار میں ٹکراؤ محسوس کرتی ہیں۔ شادی شدہ زندگی کے ساتھ کام کرنا انھیں مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے بہت سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے میاں بیوی کی طرح ایک ساتھ رہنا شروع کر دیا ہے بغیر اس کے کہ انھوں نے باقاعدہ نکاح کیا ہو۔

عملی شادی، ایک مرد اور ایک عورت کا ایک ساتھ رہنا بغیر اس کے کہ انھوں نے نکاح کیا ہو، نہ صرف یہ کہ ہیم برگ میں تیزی سے بڑھ رہا ہے بلکہ وہ ایک خاص جرمن انداز بنتا جا رہا ہے۔ اب یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے کہ غیر شادی شدہ جوڑوں کے درمیان قانون دانوں کے ذریعہ زیادہ مفصل قسم کے معاہدے کیے جائیں۔ پچھلے دس برسوں میں ایسے غیر شادی شدہ جوڑوں کی تعداد چار گنا بڑھ گئی ہے جو ایک ساتھ (میاں بیوی کی طرح) رہتے ہیں۔ یہ بات ایک حالیہ جائزہ میں بتائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے دس برس کے دوران 18 سال اور 25 سال کے درمیان عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں میں دس گنا حد تک عملی شادیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس طرح اب مغربی جرمنی میں ان جوڑوں کی تعداد بڑھ کر ایک ملین تک پہنچ جاتی ہے جو ہر صبح کو ایک ساتھ اٹھتے ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے اپنے آپ کو نکاح کے بندھن میں نہیں باندھا۔

Togetherness Without Marriage

De Facto marriage—a man and a woman living together without being legally married—is not only on the increase in Hamburg. but has taken a special German twist with a trend to engage lawyers for elaborate contracts between the non-spouses.

In the last ten years, the number of unmarried couples living together has quadrupled according to a poll by Emnid, a market research agency. Among people in the 18-25 age bracket, there are actually ten times as many defacto marriages as ten years ago that adds up to one million West German couples who wake up every morning with one another, but have never tied the knot. (UNI-DPA)

(*The Times of India*, New Delhi, November 17, 1985)

Sociologists in France are puzzled why more and more men and women there prefer living together without marriage as "cohabiting couples" rather than as married couples. Though unmarried couples have no legal existence in France and there is insecurity over issues like custody and inheritance, the practice has caught on in a big way. Official statistics published in Le Monde reveal that against 12 million married couples in France, there are now over a million "cohabiting couples". Since 1972, the number of traditional marriages has been declining and hit its all time low in 1985. "What is happening to the institution of marriage?" ask sociologists.

Curiously, the cohabiting couples enjoy greater tax

benefits than married couples. The tax deduction and allowance doubles up because of separate assessments and municipalities certify that a couple is cohabiting giving it the same welfare and public transport benefits as married couples. Sociologists including Pierrealain Audirac attribute the trend to four major causes.

Spread of contraceptives has made marriage unnecessary until a couple wants children; there is a reluctance to make long-tenn commitments; working women enjoy greater independence and can stay unmarried or get divorced more easily and pervasive unemployment as changed attitudes. According to the United States' National Centre For Health Statistics. the marriage rate for American women is at an all time low. Its lates survey reveals that for the first time since 1940, the marriage rate for single women in the 15-44 age group has dropped below the magic figure of 100 per 1,000. This has naturally reflected in the number of marriages. While in 1982, over 2.5 million marriage were performed, a year later this number came down to 2.445, 604.

Some sociologists have suggested that for good or bad, American women, especially those belonging to the middle and upper middle class, see a conflict between marriage and their pursuit of a career. Indeed, despite the resurgence of traditionalism, women are forgoing the marriage option because of an increasing acceptance of men and women living together without tying the matrimonial knot. Furthermore, there is even less disapproval of unmarried women having children.

(*The Times of India*, New Delhi, May 17, 1986)

ہندستان کا تجربہ

طلاق کو مشکل بنانے کا دوسرا تجربہ وہ ہے جو ہندستان میں پیش آیا۔ ہندوستان کے قدیم مصلحین نے بظاہر عورت کے تحفظ کے لیے مذہبی طور پر طلاق کو ممنوع قرار دے دیا۔ مزید یہ کہ عورت کے اندر طلاق کا رجحان روکنے کے لیے انھوں نے یہ کیا کہ طلاق کے بعد عورت کے لیے نکاح ثانی کا راستہ تمام تر بند کر دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو قوانین بنائے اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بار جب شادی ہو جائے تو اس کے بعد نہ مرد اسے طلاق دے سکتا ہے اور نہ عورت کے لیے ممکن ہے کہ وہ پہلے شوہر سے جدائی کے بعد دوسرا نکاح کر سکے۔

مگر یہ اصلاح غیر فطری تھی چنانچہ ہندو سماج کو اس کی بہت مہنگی قیمت دینی پڑی۔ عورت اور مرد اگر نکاح کے بعد ایک دوسرے کو مطمئن نہ کر سکے تو ان کی ساری زندگی بدترین تلخی میں گزرتی تھی۔ کیوں کہ نہ مرد کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور نہ عورت کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے پہلے شوہر سے جدا ہو کر اپنا دوسرا نکاح کر سکے۔ اس کے لیے صرف یہ ممکن تھا کہ ساری عمر ایک غیر مطلوب مرد کے ساتھ پُر اذیت زندگی گزارتی رہے اور اگر اس کا شوہر درمیان میں مر جائے تو اپنے آپ کو جلا کر ستی ہو جائے۔

موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ نے نئی شکل اختیار کی ہے۔ قانونی طور پر اگرچہ علاحدگی یا نکاح ثانی کو جائز کر دیا گیا ہے مگر ہندو سماج عملاً آج بھی انھیں روایات پر چل رہا ہے جو ہزاروں برس سے اس کے درمیان بنی ہیں۔ چنانچہ ہندو عورتوں کے بارے میں کثرت سے اطلاعات مل رہی ہیں کہ وہ شوہروں سے ناموافقت کی بنا پر خودکشی کر لیتی ہیں۔ اس کا سبب مذکورہ بالا مسئلہ ہے۔ یہ عورتیں جانتی ہیں کہ اولاً تو شوہروں سے علاحدگی مشکل ہے اور اگر کسی طرح علاحدگی ہو جائے تو دوسرا نکاح اس سے بھی زیادہ مشکل۔

جہیز کے بارے میں

شادی میں جہیز دینے کی رسم ہندستانی مسلمانوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ رسم ہندستان اور پاکستان کے سوا دوسرے مسلم ملکوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں میں یہ رسم یقینی طور پر ہندؤوں سے آئی ہے۔ ہندو لوگ، اپنے قدیم قانون کے مطابق، بیٹی کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے تھے، اس کی تلافی کے لیے ان کے یہاں یہ رواج پڑ گیا کہ شادی کے موقع پر لڑکی کو زیادہ سے زیادہ دیا جائے۔ چنانچہ وہ جہیز کے نام پر بیٹی کو اپنی دولت کا ایک حصہ دینے کی کوشش کرنے لگے۔

اسی ہندو طریقہ کی تقلید ہندستان کے مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ اسلام میں اگرچہ لڑکی کو وراثت میں باقاعدہ حصہ دار بنایا گیا ہے۔ مگر مسلمانوں نے عملی طور پر لڑکیوں کو اس شرعی حق سے محروم کر رکھا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے انھوں نے اس ہندو طریقہ کو اختیار کرلیا ہے کہ شادی کے موقع پر لڑکی کو کافی سامان دے کر اسے خوش کر دیا جائے۔ جہیز حقیقتاً اسلام کے قانون وراثت سے فرار کی تلافی ہے جس کو پڑوسی قوم سے لے کر اختیار کرلیا گیا ہے۔

کچھ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ جہیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح حضرت علی سے کیا تو ان کو اپنے پاس سے جہیز بھی عطا کیا۔ اس قسم کی بات دراصل غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیا اس کو کسی طرح بھی 'جہیز' نہیں کہا جاسکتا۔ اور اگر اس کو جہیز کہا جائے تو ساری دنیا میں غالباً کوئی ایک مسلمان بھی نہیں جو اپنی لڑکی کو یہ پیغمبرانہ جہیز دینے کے لیے تیار ہو۔

فاطمہ کا جہیز

وہ "جہیز" کیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاجزادی حضرت فاطمہ کو دیا۔ اس کی تفصیل روایات میں آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معروف معنوں میں کوئی جہیز نہ تھا بلکہ انتہائی معمولی قسم کا چند ضروری سامان تھا۔ یہاں ہم اس سلسلہ کی چند روایات نقل کرتے ہیں:

عَنْ عَلِيٍّ، قَالَ: جَهَّزَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ فِي خَمِيلٍ، وَقِرْبَةٍ، وَوِسَادَةِ أَدَمٍ حَشْوُهَا لِيفُ الْإِذْخِرِ (مسند احمد، حدیث نمبر 643)۔ یعنی، حضرت علی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو جہیز میں ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک چمڑے کا تکیہ دیا جس میں اذخر گھاس کا بھراؤ تھا۔

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: لَمَّا جَهَّزَ رَسُولُ اللَّهِ صلى اللَّهُ عليه وسلم فَاطِمَةَ إِلَى عَلِيٍّ بَعَثَ مَعَهَا بِخَمِيلٍ قَالَ عَطَاءٌ: مَا الْخَمِيلُ؟ قَالَ: قَطِيفَةٌ وَوِسَادَةٌ مِنْ أُدُمٍ حَشْوُهَا لِيفٌ، أَوْ إِذْخِرٌ وَقِرْبَةٌ كَانَا يَفْتَرِشَانِ الْخَمِيلَ وَيَلْتَحِفَانِ بِنِصْفِهِ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 1446)۔ یعنی، حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کے نکاح کے بعد ان کو حضرت علی کے یہاں بھیجا تو ان کے ساتھ ایک خُمیل تھا۔ عطا راوی نے پوچھا کہ خمیل کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ نے کہا کہ چادر۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چمڑے کا ایک تکیہ دیا جس کا بھراؤ کھجور کی چھال یا اذخر تھا اور ایک مشکیزہ۔ وہ دونوں اس چادر کا آدھا حصہ بچھاتے اور آدھا اوڑھ لیتے۔

عَنْ أَسْمَاءَ ابْنَةَ عُمَيْسٍ قَالَتْ: لَمَّا أُهْدِيَتْ فَاطِمَةُ إِلَى عَلِيٍّ لَمْ نَجِدْ فِي بَيْتِهِ إِلَّا رَمْلًا مَبْسُوطًا، وَوِسَادَةً حَشْوُهَا لِيفٌ، وَجَرَّةً وَكُوزًا (مصنف عبد الرزاق، حدیث نمبر 9781)۔ یعنی، حضرت اسماء بنت عُمیس کہتی ہیں کہ فاطمہ جب رخصت کرکے علی کے یہاں بھیجی گئیں تو ہم نے ان کے گھر میں اس کے سوا کچھ نہ پایا کہ وہاں ریت بچھی ہوتی تھی۔ اور ایک تکیہ تھا جس کا بھراؤ کھجور کی چھال تھا۔ اور ایک گھڑا تھا اور ایک پانی پینے کا پیالہ۔

چند ضروری سامان

واضح ہو کہ اوپر کی حدیث میں جَہّز کا لفظ آج کل کا معروف جہیز دینے کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ تجہیز کے معنی عربی زبان میں سادہ طور پر سامان تیار کرنے کے ہیں جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ (12:70)۔ یعنی، جب انھوں نے ان کا سامان سفر درست کیا۔ مذکورہ حدیث میں جَهَّزَ کا لفظ اسی سادہ مفہوم میں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت فاطمہ کے نکاح کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رخصت کیا تو چند ضروری چیزوں کا انتظام کرکے ان کے ساتھ کر دیا۔ یہ ضروری چیزیں وہی تھیں جن کا ذکر اوپر کی روایات میں موجود ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ شادی کے وقت لڑکی کو کافی سامان بطور جہیز دینا چاہیے۔ تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنا نیا گھر بنا سکے۔ مگر یہ سراسر جاہلی تصور ہے۔ اسلام کے تصور نکاح سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر یہ کوئی اسلامی چیز ہوتی تو یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کا نمونہ پایا جاتا۔ کیوں کہ آپ دنیا میں اسی لیے آئے کہ دنیا وآخرت کے تمام معاملات میں خدا پرستانہ زندگی کا سچا نمونہ قائم کر دیں۔

بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ وہ بظاہر سادہ شادی کرتے ہیں۔ وہ نکاح کے مخصوص دن اپنی لڑکی کو زیادہ سامان نہیں دیتے۔ مگر بعد کو وہ سب کچھ مزید اضافے کے ساتھ اس کو دے دیتے ہیں جو ایک دنیا دار آدمی نکاح کے وقت نمائش کرکے اپنی لڑکی کو دیتا ہے۔

مگر یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہیں۔ حضرت فاطمہ رسول اللہؐ کی محبوب صاجزادی تھیں۔ مگر آپ نے ان کو نہ نکاح کے دن گھر بنانے کے لیے سازو سامان کا ڈھیر دیا اور نہ آپ نے ایسا کیا کہ اوّلا سادہ انداز میں نکاح کردیں اور اس کے بعد خاموشی کے ساتھ ہر چیز صاجزادی کے گھر پہنچا دیں۔ حتی کہ حضرت فاطمہ نے درخواست کی تب بھی آپ نے دینی نصیحت کے سوا ان کے لیے اور کچھ نہ کیا۔

حضرت فاطمہ کے بارے میں ایک روایت مختلف الفاظ میں حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ کو گھر کا سارا کام خود کرنا پڑتا تھا۔ وہ اس سے بہت پریشان تھیں۔ اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غلام آئے۔ حضرت علی نے اپنی اہلیہ حضرت فاطمہ سے کہا کہ تمہارے والد کے پاس گرفتار شدہ غلام آئے ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ اور اپنی خدمت کے لیے ایک غلام مانگ لو۔

حضرت فاطمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ آپ نے کہا کہ میری بیٹی، تم کس ضرورت سے آئی ہو۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو سلام کرنے کے لیے۔ حضرت فاطمہ شرم وحیاء کی وجہ سے آپ سے سوال نہ کرسکیں اور سلام کرکے واپس آگئیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے گھر پر آئے۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی اس کے الفاظ ایک روایت کے مطابق یہ تھے:

فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، وَاللّٰهِ لَقَدْ مَجِلَتْ يَدَايَ مِنَ الرَّحَى، أَطْحَنُ مَرَّةً، وَأَعْجِنُ مَرَّةً، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنْ يَرْزُقْكِ اللّٰهُ شَيْئًا يَأْتِكِ، وَسَأَدُلُّكِ عَلَى خَيْرٍ مِنْ ذَلِكَ: إِذَا لَزِمْتِ مَضْجَعَكِ، فَسَبِّحِي اللّٰهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَكَبِّرِي ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَاحْمَدِي أَرْبَعًا وَثَلَاثِينَ، فَذَلِكَ مِائَةٌ، فَهُوَ خَيْرٌ لَكِ مِنَ الْخَادِمِ (مسند احمد، حدیث نمبر 26551)۔

یعنی، حضرت فاطمہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، میرے دونوں ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ کبھی چکی پیستی ہوں اور کبھی گوندھتی ہوں (اس لیے مجھے ایک خادم دے دیجئے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو رزق مقدر کیا ہوگا وہ تمہارے پاس آجائے گا۔ اور میں تم کو اس سے بہتر چیز بتاتا ہوں۔ تم جب سونے کے لیے جاؤ تو 33 بار اللہ کی تسبیح کرو۔ اور 33 بار اللہ کی تکبیر کرو۔ اور 34 بار اللہ کی حمد کرو۔ یہ کُل سَو (100) ہوئے۔ یہ عمل تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے۔

جو لوگ اپنی لڑکیوں کو بڑے بڑے جہیز دینے کے لیے حضرت فاطمہ کے نکاح کی مثال پیش کرتے ہیں کیا ان میں کوئی ہے جو ایسا کر سکے کہ اس کی لڑکی اس کو اپنے ہاتھ کے چھالے دکھائے اور وہ اس کو ذکر اور تسبیح کی تلقین کرے۔ لڑکی اس کو اپنی مصیبتیں بتائے اور باپ یہ کہے کہ بیٹی تم اللہ سے دعا کر لیا کرو۔

سنّتِ رسول نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں حضرت فاطمہ کے علاوہ تین اور صاحبزادیاں تھیں جو بڑی ہوئیں اور پھر بیاہی گئیں۔ مگر مذکورہ ”جہیز“ بھی آپ نے صرف حضرت فاطمہ کو دیا۔ بقیہ صاحبزادیوں کو اس قسم کا کوئی جہیز نہیں دیا۔ اگر جہیز فی الواقع آپ کی مستقل سنّت ہوتی

تو آپ نے بقیہ صاحبزادیوں کو بھی ضرور جہیز دیا ہوتا۔ مگر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتا کہ آپ نے بقیہ صاحبزادیوں کو بھی ''جہیز'' دیا ہو۔

یہ فرق خود ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ جہیز، اگر اس کو جہیز کہا جا سکے، بر بنائے ضرورت تھا، نہ کہ بر بنائے رسم۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی جب چھوٹے تھے اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد (ابوطالب) سے کہہ کر ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ حضرت علی بچپن سے آپ کی زیر کفالت تھے۔ گویا حضرت علی ایک اعتبار سے آپ کے چچازاد بھائی تھے اور دوسرے اعتبار سے آپ کے بیٹے کے برابر تھے۔ بچپن سے آپ کے تمام اخراجات کی فراہمی آپ کے ذمہ تھی۔ اس لیے بالکل قدرتی بات تھی کہ نکاح کے بعد نیا گھر بسانے کے لیے آپ انھیں بطور سرپرست کچھ ضروری سامان دے دیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسلام ایک ناقص دین ہے، اس میں زندگی کے تمام معاملات کے بارے میں احکام موجود نہیں۔ تو مسلمان ایسے شخص سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ مگر عملاً مسلمان اسی بات کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ اسلام ایک ناقص دین ہے، یا کم از کم یہ کہ اس کی ہدایات کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کے طریقے زیادہ بہتر اور زیادہ قابل عمل ہیں۔

جہیز کے بارے میں مسلمانوں نے واضح طور پر ہندو طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کی دوسری رسوم جو مسلمانوں میں رائج ہیں وہ اسلام سے زیادہ دوسری قوموں کے طور طریقوں سے ماخوذ ہیں۔ اگر مسلمانوں کا یہ خیال ہو کہ اسلام کے کامل دین ہونے پر فخر کرنا ہی خدا کے یہاں ان کی مقبولیت کے لیے کافی ہے تو اس سے بڑی غلط فہمی اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر فخر کرتے تھے اس کے باوجود وہ خدا کے یہاں ملعون قرار دیے گئے۔

مہر کا مسئلہ

معاشرتی زندگی میں اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان ایک متوازن تقسیم قائم کی ہے۔ یہ تقسیم عمل کے اعتبار سے ہے۔ اسلام نے دونوں صنفوں کے درمیان ایک واضح تقسیم عمل کو ملحوظ رکھا ہے۔ اسلام کے مطابق، گھر کو سنبھالنے کی ذمہ داری بنیادی طور پر عورت کے اوپر ہے اور مالیات کی فراہمی کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے اوپر۔ تقسیم کار کا یہ اصول جن نصوص سے نکلتا ہے ان میں سے ایک قرآن کی یہ آیت ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ (4:34)۔ یعنی، مرد عورتوں کے اوپر قوّام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال سے خرچ کیا۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والی، پیٹھ پیچھے نگہبانی کرنے والی ہیں اللہ کی حفاظت سے۔

ہر گھر ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ اس ریاست کا ایک مسئلہ اس کا اندرونی انتظام ہے۔ اور اس کا دوسرا مسئلہ اس کی مالیات (بالفاظ دیگر، خارجی اسبابِ حیات کی فراہمی) ہے۔ عورت اپنی پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے پہلے کام کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اور مرد اپنی پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے دوسرے کام کی زیادہ بہتر صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے اسلام کی معاشرتی اور انتظامی تقسیم میں یہ کیا گیا ہے کہ گھر کے داخلی امور کی ذمہ داری بنیادی طور پر عورت پر ڈالی گئی ہے۔ اور گھر کے خارجی امور اور مالیات کی فراہمی کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے اوپر ہے۔

نکاح کے وقت ایک مرد مہر کے نام سے جو رقم اپنی بیوی کے حوالے کرتا ہے اس کا تعلق اسی خاص پہلو سے ہے۔ اسلام کے مطابق چوں کہ مرد اصولی طور پر عورت کے اخراجات کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے جب وہ ایک عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہ نکاح کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہے کہ وہ عورت کے تمام ضروری اخراجات کی کفالت کرے گا مہر اسی کی ایک علامت ہے۔ مرد اپنی بیوی کو مہر کے طور پر ایک علامتی رقم ادا کر کے عمل کی زبان میں اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی مالیاتی کفالت کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ مہر کی اصل حیثیت یہی ہے۔

مہر معجّل

مہر اصطلاحی طور پر اس رقم (یا کسی متعین چیز) کا نام ہے جو ایک مرد نکاح کے وقت اپنی بیوی کو ادا کرتا ہے۔ اس مہر کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس کو نکاح کے وقت فوراً ادا کر دیا جائے۔ مہر کی اس قسم کو مہر معجّل کہتے ہیں۔ معجّل کا لفظ عجلت سے بنا ہے۔ یعنی جلد یا بلا تاخیر ادا کی جانے والی مہر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانے میں عام رواج مہر معجّل ہی کا تھا۔ وہ لوگ مختصر مہر باندھتے اور نکاح کے وقت ہی اس کو ادا کر دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح حضرت علی ابن ابی طالب سے کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف تفصیلات حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اس کا ایک جزء مہر کے بارے میں ہے۔ نکاح کی بات طے ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ ہے:

وَهَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ تَسْتَحِلُّهَا بِهِ؟ فَقُلْتُ لَا، وَاللّٰهِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ. فَقَالَ: مَا فَعَلَتْ دِرْعٌ سَلَّحْتُكَهَا- فَوَ الَّذِي نَفْسُ عَلِيٍّ بِيَدِهِ إِنَّهَا لَحُطَمِيَّةٌ مَا ثَمَنُهَا

أَرْبَعَةَ دَرَاهِمَ- فَقُلْتُ عِنْدِي فَقَالَ قَدْ زَوَّجْتُكَهَا فَابْعَثْ إِلَيْهَا بِهَا فَاسْتَحِلَّهَا بِهَا. فَإِنْ كَانَتْ لَصَدَاقُ فَاطِمَةَ بِنْتِ رَسُولِ اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلم

(دلائل النبوة للبیہقی، جلد 3، صفحہ 160)۔یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، کیا تمہارے پاس کوئی چیز (بطورمہر) ہے جس کے ذریعہ تم فاطمہ کو اپنے لیے جائز کرو۔ میں نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم اے خدا کے رسول۔آپ نے کہا کہ وہ زرہ کیا ہوئی جو میں نے تم کو دی تھی۔(حضرت علی کہتے ہیں کہ) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں علی کی جان ہے، وہ زرہ ٹوٹ چکی تھی، اس کی قیمت چار درہم بھی نہ تھی۔پس میں نے کہا کہ وہ میرے پاس ہے۔آپ نے کہا کہ میں نے تمہارا نکاح فاطمہ سے کردیا تو اس زرہ کو فاطمہ کے پاس بھیج دو اور اس کے ذریعہ فاطمہ کو اپنے لیے جائز کرو۔تو یہ تھا فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہر۔

حضرت ربیعہ اسلمی کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اے ربیعہ تم نکاح کیوں نہیں کرلیتے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں۔ یہ سوال وجواب کئی بار ہوا۔آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انصار کے فلاں قبیلہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بھیجا ہے اور کہا ہے کہ تم فلاں عورت سے میرا نکاح کردو۔ چنانچہ میں نے جا کر کہا اور انھوں نے میرا نکاح کردیا۔مگر مجھے یہ غم تھا کہ میرے پاس مہر دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں نے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا بُرَيْدَةُ الْأَسْلَمِيُّ، اجْمَعُوا لَهُ وَزْنَ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ، قَالَ: فَجَمَعُوا لِي وَزْنَ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ، فَأَخَذْتُ مَا جَمَعُوا لِي فَأَتَيْتُ بِهِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: اذْهَبْ بِهَذَا إِلَيْهِمْ فَقُلْ: هَذَا

صَدَاقُهَا، فَأَتَيْتُهُمْ فَقُلْتُ: هَذَا صَدَاقُهَا فَرَضُوهُ وَقَبِلُوهُ، وَقَالُوا: كَثِيرٌ طَيِّبٌ۔
یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ اسلم کے سردار بریدہ اسلمی سے کہا کہ اے بریدہ تم لوگ اس کے لیے ایک گٹھلی کے ہم وزن سونا جمع کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے میرے لیے ایک گٹھلی کے ہم وزن سونا جمع کیا پھر میں نے جو کچھ انھوں نے جمع کیا تھا اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو لے کر ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ یہ اس کا مہر ہے۔ پھر میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ یہ اس کا مہر ہے انھوں نے قبول کیا اور وہ راضی ہو گئے انھوں نے کہا کہ بہت ہے، اچھا ہے (مسند احمد، حدیث نمبر 16577)۔

مہر مؤجّل

مہر کی دوسری صورت یہ ہے کہ مرد یہ وعدہ کرے کہ وہ اتنی مدت میں اس کو ادا کر دے گا۔ اس دوسری قسم کی مہر کا شرعی نام مہر مؤجّل ہے۔ مؤجّل کا لفظ اجل (مدّت) سے بنا ہے۔ مہر مُوجّل کا مطلب یہ ہے کہ وہ مہر جس کی ادائیگی کے لیے ایک وقت اور ایک مدّت مقرر کر دی جائے۔ اگر بوقتِ نکاح فوراً مہر ادا نہ کیا جا رہا ہو تو اسی وقت اس کی ادائیگی کی مدّت کا تعیّن ضروری ہے۔

مہر مؤجّل کی ایک مثال حضرت موسیٰؑ کے نکاح میں ملتی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام جب مصر سے نکل کر مدین پہنچے تو وہاں انھوں نے حضرت شعیب کی صاحبزادی (صفورا) سے نکاح کیا۔ یہ نکاح مہر مُوجّل پر ہوا تھا۔ نکاح کی مہر طرفین کی رضامندی سے یہ قرار پائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام اپنے بوڑھے خسر حضرت شعیب کی بکریاں چرائیں۔ اس گلہ بانی کی اجل (مدت) کم سے کم آٹھ سال یا زیادہ سے زیادہ دس سال تھی۔ اس کے مطابق حضرت موسیٰؑ کا نکاح ہوا اور پھر انھوں نے دس سال تک حضرت

شعیب کے گھر پر خدمت کی۔ اس طرح مہر مؤجّل کو پورا کرکے وہ دوبارہ مدین سے مصر کے لیے روانہ ہو گئے (القصص، 28-28:27)

مہر مؤجّل کسی قسم کے غیر متعین مہر کا نام نہیں ہے۔ شرعی اعتبار سے مہر مؤجّل وہ ہے جس کی ادائیگی کی اجل (موت) بوقت نکاح طے ہو اور وہ اپنے مقررہ وقت پر پوری طرح ادا کردی جائے۔

فقہاء کی رائے

مہر کا اصل شرعی طریقہ یہ ہے کہ اس کو نکاح کے وقت فوراً ادا کردیا جائے۔ اسی پر اکثر صحابہ کا عمل رہا ہے۔ گویا اصل مہر وہی ہے جو مہر معجّل ہو۔ مہر کی دوسری قسم (مہر مُؤجل) دوسرا برابر درجہ کا طریقہ نہیں۔ یہ صرف رخصت کا طریقہ ہے۔ اصلاً مہر کی ایک ہی قسم ہے، اور وہ فوراً ادا کردینا ہے۔ تاہم بطور رخصت یہ دوسرا طریقہ بھی رکھا گیا ہے تاکہ آدمی حسب ضرورت نکاح کے بعد بھی مقرر مدت پر اس کو ادا کرکے بری الذمہ ہوسکے۔

مہر کے بارے میں تفصیلی ابواب فقہ کی کتابوں میں آئے ہیں۔ عبدالرحمٰن الجزیری کی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں مہر (مباحث الصداق) پر 85 صفحات ہیں۔ مہر کے مُوجّل یا معجّل (تَاجِيْلُ الصَّدَاقِ وَتَعْجِيْلُهُ) کے مسائل چار صفحات میں ہوئے ہیں۔ اس بارے میں اگرچہ فقہاء کے درمیان بعض اختلافات ہیں مگر وہ تمام تر جزئی ہیں۔ ان جزئی اختلافات سے قطع نظر مختلف فقہاء کے اقوال کا خلاصہ صاحب کتاب کے الفاظ میں یہ ہے:

الْحَنَفِيَةُ - قَالُوا: يَجُوزُ تَاجِيْلَ الصَّدَاقِ، وَتَعْجِيلَه كُلِّه، أَوْ بَعْضُهُ، وَلَكِنْ يُشْتَرَطُ أَنْ لَا يَكُونَ الْأَجَلُ مَجْهُولًا۔

الْمَالِكِيَةُ - قَالُوا: فَإِذَا كَانَ الصَّدَاقُ غَيْرَ مُعَيَّنٍ فَإِنَّهُ يَجُوزُ كُلُّهُ. أَوْ بَعْضُهُ بِشَرْطِ أَنْ لَا يَكُونَ الْأَجَلُ مَجْهُولًا۔

الْحَنَابِلَةُ - قَالُوا: يَجُوزُ أَنْ يُؤَجِّلَ الصَّدَاقَ كُلَّهُ. أَوْ بَعْضَهُ بِشَرْطِ أَنْ لَا يَكُونَ الْأَجَلُ مَجْهُولًا۔

الشَّافِعِيَّةُ - قَالُوا: يَجُوزُ تَاجِيْلُ الصَّدَاقِ بِشَرْطِ أَنْ لَا يَكُونَ الْأَجَلُ مَجْهُولًا، سَوَاءٌ كَانَ الْمُؤَجَّلُ كُلَّ الصَّدَاقِ أَوْ بَعْضَهُ۔ (الفقه على المذاهب الأربعة، الجزء الرابع، مصر 1969، صفحہ 156-153)۔

یعنی حنفیہ کا کہنا ہے کہ مہر کی تاخیر جائز ہے۔ اس کا کل یا جزء فوری طور پر دیا بھی جاسکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ مدّت غیر متعین نہ ہو۔ مالکیہ کا قول ہے کہ مہر جب غیر معین ہو تو اس کا کل یا جزء جائز ہے اس شرط پر کہ مدت مجہول (غیر متعین) نہ ہو۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ مہر کا کل یا جزء موخر کیا جائے اس شرط پر کہ مدت مجہول نہ ہو۔ شافعیہ کا کہنا ہے کہ مہر کی تاخیر جائز ہے اس شرط پر کہ مدت مجہول نہ ہو۔ خواہ مہر کا کل حصہ مؤجّل ہو یا اس کا جزئی حصّہ۔

زیادہ مہر نہیں

مہر رقم میں بھی دی جاسکتی ہے اور کسی چیز کی صورت میں بھی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی مقدار حسبِ استعداد مقرر کی جائے۔ وہ اتنی ہی ہو کہ آدمی سہولت کے ساتھ اس کو اسی وقت ادا کر سکے۔ مہر کی کم سے کم حد کے بارے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ تاہم ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مہر کی کم سے کم مقدار یہ ہے کہ وہ اتنی ہو کہ اس کے ذریعے سے ضرورت کی کوئی چیز خریدی جاسکے۔ ہر وہ رقم مہر بن سکتی ہے جو کسی چیز کی قیمت ہو: كُلُّ مَاصَحَّ ثَمَنًا صَحَّ صَدَاقًا (الفقہ علی المذاہب الأربعة، جلد 4، صفحہ 107)۔

احادیث میں کوئی بھی ایسی حدیث نہیں جس میں زیادہ مہر مقرر کرنے کی ہمت افزائی کی گئی ہو۔ اس کے برعکس بہت سی روایتیں ہیں جن میں کم مہر مقرر کرنے کی تلقین کی گئی

ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اسلام کا طریقہ ہمیشہ تلقین کا ہوتا ہے، نہ کہ تحریم کا۔ چنانچہ زیادہ مہر کو اگرچہ بالکل ممنوع قرار نہیں دیا گیا ہے مگر تمام روایتیں اسی کے حق میں ہیں کہ مہر زیادہ نہ باندھی جائے۔ چند روایتیں یہ ہیں:

(1) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "خَيْرُهُنَّ أَيْسَرُهُنَّ صَدَاقًا" (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 4034)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے بہتر عورت وہ ہے جس کا مہر سب سے آسان ہو۔

(2) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مِنْ يُمْنِ الْمَرْأَةِ تَسْهِيلُ أَمْرِهَا، وَقِلَّةُ صَدَاقِهَا" (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 4095)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کی برکت میں سے یہ ہے کہ اس کا معاملہ آسان ہو اور اس کا مہر کم ہو۔

(3) أَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ صَدَاقًا (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 2732)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ برکت والی عورت وہ ہے جس کا مہر سب سے آسان ہو۔

(4) عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَنَّهُ قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَمْ كَانَ صَدَاقُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَتْ: "كَانَ صَدَاقُهُ لِأَزْوَاجِهِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ أُوقِيَّةً وَنَشًّا"، قَالَتْ: "أَتَدْرِي مَا النَّشُّ؟" قَالَ: قُلْتُ: لَا، قَالَتْ: "نِصْفُ أُوقِيَّةٍ، فَتِلْكَ خَمْسُمِائَةِ دِرْهَمٍ، فَهَذَا صَدَاقُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَزْوَاجِهِ" (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1426)۔ یعنی حضرت عائشہؓ

سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کا مہر کتنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہر اپنی بیویوں کے لیے بارہ اوقیہ اور ایک نش تھا۔ انہوں نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ نش کیا ہے۔ راوی نے کہا کہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نصف اوقیہ۔ یہ تقریباً پانچ سو درہم ہوا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہر اپنی بیویوں کے لیے تھا۔

لیکن ام حبیبہ کا مہر سب سے زیادہ تھا۔ روایت کے مطابق، فَزَوَّجَهَا النَّجَاشِيُّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَمْهَرَهَا عَنْهُ أَرْبَعَةَ آلَافٍ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 2107) ۔یعنی نجاشی نے ام حبیبہ کی شادی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی، اور ان کا مہر چار ہزار درہم آپ کی طرف سے نجاشی نے خود مقرر کیا تھا۔

غیر افضل طریقہ

روایات میں آتا ہے کہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق منبر پر چڑھے اور حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ مہر میں کس نے چار سو درہم پر اضافہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا مہر آپس میں چار سو درہم یا اس سے کم ہوتا تھا۔ اور اگر مہر میں زیادتی تقویٰ اور عزت کی بات ہوتی تو تم مہر کے بارے میں ان سے آگے نہیں جا سکتے تھے (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 2766)۔

دوسری روایت میں ہے کہ خلیفہ دوم نے فرمایا کہ اے لوگو، تم عورتوں کے مہر زیادہ نہ باندھو۔ اور مجھے جس شخص کے بارے میں بھی یہ اطلاع ملے گی کہ اس نے رسول اللہؐ کے مہر سے زیادہ مہر باندھا ہے یا کسی کو اس سے زیادہ مہر دیا گیا ہے تو میں زیادہ مقدار کو لے کر اس کو بیت المال میں جمع کر دوں گا۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اترے تو قریش کی ایک عورت سامنے آئی۔ اس نے کہا اے امیر المومنین، اللہ کی کتاب زیادہ پیروی کے قابل ہے یا آپ کا قول۔ حضرت عمر نے کہا کہ اللہ کی کتاب۔ عورت نے کہا کہ ابھی آپ نے لوگوں کو منع کیا ہے کہ وہ عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کریں۔ اور اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ ''اور اگر تم نے کسی عورت کو زیادہ مال دیا ہے تو (طلاق کے بعد) اس میں سے کچھ نہ لو" (4:20)۔ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا: ہر ایک عمر سے زیادہ جانتا ہے (كُلُّ أَحَدٍ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ)۔ آپ نے یہ فقرہ تین بار کہا۔ اس کے بعد حضرت عمر دوبارہ منبر پر آئے اور لوگوں سے کہا:

إِنِّي كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ أَنْ تُغَالُوا فِي صَدَاقِ النِّسَاءِ أَلَا فَلْيَفْعَلْ رَجُلٌ فِي مَالِهِ مَا بَدَا لَهُ۔ (سنن الکبری للبیہقی: 14336) میں نے تم کو عورتوں کا مہر زیادہ باندھنے سے روکا تھا۔ اب ہر آدمی کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مال میں جو چاہے کرے۔

عَنْ عُمَرَ قَالَ: لَوْ كَانَ الْمَهْرُ سَنَاءً وَرِفْعَةً فِي الْآخِرَةِ، كَانَ بَنَاتُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنِسَاؤُهُ أَحَقَّ بِذَلِكَ. "أَبُو عُمَرَ ابْنُ فَضَالَةَ فِي أَمَالِيهِ" (کنز العمال: 45797)۔ مہر اگر آخرت میں بلندی اور عظمت کی چیز ہوتی تو یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں اس کی زیادہ مستحق تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نکاح میں زیادہ مہر باندھنا اگرچہ خالص قانونی اعتبار سے بالکل ممنوع چیز نہیں مگر وہ یقینی طور پر غیر افضل چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے مہر کم تھے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کہ اس نے اپنا یا اپنی بیٹیوں کا مہر زیادہ مقرر کیا ہو۔

صحابہ کی شادی

دور اول میں شادی کوئی دھوم کی چیز نہ تھی۔ وہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بس سادہ طور پر انجام دے لیا جائے۔ اس کے رسوم اور اس کے اخراجات اتنے مختصر ہوں کہ وہ طرفین کے

لیے کسی بھی اعتبار سے بوجھ نہ بنے۔ صحابہ کے یہاں شادی کی تقریب ہر قسم کے تکلف اور نمائش سے بالکل خالی ہوتی تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جس میں کم سے کم بوجھ ہو: إِنَّ أَعْظَمَ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مَؤُونَةً (مسند احمد، حدیث نمبر 24529) اور کم بوجھ والا نکاح یقیناً وہ ہے جو اپنے موجودہ وسائل کے ذریعے آسانی کے ساتھ ہو جائے، نہ کہ وہ جس کا تحمل اس کے وسائل نہ کر سکتے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کا معاملہ آیا جس کا نکاح ایک خاتون سے طے ہوا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس مہر دینے کے لیے کیا ہے۔ اس نے کہا کہ کچھ نہیں۔ آپ نے دوبارہ پوچھا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ اس کے بعد آپ نے اس سے یہ نہیں کہا کہ تم جا کر کسی سے قرض لاؤ اور پھر اس کے ذریعہ سے نکاح کرو۔ بلکہ اگلا سوال آپ نے یہ کیا کہ کیا تمہارے پاس کچھ قرآن ہے (قرآن کا کچھ حصہ تم کو یاد ہے) اس نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا جاؤ، میں نے قرآن کے اسی محفوظ حصہ کو مہر قرار دے کر اس خاتون کے ساتھ تمہارا نکاح کر دیا: زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5132)۔

مشہور صحابی حضرت عبد الرحمن بن عوف نے مدینہ میں شادی کی۔ اس وقت مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے۔ مگر انھوں نے بس خاموشی سے ایک خاتون کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اس سلسلہ میں امام احمدؒ نے مفصل روایت نقل کی ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے:

فَجَاءَ وَعَلَيْهِ رَدْعُ زَعْفَرَانٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَهْيَمْ" فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ تَزَوَّجْتُ امْرَأَةً، فَقَالَ: "مَا أَصْدَقْتَهَا؟" قَالَ: وَزْنَ نَوَاةٍ مِنْ ذَهَبٍ (مسند احمد، حدیث نمبر 13863) یعنی، حضرت عبد الرحمن بن عوف رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان کے اوپر زعفران کی خوشبو کا اثر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایک عورت سے نکاح کرلیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کو کتنا مہر دیا۔ انھوں نے کہا کہ کھجور کی گٹھلی کے وزن کے برابر سونا۔

غلط رواج

موجودہ زمانہ میں نکاح کی اصل اسلامی روح تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ مسلمانوں میں آج نکاح کا جو طریقہ عام طور پر نظر آتا ہے وہ اسلامی نکاح سے زیادہ رواجی نکاح ہے۔ اس کا ایک نمونہ مہر ہے لڑکی والے عام طور پر مہر زیادہ باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا مقصد مرد کے مقابلہ میں عورت کے مفاد کی حفاظت ہے۔

ڈکشنری آف اسلام میں اس سلسلہ میں حسب ذیل الفاظ درج ہیں:

The custom of fixing heavy dowers, generally beyond the husband's means, especially in India, seems to be based upon the intention of checking the husband from ill-treating his wife, and, above all, from his marrying another woman, as also from wrongfully or causelessly divorcing the former. For in the case of divorce the woman can demand the full payment of the dower.

(*The Dictionary of Islam* by Thomas Patrick Hughes. (1979) p. 91)

بہت زیادہ مہر باندھنے کا رواج جو شوہر کے ذرائع سے زیادہ ہو، خاص طور پر ہندستان میں، بظاہر اس مقصد سے ہے کہ شوہر کو اس سے روکا جائے کہ وہ بیوی کے ساتھ برا سلوک کرے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ دوسری شادی نہ کر سکے۔ اور مزید یہ کہ وہ غلط طور پر یا بلا سبب اپنی بیوی کو طلاق نہ دے۔ کیوں کہ طلاق کی صورت میں عورت پوری مہر کی ادائیگی کا دعویٰ کرسکتی ہے۔

مذکورہ مقصد کے تحت مہر زیادہ باندھنا اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ نکاح کے موقع پر مہر تو مقرر کرنا ہے مگر اس کو ادا نہیں کرنا ہے۔ اگر نکاح کے ساتھ فوراً مہر ادا کر دیا جائے تو مانع طلاق یا اور کسی مانع کی حیثیت سے اس کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ جب مہر خود باقی نہیں رہا تو اس کے مانع ہونے کی حیثیت کیسے باقی رہے گی۔

مگر یہ مفروضہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اسلام میں مہر کی جائز صورتیں صرف دو ہیں۔ ایک مہر معجّل، یعنی وہ مہر جو نکاح ہونے کے بعد اسی وقت ادا کر دیا جائے۔ دوسرے مہر مؤجل، یعنی وہ مہر جس کو فوراً ادا نہ کیا جائے بلکہ اس کی ادائیگی بعد کو ہو۔ مگر یہ ''بعد'' لازمی طور پر متعین ہونا چاہیے۔ یعنی مرد اس کی ادائیگی کی ایک اجل (مدت) مقرر کرے اور اس مدت پر لازماً اس کو ادا کر دے۔ تیسری مروجہ شکل (نکاح کے وقت ادائیگی مہر کی مدت مقرر نہ کرنا) ایک غیر شرعی طریقہ ہے۔ اس کی بنیاد پر جو کچھ کیا جائے وہ بھی یقیناً غیر شرعی ہوگا۔

اب غور کیجیے کہ جب مہر کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ یا تو اس کو فوراً بوقت نکاح ادا کر دیا جائے یا نکاح کے وقت ایک متعین مدت مقرر کی جائے اور اس متعین مدت پر اس کو ضرور ادا کر دیا جائے تو ایسی صورت میں طلاق کو روکنے کے لیے زیادہ مہر مقرر کرنا بالکل بے معنی۔ صرف وہی مہر مانع کا کام کر سکتی ہے جو بلا تعین مدت مقرر کی جائے۔ مگر یہ خود اسلامی طریقہ کے مطابق نہیں۔ مہر کے لیے ادائیگی مدت کی تعیین اپنے آپ اس کو اس اعتبار سے بے اثر کر دیتی ہے کہ وہ مرد کے لیے مانع طلاق کا کام دے۔

پردہ کا حکم

از علامہ ناصر الدین الالبانی

اس باب کے تحت ایک مشہور عرب عالم اور محدث محمد ناصر الدین الالبانی (1914-1999ء) کی عربی کتاب کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔ راقم الحروف کا یہ ترجمہ اور خلاصہ ابتداءً ماہی مجلہ اسلام اور عصر جدید (دہلی) کے شمارہ جنوری 1973 میں شائع ہوا تھا۔

حجاب المرأة المسلمة في الكتاب والسنة

تالیف: محمد ناصر الدین الالبانی (شامی)

صفحات: 122، ناشر: المکتب الاسلامی، بیروت (لبنان)

ہمارے پیش نظر اس عربی کتاب کا تیسرا اڈیشن (1389ھ) ہے جو ابتدائی اڈیشنوں کے مقابلے میں مزید اضافوں کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف کے بیان کے مطابق، قرآن وحدیث کی روشنی میں پردے کے مسئلے کی تحقیق کی گئی ہے۔

مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عورت کا چہرہ لازماً پردے میں شامل نہیں ہے (وَجْهُ الْمَرْأَةِ لَيسَ بِعَوْرَةٍ)۔ اگر چہ انھیں یہ بھی اعتراف ہے کہ اس کا چھپانا زیادہ بہتر ہے (السَّترُ هُوَ أَفْضَلُ)۔ وہ ان لوگوں سے متفق نہیں ہیں جو چہرے کو اگر چہ لازمی طور پر ستر میں شامل نہیں سمجھتے۔ مگر فسادِ زمانہ کی بنا پر اسبابِ فتنہ کی روک تھام کے لیے (سَدًّا لِلذَّرِيعَةِ) اس کو چھپانا ضروری قرار دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں انھوں نے جن روایات سے استدلال کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے:

أَنَّ عَائِشَةَ أَخْبَرَتْهُ قَالَتْ: كنا نِسَاءُ الْمُؤْمِنَاتِ، يَشْهَدْنَ مَعَ رَسُولِ

اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الْفَجْرِ، مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوطِهِنَّ، ثُمَّ يَنْقَلِبْنَ إِلَى بُيُوتِهِنَّ حِينَ يَقْضِينَ الصَّلَاةَ، لَا يَعْرِفُهُنَّ أَحَدٌ مِنَ الْغَلَسِ

(صحیح البخاری، حدیث نمبر 553) صفحہ 30۔ یعنی، حضرت عائشہ نے فرمایا: مسلم خواتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز میں شریک ہوتی تھیں، چادریں لپٹی ہوتیں، پھر نماز کے بعد اپنے گھروں کو واپس ہوتی تھیں اور اس وقت اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ پہچانی نہیں جاتی تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان عورتوں کا چہرہ کُھلا ہوتا تھا۔ کیوں کہ اگر چہرہ کُھلا ہوا نہ ہوتو ان کو پہچاننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ”اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں“ یہ جملہ اس وقت بامعنی ہے جب کہ ان کا چہرہ، جس سے آدمی حقیقۃً پہچانا جاتا ہے، کُھلا ہوا ہو۔

اسی طرح عورتوں کے ہاتھ کے شامِل ستر نہ ہونے کے سلسلے میں انھوں نے ابن عباس کی مشہور روایت نقل کی ہے جس میں آیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے سامنے تقریر فرمائی اور انھیں صدقے کی تلقین کی۔ اس کے بعد حضرت بلال نے اپنا کپڑا پھیلایا تو عورتیں اپنے چھلّے اور انگوٹھی نکال نکال کر اس میں ڈالنے لگیں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 977)۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد، صاحب کتاب، ابن حزم (المحلّٰی بالآثار، جلد 2، صفحہ 248) کا قول نقل کرتے ہیں:

فَهَذَا ابْنُ عَبَّاسٍ بِحَضْرَةِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللّٰہ علیه وسلم رَأَى أَيْدِيَهُنَّ؛ فَصَحَّ أَنَّ الْيَدَ مِنَ الْمَرْأَةِ، وَالْوَجْهَ. لَيْسَا بِعَوْرَةٍ، وَمَا عَدَاهُمَا، فَفَرْضٌ سَتْرُهُ (صفحہ 31)۔ یعنی، ابن عباس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں عورتوں کے ہاتھوں کو دیکھا۔ پس ثابت ہوا کہ عورتوں کا ہاتھ اور

چہرہ دونوں چھپانے والی چیزیں نہیں ہیں۔ البتہ ان کے سوا جسم کے جو حصے ہیں، ان کا چھپانا ضروری ہے۔

"آج کل کی عورتیں زیب وزینت میں جن بے ہودہ طریقوں تک پہنچ گئی ہیں ان کو دیکھ کر میرا دل پھٹ جاتا ہے۔ مگر اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ وہ چیز جس کو اللہ نے مباح رکھا ہو، اس کو ہم حرام ٹھہرائیں۔" وہ لکھتے ہیں کہ قرآنی آیات، سنّت محمدی اور آثار سلف کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت جب گھر سے باہر نکلے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے پورے بدن کو چھپائے اور اپنی زینت کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہونے دے، ماسوا وجہ اور کفین (چہرہ اور دونوں ہاتھوں) کے۔

ان کی تحقیق کے مطابق شرائط حجاب حسب ذیل ہیں:

1۔ پورے بدن کو چھپانا اِلّا وہ جو مستثنیٰ کیا گیا ہو۔

2۔ ایسا حجاب نہ اختیار کیا جائے جو بذات خود زینت بن جائے۔

3۔ لباس باریک کپڑے کا نہ ہو جس سے بدن جھلکے۔

4۔ کشادہ لباس ہو، تنگ نہ ہو۔

5۔ خوشبو میں بسا ہوا نہ ہو۔

6۔ مرد کے مشابہ نہ ہو۔

7۔ کافر عورتوں کے مشابہ نہ ہو۔

8۔ شہرت کا لباس نہ ہو۔

حجاب کی پہلی شرط کا ماخذ، مصنف کے نزدیک سورہ نور کی آیت 31، اور سورہ احزاب کی آیت 59 ہے۔ یہ دونوں آیتیں حسب ذیل ہیں:

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ

زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (24:31)۔یعنی، اور کہہ دو مومن عورتوں سے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوا اس کے جو اس میں سے ظاہر ہو جائے اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوا اپنے شوہروں کے یا اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنی لونڈیوں پر یا ماتحت مردوں پر جن کو کوئی غرض نہ ہو یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے ابھی ناواقف ہیں اور اپنے پاؤں زور سے نہ ماریں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے۔ اور مسلمانو، تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

دوسری آیت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (33:59)۔یعنی، اے نبی کہہ دو اپنی بیویوں سے اور اپنی لڑکیوں سے اور مسلمانوں کی بیویوں سے کہ لٹکا لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادریں۔ اس سے جلدی

پہچان ہوجایا کرے گی اور ایذا نہ دی جائے گی اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

سورۂ نور کی آیت کے سلسلے میں احادیث سے استدلال کرتے ہوئے انھوں نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں الاّ ما ظَھَرَ مِنھاَ سے وجہ اور کفین (چہرہ اور ہاتھوں) کا استثنا مراد ہے۔

سورۂ احزاب کی آیت کے سلسلے میں، مختلف احادیث کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

فَيُسْتَفَادُ مِمَّا ذَكَرْنَا أَنْ سَتْرُ الْمَرْأَةِ لِوَجْهِهَا بِبُرْقَعٍ أَوْ نَحْوِهِ مِمَّا هُوَ مَعْرُوفٌ الْيَوْمَ عِنْدَ النِّسَاءِ الْمُحْصَنَاتِ أَمْرٌ مَشْرُوعٌ مَحْمُودٌ وَإِنْ كَانَ لَا يَجِبُ ذَلِكَ عَلَيْهَا بَلْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ (صفحہ 3)۔یعنی، جو شواہد ہم نے درج کیے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا برقع یا اور کسی چیز سے اپنے چہرے کو چھپانا مشروع اور پسندیدہ ہے۔ اگرچہ وہ اس پر لازم نہیں، اس طریقہ پر عمل کرنا احسن ہے مگر جو عمل نہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں۔

2۔حجاب کی دوسری شرط، مصنف کی تحقیق کے مطابق یہ ہے کہ وہ بذات خود زینت نہ ہو۔ قرآن میں اس کو "تبرج" کہا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (33:33)۔یعنی، اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے مطابق مت پھرو اور تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ کو یہ منظور ہے کہ

اے گھر والو تم سے آلودگی کو دور رکھے اور تم کو ہر طرح پاک صاف کرے۔

مصنف کے نزدیک، اس حکم کا منشا یہ ہے کہ عورت اپنی زینت اور محاسن کو اس طرح ظاہر نہ کرے کہ اس سے دیکھنے والوں میں میلان اور شہوت پیدا ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

وَالْمَقْصُودُ مِنَ الْأَمْرِ بِالْجِلْبَابِ إِنَّمَا هُوَ سَتْرُ زِينَةِ الْمَرْأَةِ، فَلَا يُعْقَلُ حِينَئِذٍ أَنْ يَكُونَ الْجِلْبَابُ نَفْسُهُ زِينَةً (صفحہ 55)۔ یعنی، جلباب لٹکانے کا حکم اس لیے ہے کہ عورت کی زینت کو چھپایا جائے۔ اس لیے نا قابلِ تصور ہے کہ جلباب خود بھی ایک زینت بن جائے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ تبرج سے بچنے کی اسلام میں اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ اس کو شرک اور زنا اور سرقہ جیسی حرام چیزوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعلق حدیثیں جمع کردی ہیں۔

3۔ مصنف کی تقسیم کے مطابق حجاب کی تیسری شرط یہ ہے کہ کپڑا باریک نہ ہو:

فَإِنَّ السَّتْرَ لَا يَتَحَقَّقُ بِهِ وَأَمَّا الشَّفَّافُ فَإِنَّهُ يَزِيدُ الْمَرْأَةَ فِتْنَةً وَزِينَةً (صفحہ 56)۔ یعنی، کیوں کہ اس کی موجودگی میں پردہ پردہ نہیں ہوسکتا اور باریک کپڑا، جس سے بدن جھلکے، عورت کے زینت اور فتنہ میں اضافہ کرتا ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے مختلف حدیثیں نقل کی ہیں۔ مثلاً:

سَيَكُونُ فِي آخِرِ أُمَّتِي نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ (المعجم الصغیر للطبرانی، حدیث نمبر 1125)۔ یعنی، میری امت کے آخری دور میں ایسی عورتیں ہوں گی جو پہن کر بھی ننگی دکھائی دیں گی۔

4۔ حجاب کی چوتھی شرط، مصنف کے نزدیک، یہ ہے کہ کپڑا ڈھیلا ڈھالا ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی تائید میں مختلف حدیثیں نقل کی ہیں۔ آخر میں انھوں نے حضرت

فاطمہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ انھوں نے اس کو ناپسند کیا کہ مرنے کے بعد عورت کو ایسے کپڑے میں لپیٹا جائے جس سے اس کا عورت ہونا ظاہر ہوتا ہو (حلیۃ الأولیاء، جلد 2، صفحہ 43)۔ نقلِ روایت کے بعد وہ لکھتے ہیں:

فَانْظُرْ إِلَى فَاطِمَةَ بُضْعَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ اسْتَقْبَحَتْ أَنْ يَصِفَ الثَّوْبُ الْمَرْأَةِ وَهِيَ مَيِّتَةٌ، فَلَا شَكَّ أَنَّ وَصْفَهُ إِيَّاهَا وَهِيَ حَيَّةٌ أَقْبَحُ وَأَقْبَحُ (صفحہ 63)۔ پس دیکھو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جگر گوشہ فاطمہ نے مردہ عورت تک کو ایسے کپڑے میں رکھنا قبیح قرار دیا جس میں اس کے نسوانی اعضا ظاہر ہوتے ہوں۔ پھر زندہ عورت کا ایسے لباس میں ہونا تو اور زیادہ بُرا ہوگا۔

5۔ حجاب کی پانچویں شرط یہ ہے کہ کپڑا خوشبو میں بسا ہوا نہ ہو۔

”بہت سی احادیث ہیں جو عورت کو اس سے روکتی ہیں کہ وہ خوشبو لگا کر باہر نکلے۔“

پھر چار روایتیں نقل کرنے کے بعد مصنف لکھتے ہیں:

وقَالَ ابنُ دقيقِ العيدِ: ”وفيهِ حُرْمَةُ التَّطيُّبِ على مُرِيدَةِ الخُرُوجِ إلى المَسْجِدِ لِمَا فِيهِ مِن تَحْرِيكِ دَاعِيَةِ شَهْوَةِ الرِّجَالِ.“ قُلتُ: فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ حَرَامًا على مُرِيدَةِ المَسْجِدِ فَمَاذَا يَكُونُ الحُكْمُ على مُرِيدَةِ السُّوقِ وَالأَزِقَّةِ وَالشَّوَارِعِ؟ لا شَكَّ أَنَّهُ أَشَدُّ حُرْمَةً وَأَكْبَرُ إِثْمًا. وَقَدْ ذَكَرَ الهَيْتَمِيُّ فِي ”الزَّوَاجِرِ“ (2/37) أَنَّ خُرُوجَ المَرْأَةِ مِن بَيْتِهَا مُتَعَطِّرَةً مُتَزَيِّنَةً مِنَ الكَبَائِرِ وَلَوْ أَذِنَ لَهَا زَوْجُهَا (صفحہ 65)۔ ابن دقیق نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں مسجد میں جانے والی عورت کے لیے خوشبو لگا کر نکلنے کو حرام قرار دیا گیا ہے کیوں کہ اس میں مردوں کے لیے شہوت کا محرک پایا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں جب یہ مسجد میں جانے والی عورت کے لیے حرام ہے تو وہ عورتیں جو بازار اور راستوں اور سڑکوں پر جاتی ہیں، یقیناً ان کی حرمت اور ان کا گناہ شدید تر ہوگا۔ اور ہیتمی نے لکھا ہے کہ عورت کا معطّر اور مزین ہو کر گھر سے نکلنا گناہِ کبیرہ ہے، خواہ اس کے شوہر نے اس کی اجازت دی ہو۔

6۔ حجاب کی چھٹی شرط یہ ہے کہ لباس مردوں کے مشابہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے مختلف روایتیں نقل کی ہیں۔ (صفحہ 67) مثلاً:

لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5885)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر لعنت کی ہے جو عورتوں کے مشابہ بنیں، اور ان عورتوں پر لعنت کی ہے جو مردوں کے مشابہ بنیں۔

اس سلسلے میں ان کی تحقیق یہ ہے:

أَنَّ اللِّبَاسَ إِذَا كَانَ غَالِبُهُ لُبْسَ الرِّجَالِ نُهِيتْ عَنْهُ الْمَرْأَةُ، وَإِنْ كَانَ سَاتِرًا (صفحہ 77)۔ یعنی، ایسا لباس عورتوں کے لیے ممنوع ہے جس کا غالب حصہ مردوں جیسا ہو، اگرچہ وہ ساتر ہی کیوں نہ ہو۔

7۔ حجاب کی ساتویں شرط یہ ہے کہ لباس کافر عورتوں کے مشابہ نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بھی شریعت کا ایک عظیم اصول ہے کہ کفّار سے تشبہ نہ اختیار کیا جائے۔ نہ عبادت میں، نہ تہواروں میں، نہ پوشاک میں (صفحہ 78)۔ قرآن میں اس کا مجمل حکم ہے۔ مگر سنت میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جن آیات سے استدلال کیا ہے، ان میں ایک وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ (57:16) ہے۔ یعنی، اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ابن تیمیہ

اور ابنِ کثیر کے اقوال نقل کیے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس میں کفار سے تشبہ اختیار کرنے کی معانعت نہی نکلتی ہے۔(صفحہ 80)

اس کے بعد انھوں نے وہ روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز، جنازہ، روزہ، حج، ذبائح، طعام، لباس، آداب وعادات اور مختلف چیزوں میں کفّار کی مشابہت اختیار کرنے سے روکا ہے۔

8۔حجاب کی آٹھویں شرط یہ ہے کہ عورت کا لباس لباسِ شہرت نہ ہو۔اس سلسلے کی ایک حدیث یہ ہے(صفحہ 110):

مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنْيَا، أَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔(مسند احمد، حدیث نمبر 5664) جو دنیا میں شہرت کا لباس پہنے، اللہ اس کو قیامت کے دن ذلّت کا لباس پہنائے گا۔

کتاب کے آخر میں مصنف نے اپنی تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

أَن يَكُونَ سَاتِرًا لِجَمِيعِ بَدَنِهَا؛ إِلَّا وَجْهَهَا وَكَفَّيْهَا، عَلَى التَّفْصِيلِ السَّابِقِ، وَأَنْ لَا يَكُونَ زِينَةً فِي نَفْسِهِ، وَلَا شَفَّافًا، وَلَا ضَيِّقًا يَصِفُ بَدَنَهَا، وَلَا مُطَيَّبًا، وَلَا مُشَابِهًا لِلِبَاسِ الرِّجَالِ وَلِبَاسِ الْكُفَّارِ، وَلَا ثَوْبَ شُهْرَةٍ (صفحہ 111)۔عورت کا لباس اس کے پورے بدن کو ڈھکنے والا ہونا چاہیے سوا چہروں اور دونوں ہاتھوں کے۔اور ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا لباس بذات خود زینت بن جائے اور وہ نہ باریک ہو اور نہ تنگ ہو کہ بدن کے اعضا ظاہر ہوں۔ وہ نہ خوشبو لگا ہوا ہو اور نہ وہ مردوں اور کفار کے مشابہ ہو اور نہ وہ لباسِ شہرت ہو۔

اضافۂ مترجم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے نبی، ایمان والے مَردوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی

رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ طریقہ ان کے لیے پاکیزہ ہے۔ بے شک اللہ باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں۔ اور ایمان والی عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اور وہ اپنی زینت کو نہ کھولیں مگر وہ جو ظاہر ہوجائے: وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (24:31)۔

اس آیت کے سلسلے میں یہ سوال ہے کہ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے کس چیز کا استثنا مراد ہے، یعنی وہ کیا چیز ہے جس کو عورت کھلا رکھ سکتی ہے۔ اس سلسلے میں فقہا اور مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ یہ دو رائیں اس واقعہ پر مبنی ہیں کہ زینت دو قسم کی ہوتی ہے۔ زینتِ خِلقیہ اور زینتِ مُکتسبہ۔ چنانچہ ایک گروہ نے اس سے دونوں قسم کی زینتیں مراد لی ہیں، اور دوسرے گروہ نے اس سے صرف زینتِ مکتسبہ مراد لیا ہے۔

ابن مسعود، حسن، ابن سیرین، ابو الجوزاء، ابراہیم نخعی وغیرہ نے اس سے صرف زینتِ مکتسبہ مراد لیا ہے۔ یعنی وہ آرائش وزیبائش جو عورت خود اپنے جسم پر ڈالتی ہے۔ مثلاً کپڑا وغیرہ۔ ان حضرات کے نزدیک عورت کو باہر نکلنے کی صورت میں اپنی اس قسم کی زیبائش کو خود سے کھلا نہیں رکھنا چاہیے، البتہ اگر اس کا کوئی جزء آپ سے ظاہر ہوجائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مثلاً جسم کے اوپر کی چادر کا ہوا سے اڑنا اور اس کی وجہ سے وقتی طور پر کسی زیبائش کا کھل جانا۔

دوسری رائے وہ ہے جو عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر، عطاء، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو الشعثاء، ضحاک، ابراہیم نخعی وغیرہ سے منقول ہے۔ یہ حضرات إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (24:31) سے وجہ اور کفین (چہرہ اور دونوں ہاتھ) کا استثناء مراد لیتے ہیں۔ یہ دوسری تفسیر اس روایت پر مبنی ہے جس کو ابو داؤد نے اپنی سُنن (حدیث نمبر 4104) میں نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ اسماء بنت ابی بکر آئیں اور ان کے جسم پر باریک کپڑا تھا۔ آپ نے ان کی

طرف سے منہ پھیر لیا۔ آپ نے فرمایا: اے اسماء عورت جب حیض کو پہنچ جائے تو اس کے لیے درست نہیں کہ وہ اس کے سوا اپنے جسم کا کوئی اور حصہ کھولے۔ اور آپ نے اپنے چہرہ اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا (تفسیر ابن کثیر، جلد 3، صفحہ 283)۔

اس بناء پر اس معاملہ میں فقہاء کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ احناف اور مالکیہ کا کہنا ہے کہ چہرہ اور دونوں ہتھلیاں چھپانے والی چیزوں میں شامل نہیں (إِنَّ الوَجْهَ وَالكَفَّيْنِ لَيْسَتَا بِعَوْرَةٍ فَقَدِ اسْتَثْنَتِ الآيَةُ (24:31) مَا ظَهَرَ مِنْهَا أَيْ مَا دَعَتِ الحَاجَةُ إِلَى كَشْفِهِ وَإِظْهَارِهِ وَهُوَ الوَجْهُ وَالكَفَّانِ)۔

شافعیہ اور حنابلہ کا کہنا ہے کہ وجہ اور کفین "عورت" ہیں۔ یعنی چھپانے کی چیزیں ہیں۔ ان کے نزدیک زینتِ خلقی اور زینتِ کسبی دونوں مطلق طور پر چھپانے کی چیزیں ہیں۔ ان کا کھولنا عورت کے لیے حرام ہے۔ اور إِلَّا مَا ظَهَرَ سے جو چیز مستثنیٰ کی گئی ہے وہ صرف وہ چیز ہے جو قصد وارادہ کے بغیر اپنے آپ کھل جائے۔ اس پر ان سے مواخذہ نہیں۔ چنانچہ چہرہ اور ہتھیلی عورت کی وہ زینت ہیں جن کا کھولنا (ضرورت کے بغیر) حرام ہے (أَنَّ المُرَادَ مَا ظَهَرَ بِدُونِ قَصْدٍ وَلَا عَمْدٍ مِثْلَ أَنْ يَكْشِفَ الرِّيحُ عَنْ نَحْرِهَا أَوْ سَاقِهَا أَوْ شَيْءٍ مِنْ جَسَدِهَا، وَيُصْبِحَ مَعْنَى الآيَةِ عَلَى هَذَا التَّأْوِيلِ: وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ أَبَدًا وَهُنَّ مُؤَاخَذَاتٌ عَلَى إِبْدَاءِ زِينَتِهِنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا بِنَفْسِهِ وَانْكَشَفَ بِغَيْرِ قَصْدٍ وَلَا عَمْدٍ، فَلَسْنَ مُؤَاخَذَاتٍ عَلَيْهِ فَيَكُونَ الوَجْهُ وَالكَفَّانِ مِنَ الزِّينَةِ الَّتِي يَحْرُمُ إِبْدَاؤُهَا) محمد علی الصابونی، روائع البیان، جلد 2، صفحہ 55-154۔

مولانا شبیر احمد عثمانی سورہ النور کی مذکورہ آیت (31) کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"احقر کے نزدیک یہاں زینت کا ترجمہ زیبائش زیادہ جامع اور مناسب ہے۔ زیبائش کا لفظ ہر قسم کی خلقی اور کسبی زینت کو شامل ہے، خواہ وہ جسم کی

پیدائشی ساخت سے متعلق ہو یا پوشاک وغیرہ خارجی ٹیپ ٹاپ سے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ عورت کو کسی بھی قسم کی خِلقی یا کسبی زیبائش کا اظہار بجز محارم کے کسی کے سامنے جائز نہیں۔ ہاں جس قدر زیبائش کا ظہور ناگزیر ہے اور اس کے ظہور کو بسبب عدم قدرت یا ضرورت کے روک نہیں سکتی۔ اس کے بہ مجبوری یا بہ ضرورت کھلا رکھنے میں مضائقہ نہیں (بشرطیکہ فتنہ کا خوف نہ ہو)۔

حدیث وآثار سے ثابت ہوتا ہے کہ چہرہ اور کفین (ہتھیلیاں) إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں داخل ہیں۔ کیوں کہ بہت سی ضروریات دینی و دنیوی ان کے کھلا رکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اگر ان کے چھپانے کا مطلقاً حکم دیا جائے تو عورتوں کے لیے کاروبار میں سخت تنگی اور دشواری پیش آئے گی۔ آگے فقہا نے قدمین کو بھی ان ہی اعضا پر قیاس کیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے صرف عورتوں کو بہ ضرورت ان کے کھلا رکھنے کی اجازت ہوئی۔ نامحرم مردوں کو اجازت نہیں دی گئی کہ وہ ان اعضاء کا نظارہ کریں۔ شاید اسی لیے اس اجازت (آیت 31) سے پیشتر ہی حق تعالیٰ نے غض بصر کا حکم (آیت 30) مومنین کو سنا دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک طرف سے کسی عضو کے کھولنے کی اجازت اس کو مستلزم نہیں کہ دوسری طرف سے اس کو دیکھنا بھی جائز ہو۔"

تجرباتی تصدیق

جدید ترقی یافتہ ملکوں کے معاشرتی مسائل میں جو مسئلہ سرفہرست ہے وہ طلاق کا مسئلہ ہے۔ ان ملکوں میں اکثر شادیاں طلاق پر ختم ہوجاتی ہیں۔ طلاقوں کی اس کثرت نے خاندانی زندگی کے نظام کو بالکل درہم برہم کردیا ہے۔ بچے اپنے والدین کی موجودگی میں بڑوں کی سرپرستی سے محروم ہوجاتے ہیں۔

وہ خودرو پودے کی طرح پرورش پاتے ہیں اور بالآخر مجرمین میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ جدید نوجوان طبقہ میں انارکی کا رجحان زیادہ تر انھیں اجڑے ہوئے گھروں (broken homes) کی پیداوار ہے۔

قدیم زمانے میں طلاق کی کثرت کا یہ مسئلہ نہ تھا۔ پھر موجودہ زمانے ہی میں یہ مسئلہ اتنے بڑے پیمانے پر کیوں پیدا ہوا ہے۔ اس کا واحد سب سے بڑا سبب وہ چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں مخلوط سماج (mixed society) اور مذہبی زبان میں بے پردہ معاشرت کہا جاتا ہے۔ اس بے قید طرزِ معاشرت نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ عورت اور مرد کسی بھی قسم کی رکاوٹ یا حد بندی کے بغیر سمندر کی مچھلیوں کی طرح ایک دوسرے کے درمیان رہیں۔ اس طرز معاشرت میں جنسی وفاداریوں کا بار بار تبدیل ہونا لازمی ہے۔ با پردہ معاشرت میں عمومی طور پر آدمی صرف اپنی بیوی کو دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ انتشارِ وفاداری کے فتنہ سے بچا رہتا ہے۔ اس کے برعکس، بے پردہ معاشرت میں بار بار دوسرے چہرے اس کے سامنے آتے ہیں۔ اب اس کو نظر آتا ہے کہ نیا چہرہ قدیم چہرے سے زیادہ اچھا ہے۔ یہ تقابلی مشاہدہ اس کو فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ پرانے جوڑے سے اکتا کر نئے جوڑے کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ چنانچہ مغربی کہانیوں میں اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ مرد اور عورت شادی کر کے کچھ دن ایک ساتھ رہے۔ اس کے بعد ان کے سامنے کوئی اور چہرہ آیا اور وہ اس کو پسند آ گیا۔ انھوں نے سابقہ تعلق کو ختم کر کے نیا تعلق قائم کر لیا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) میں مغربی ملکوں میں طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح پر کلام کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ چنانچہ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ فلم ایکٹرز مصنفین اور دوسرے گروہ کے لوگ جو کہ جنسِ مخالف سے زیادہ روابط رکھتے ہیں، ان میں طلاق کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے:

Actors, authors and other groups that have many contacts with the opposite sex tend to have a high divorce frequency (7/163)

اس مغربی رپورٹ میں طلاقوں کی کثرت کو روابط (Contacts) کی کثرت کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ یہ بہت اہم ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مخلوط معاشرت یا بے پردہ معاشرت کا بہت گہرا رشتہ ازدواجی زندگی کی عدم استواری سے ہے۔ باپردہ معاشرت کا ماحول ازدواجی زندگی میں استواری پیدا کرتا ہے، اس کے برعکس بے پردہ معاشرت کا ماحول ازدواجی زندگی میں عدم استواری کا موجب بنتا ہے اور اس طرح طلاق کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بے پردہ معاشرت کا یہ انجام باپردہ معاشرہ کے درست ہونے کی ایک تجرباتی تصدیق ہے۔

باپردہ معاشرت طلاق کے خلاف گویا ایک مانع عام (deterrent factor) کی حیثیت رکھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، بے پردہ معاشرت خاندانی نظام کو غیر مستحکم کر کے طرح طرح کی سماجی خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں باپردہ معاشرت خاندانی نظام کو مستحکم بناتی ہے جو کہ نسل انسانی کے لیے مختلف قسم کے عظیم فوائد کی ضامن ہے۔

کامیاب ازدواجی زندگی

قَالَ عبد اللّٰہ ابن جَعْفَر یوصی ابنتہ عندزواجہا:

یا بُنَیَّۃِ إِیَّاکِ وَالْغَیْرَۃَ فَإِنَّہَا مِفْتَاحُ الطَّلَاقِ، وَإِیَّاکِ وَکَثْرَۃَ الْمُعَاتَبَۃِ فَإِنَّہَا تُورِثُ الضَّغِینَۃَ۔ (انساب الاشراف للبلاذری، جلد 2، صفحہ 50)۔ یعنی، حضرت عبد اللہ بن جعفر نے نکاح کے وقت اپنی لڑکی کو نصیحت کی۔ انھوں نے کہا کہ اے میری بیٹی، تم غیرت اور نخوت سے بچو، کیونکہ وہ طلاق کا دروازہ کھولنے والی چیز ہے۔ اور تم غصہ اور ناراضگی سے بچو، کیوں کہ اس سے کینہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ بہترین نصیحت ہے جو ایک باپ اپنی بیٹی کو شادی کے وقت کرسکتا ہے۔ شادی کے بعد لڑکی ایک غیر شخص کے گھر جاتی ہے۔ اس سے پہلے وہ خونی رشتہ داروں کے درمیان رہ رہی تھی۔ اب وہ ایسے لوگوں کے درمیان جاتی ہے جن سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ خونی رشتہ دار (باپ، ماں، بھائی بہن) لڑکی کی ہر بات کو برداشت کرتے ہیں۔ وہ اپنے میکے میں نخوت دکھا کر بھی بے قدر نہیں ہوتی۔ وہ غصہ دکھائے تب بھی لوگ اس سے بیزار نہیں ہوتے۔ مگر سسرال کا معاملہ اس سے سراسر مختلف ہوتا ہے۔

سسرال میں لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے وہ پیدائشی نرمی نہیں ہوتی جو میکے کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سسرال میں اس کا ہر عمل ایک ردّ عمل پیدا کرتا ہے۔ میکہ میں لوگ اس کی نخوت کو نظر انداز کردیتے تھے، مگر سسرال میں اس کی نخوت کو لوگ اپنی یادوں میں رکھ لیتے ہیں۔ میکہ میں لوگ اس کے غصہ کو بھلا دیتے تھے، مگر سسرال میں کوئی شخص اس کے غصہ کو بھلانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ایسی حالت میں سسرال میں نباہ کی واحد شرط یہ ہے کہ لڑکی اپنے مزاج کو نئے

ماحول کے مطابق بنا کر رہے۔ وہ ایسے عمل سے بچے جو ناموافق ردّ عمل پیدا کرنے والا ہو۔ کوئی بات اپنی پسند کے خلاف ہو تو اس کو گوارا کرے۔ کسی بات سے اس کے دل کو رنج پہنچے تو اس کو دل ہی دل میں ختم کر دے۔ کسی سے امید کے خلاف سلوک کا تجربہ ہو تو اس کی اچھی توجیہ کرکے اس کو دماغ سے نکال دے۔ ایک لڑکی کے لیے سسرال میں کامیاب زندگی بنانے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ اس کے سوا سسرال کے مسئلہ کا کوئی دوسرا حل نہیں۔

نادان باپ اپنی بیٹی کو یہ سبق دیتا ہے کہ سسرال میں اکڑ کر رہنا ورنہ لوگ تم کو دبا لیں گے۔ اس کے برعکس سمجھ دار باپ کی نصیحت اپنی بیٹی کے لیے یہ ہوتی ہے کہ سسرال میں دب کر رہنا ورنہ لوگ تم سے اکڑیں گے۔ انھیں دو فقروں میں کامیاب ازدواجی زندگی اور ناکام ازدواجی زندگی کے فرق کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

دو مثالیں

مجھے دو عورتوں کا قصہ معلوم ہے۔ ایک خاتون اپنے والدین کی منظور نظر تھیں۔ وہ اپنے میکہ میں کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ سارا دن بے کاری میں گزارتی تھیں۔ شادی ہو کر جب وہ اپنی سسرال میں پہنچیں تو وہاں بھی انھوں نے اسی طرح کام سے غیر متعلق ہو کر رہنا چاہا جس طرح وہ اپنے والدین کے گھر میں کام سے غیر متعلق ہو کر رہتی تھیں۔ مگر نئے ماحول میں یہ ناممکن تھا۔ چنانچہ سسرال والوں سے ان کے اختلافات شروع ہو گئے۔ ان کی بے فکر زندگی پریشانیوں کی زندگی میں تبدیل ہو گئی۔

انھوں نے کبھی اپنے آپ پر غور نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ سسرال والوں ہی کو الزام دیتی رہیں۔ یہاں تک کہ لڑ جھگڑ کر ایک روز وہ اپنے والدین کے پاس چلی آئیں۔ یہاں انھوں نے اپنے والدین کے سامنے صرف آدھی کہانی بیان کی۔ یعنی انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں کس طرح وہاں رہی۔ وہ صرف یہ بتاتی رہیں کہ دوسروں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

ان کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ صرف اس لیے تھا کہ انھوں نے سسرال کے کام کاج سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ سسرال کو انھوں نے اپنا گھر نہیں سمجھا۔ شادی کے بعد سسرال انکا گھر بن چکا تھا مگر وہ بدستور میکہ کو اپنا گھر کہتی اور سمجھتی رہیں۔ تاہم انھوں نے اپنے والدین کو یہ بات نہیں بتائی۔ وہ صرف اس سلوک کو بتاتی رہیں جو کہ ان کے سسرال والوں نے جوابی طور پر (نہ کہ یک طرفہ طور پر) ان کے ساتھ کیا تھا۔

ان کے والدین نے وہی نادانی کی جو ایسے مواقع پر عام طور پر لڑکیوں کے والدین کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی لڑکی کی بات کو جوں کا توں مان لیا اور سسرال والوں کو یک طرفہ طور پر ظالم قرار دے کر ان کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ یہ سلسلہ لامتناہی طور پر جاری رہا۔ یہاں تک کہ لڑکی ذہنی کوفت میں مبتلا ہو کر ٹی بی کی مریض ہوگئی۔ وہ برسہا برس تک اسی حال میں پڑی رہی، اور آخر کار طویل دکھ بھری زندگی گزار کر دنیا سے چلی گئی۔

دوسرا قصہ ایک دانش مند خاتون کا ہے، نکاح کے بعد جب وہ رخصت ہو کر اپنے سسرال میں پہنچی تو وہاں کی عورتوں نے اس کو بے قدر کر دیا۔ اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے وہ زیادہ جاذب نہ تھی۔ ابتداءً اس کے پسِ پشت اس پر تبصرے ہوتے تھے۔ جلد ہی بعد خود اس کے سامنے اس کی "بدصورتی" پر تبصرے کیے جانے لگے۔ وہ اپنی سسرال کی ایک بے عزت فرد بن کر رہ گئی۔

خاتون کے لیے یہ بات بے حد سخت تھی۔ مگر اس نے طے کیا کہ اس معاملہ میں وہ اپنے والدین سے ایک لفظ بھی نہیں کہے گی۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ایک فیصلہ کیا، یہ کہ وہ لوگوں کی باتوں سے بالکل بے پروا ہو کر لوگوں کی خدمت کرے گی۔ اس نے گھر کا پورا کام رضا کارانہ طور پر سنبھال لیا۔ وہ گھر کے ہر فرد کی ضرورت کا خیال کرنے لگی۔ اس نے اپنی پوری توجہ اس میں لگا دی کہ گھر کے ہر فرد کو اس سے آرام پہنچے۔ کسی کو بھی اس سے کسی تکلیف کا تجربہ نہ ہو۔

یہ ایک طویل اور صبر آزما منصوبہ تھا۔ اس کے پورا ہونے میں مہینوں نہیں بلکہ سالوں بیت گئے۔ آخر کار دھیرے دھیرے حالات بدلنا شروع ہوئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ گھر کی سب سے زیادہ باعزت فرد بن گئی۔ ہر شخص اس کو محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ جس گھر میں اس سے پہلے وہ گھر کی خادمہ بنادی گئی تھی اسی گھر میں اس نے دوبارہ گھر کی مالکہ کی حیثیت حاصل کرلی۔

کامیاب ازدواجی زندگی کا راز صرف ایک لفظ میں چھپا ہوا ہے، اور وہ وفاداری ہے۔ میکہ میں ایک لڑکی کی وفاداری، ماں باپ اور بھائی بہن کے درمیان، پیدائشی طور پر مسلّم ہوتی ہے۔ وہاں پیشگی طور پر ہر ایک کو اس کی وفاداری کا یقین ہوتا ہے۔ خون کا تعلق اس کو اپنے میکہ والوں کے لیے ایسا وفادار بنادیتا ہے جو کسی حال میں بھی ختم ہونے والا نہیں۔

مگر سسرال کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں اس کی وفاداری پہلے سے موجود نہیں ہوتی۔ وہ قائم کرنے سے قائم ہوتی ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ عورت اپنا گھر تبدیل کرنے کے ساتھ اپنی وفاداری بھی تبدیل کردے۔ وہ پیدائشی وفاداری کو شعوری وفاداری بنائے۔ اب اس کے یہاں "اپنا گھر" کے معنی اس کی سسرال ہو۔ اب اس کی توجہات کا مرکز اس کے شوہر کا خاندان بن جائے۔ وہ اپنے میکہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دے، وہ ہر معاملہ میں اپنی سسرال کی طرف دیکھے۔ وہ دل سے سسرال والوں کی خیر خواہ بن جائے۔ یہی بطور واقعہ بھی درست ہے اور یہی عورت کے لیے اپنی شادی شدہ زندگی کو کامیاب بنانے کا راز بھی۔

یقینی حل

حقیقت یہ ہے کہ خوش گوار ازدواجی زندگی کا معاملہ سب سے زیادہ شعور سے متعلق ہے۔ شعور کسی خاتون کی شادی شدہ زندگی کو کامیاب بناتا ہے اور بے شعوری اس کی شادی

شدہ زندگی کو تلخ اور ناکام بنا کر رکھ دیتی ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ چیز جس کو "سسرال کا جھگڑا" کہا جاتا ہے وہ ایک مصنوعی مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ حقیقت سے زیادہ فرضی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا موجودہ معاشرہ ایک بے خبر معاشرہ ہے۔ معاشرہ مختلف صورتوں میں اس بے خبری کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ اسی میں سے ایک قیمت وہ ہے جس کو "سسرال کا جھگڑا" کہا جاتا ہے۔

بعض تاریخی اسباب کی بنا پر ہمارے معاشرہ کے افراد زیادہ تر خوش خیالیوں میں جی رہے ہیں۔ انھیں زندگی کی حقیقتوں کی خبر نہیں۔ اس بے شعوری کی قیمت ہمارے افراد زندگی کے ہر شعبہ میں ادا کر رہے ہیں۔ اور اسی کا ایک جزء وہ ہے جو سسرالی شکایتوں اور خاندانی جھگڑوں کی صورت میں ان کے حصہ میں آیا ہے۔

میکہ اور سسرال کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ۔ میکہ وہ گھر ہے جہاں ایک لڑکی اپنے ماں باپ کی محبت کی وجہ سے مقام حاصل کرتی ہے، اور سسرال وہ گھر ہے جہاں لڑکی خود اپنے عمل کی بنیاد پر اپنا مقام بناتی ہے۔ انھیں دو فقروں کے ذریعہ میکہ اور سسرال کے پورے معاملہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔

لڑکی اپنے ماں باپ کا گوشت اور خون ہوتی ہے۔ وہ اس سے ہر حال میں محبت کرتے ہیں، خواہ وہ اچھی ہو یا بری، خواہ وہ کام والی ہو یا بے کام والی۔ اس کے والدین کو اس سے آرام ملے تب بھی وہ اس سے قدر و محبت کا معاملہ کرتے ہیں اور تکلیف ملے تب بھی۔

مگر سسرال کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایک لڑکی کا سسرال میں جانا اپنے غیر خونی رشتہ داروں میں جانا ہے۔ خونی رشتہ داروں میں اگر وہ "محبت برائے محبت" کے ماحول میں رہ رہی تھی تو غیر خونی رشتہ داروں کے درمیان اس کو "محبت برائے کردار" کے ماحول میں رہنا پڑتا ہے۔ پہلی جگہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر محبت ملتی ہے اور دوسری جگہ دو طرفہ بنیاد پر۔

جب ایک لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو وہ اسی نازک امتحان میں داخل ہوتی ہے۔ شادی ایک لڑکی کے لیے ایسا ہی ہے جیسے ایک مچھلی جو پانی میں رہنے کی عادی ہو اس کو اچانک خشکی کا عادی بننے کے لیے پانی سے باہر ڈال دیا جائے۔ اگر لڑکی کو خوش قسمتی سے ایسے والدین ملے ہوں جو مذکورہ راز کو جانتے ہوں اور انھوں نے اپنی لڑکی کو پیشگی طور پر اس سے آگاہ کر دیا ہو تو لڑکی کا ذہن نئی صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اسی طرح اگر لڑکی باشعور ہے تو وہ خود اس راز کو سمجھ لیتی ہے اور اپنے آپ کو نئے ماحول کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

کسی لڑکی کو اگر خوش قسمتی سے ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز حاصل ہو جائے تو اس کے لیے شادی کے بعد کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے شادی کے دور میں داخل ہونا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی شخص نیا موسم آنے کے بعد اپنے لباس کے معمولات کو بدل لے۔ ایسی لڑکی اپنے کردار کی بدولت دوبارہ اپنی سسرال میں وہی باعزت مقام حاصل کر لیتی ہے جو باعزّت مقام اس سے پہلے وہ اپنے والدین کے گھر میں والدین کی محبت کی بدولت حاصل کیے ہوئے تھی۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ نہ والدین زندگی کی اس حقیقت کو جانتے ہوں اور نہ لڑکی خود اتنی باشعور ہو کہ وہ اس کو جان کر اپنے آپ کو اس کے مطابق بنائے تو اس کے بعد وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو ”سسرال کا جھگڑا“ کہا جاتا ہے۔ لڑکی سسرال کو اپنا گھر نہیں سمجھتی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سسرال والے بھی اس کو اپنا فرد نہیں بنا پاتے۔ اس کی قیمت لڑکی کو یہ بھگتنی پڑتی ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر سسرال میں کڑھتی رہے، وہ غیر واقعی طور پر اپنے آپ کو نفسیاتی عذاب میں مبتلا کیے ہوئے ہو۔ سسرال کا جھگڑا خود اپنی بے شعوری کی قیمت ہے جس کو نادان لڑکیاں سسرال کی طرف منسوب کر دیتی ہیں۔

بعض نادان لڑکیاں اس سے آگے تک جاتی ہیں۔ وہ اپنے میکہ جا کر وہاں اپنے والدین سے سسرال کی شکایتیں بیان کرتی ہیں۔ یہ شکایتیں اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے سراسر فرضی ہوتی ہیں۔ مگر کسی کا قول یہاں صادق آتا ہے کہ ”ہر باپ اپنی اولاد کے حق میں بیوقوف ہوتا ہے“۔ چنانچہ نادان والدین ان جھوٹی شکایتوں کو سچ سمجھ کر سسرال کے خلاف کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ چھیڑ دیتے ہیں۔ مزید لطف یہ کہ اس جھوٹی جنگ کا بدترین انجام ہمیشہ ان لوگوں کے حصہّ میں آتا ہے جنھوں نے یہ جنگ چھیڑی تھی۔ یعنی لڑکی اور اس کے والدین۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ لڑکی مقابلتاً ”عضو ضعیف“ ہے۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جب قوی اور ضعیف میں ٹکراؤ ہو تو اس کا نقصان ہمیشہ ضعیف کو اٹھانا پڑے گا۔

سسرال کے بارے میں لڑکیوں کی شکایت جھوٹی شکایت کیوں ہوتی ہے۔ یہ جھوٹی شکایت اس لیے ہے کہ وہ ہمیشہ دو طرفہ سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر لڑکیاں ہمیشہ اس کو یک طرفہ بنا کر پیش کرتی ہیں۔ ایک ایسا مسئلہ جو دو طرفہ سبب سے پیدا ہوا ہو۔ اس کو یک طرفہ مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرنا ہی اس مسئلہ کو جھوٹا بنا دیتا ہے۔ گاہک نے اگر قیمت ادا نہ کی ہو تو اس کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ دکاندار نے سودا نہیں دیا۔ لڑکی اگر غیر جانبدارانہ انداز سے سوچ سکے تو وہ نہایت آسانی سے جان لے گی کہ سارے معاملہ کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ — لڑکی نے سسرال والوں کو وہ چیز نہیں دی جو سسرال والے اس سے چاہتے تھے، اس لیے سسرال والوں سے بھی اس کو وہ چیز نہیں ملی جو وہ ان سے پانا چاہتی تھی اور یقیناً پا سکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ سسرال زندگی کی معلّم ہے۔ ایک لڑکی کا سسرال میں جانا گویا ایک ایسی درس گاہ میں جانا ہے جہاں وہ زندگی کی حقیقتیں سیکھے۔ جہاں وہ ان رازوں کو جانے جو وہ میکہ کے مصنوعی ماحول میں نہیں جان سکی تھی۔ میکہ ایک لڑکی کے لیے مصنوعی دنیا ہے۔ اور سسرال اس کے لیے حقیقی دنیا۔ جو لڑکی اس راز کو نہ جانے وہ ہمیشہ اپنی زندگی

میں ناکام رہے گی اور جولڑکی اس راز کو جان لے وہ ہمیشہ اپنی زندگی میں کامیاب ہوگی۔ کوئی بھی چیز اس کی کامیابی کو روکنے والی نہیں۔

غیر مشترک نظام

موجودہ زمانے کی لڑکیوں نے مشترک خاندانی نظام کو اپنے لیے مصیبت سمجھ کر اس کا بدل یہ تلاش کیا ہے کہ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ الگ رہیں۔ خاص طور پر تعلیم یافتہ لڑکیاں شادی کے بعد پہلی کوشش یہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے شوہر کو اس پر راضی کریں کہ وہ اپنے ماں باپ سے جدا ہو جائے اور بیوی کو لے کر علاحدہ زندگی گزارے۔

یہ خیال بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ابتدائی کچھ دنوں کے بعد وہ عورت کے لیے ایک ایسا بوجھ ثابت ہوتا ہے جو مشترک زندگی سے بھی زیادہ مسائل اپنے ساتھ لیے ہوئے ہو۔ میں نے بہت سی لڑکیوں کو دیکھا ہے جنھوں نے ابتدائی جوش کے تحت اپنے شوہر کو اس کے والدین سے جدا کیا اور اس کو "فتح" کر کے علاحدہ رہنے لگیں۔ مگر آخر کار ان کے لیے زندگی ایک ایسا بوجھ ثابت ہوئی جس میں ان کا پورا وجود پس کر رہ گیا۔ مشترک زندگی میں ایک عورت صرف نفسیات کی قربانی دیتی ہے۔ مگر غیر مشترک زندگی میں اس کو اپنے پورے وجود کی قربانی دینی پڑتی ہے، اور پہلی قربانی کے مقابلے میں دوسری قربانی بلاشبہ زیادہ سخت ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے جدید مغربی معاشرہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ درمیانی درجہ کی خاتون نے تعلیم حاصل کی اور اپنے آپ کو روزگار کے قابل بنایا۔ مگر عین اسی وقت اس نے (جدید صنعتی نظام کے نتیجے میں) اپنے گھریلو ملازموں کو کھو دیا، رشتہ داروں کی بلاتنخواہ مدد جو مشترک خاندانی نظام میں اس کو مل رہی تھی اس سے بھی وہ (غیر مشترک زندگی کی وجہ سے) محروم ہوگئی۔ اس کے لیے صرف دو امکان باقی رہا۔ یا تو وہ بالکل گھریلو خادمہ بن کر رہ جائے یا بیک وقت دو کام کا ناقابل برداشت بوجھ اُٹھائے:

Middle class woman acquired eduaction and a chance at career at the very time she lost her domestic servants and the unpaid household help of relatives living in the old, large family; she had to become either a household drudge or carry the intolerably heavy load of two simultaneous fulltime jobs.

(*Time,* March 20, 1972)

مشترک خاندانی زندگی میں بعض ناخوش گوار پہلوؤں کو دیکھ کرلڑکیاں گھبرا اٹھتی ہیں اورغیر مشترک خاندانی زندگی کی طرف دوڑ پڑتی ہیں۔مگر اکثر اوقات یہ محض ایک جذباتی فیصلہ ہوتا ہے۔غیر مشترک زندگی میں گھر کو سنبھالنے کے لیے لڑکیاں جتنی محنت اور قربانی پیش کرتی ہیں، اس کی نصف محنت اور قربانی اگر وہ مشترک زندگی میں پیش کریں تو وہ کہیں زیادہ سکھ اور چین کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی مشکلوں سے خالی نہیں ہوتی۔البتہ ہم اپنی دانش مندی سے اپنی مشکلوں کو گھٹا سکتے ہیں۔دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے میں بلاشبہ بعض مشکلات ہیں۔مگر وہ الگ رہنے کے مقابلے میں یقینی طور پر کم ہیں۔اور ہر عقل مند مرد اور عورت کو چاہیے کہ وہ زیادہ مشکل کے مقابلے میں کم مشکل کو ترجیح دے۔

ذہنی مسائل

گھریلو مسائل میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جو سوتیلی اولاد کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک عورت کسی شخص کی دوسری بیوی بن کر ایک گھر میں داخل ہو اور وہاں پچھلی بیوی سے ہونے والی اولاد موجود ہو تو عام طور پر گھر کے اندر نازک مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو بعض اوقات گھر کی بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

ہر عورت کو فطری طور پر اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے جب تک دوسری بیوی کے یہاں اولاد نہ ہو، اس وقت تک اس کی یہ کمزوری چھپی رہتی ہے۔مگر جیسے ہی دوسری بیوی کے یہاں اولاد پیدا ہوئی، اس کی دل چسپیاں اور توجہات اپنی اولاد کی طرف مائل ہو جاتی

ہیں۔ بس یہیں سے بگاڑ کا آغاز ہوجاتا ہے۔ پچھلی بیوی کی اولاد اپنے آپ کو گھر کے اندر بے جگہ محسوس کرنے لگتی ہے۔ اب کشمکش شروع ہوجاتی ہے جو بعض اوقات ایسے نتائج تک پہنچ جاتی ہے جو دونوں میں سے کسی کے حق میں بھی مفید نہیں ہوتی۔

اس صورت حال کا حل نہایت آسان ہے۔ اور وہ ایک لفظ میں ''وضع داری'' ہے۔ جب بھی گھر کے اندر ایسی صورت حال پیش آئے تو عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے دلی جذبات پر وضع داری کا پردہ ڈال لے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ کوئی نزاکت پیدا نہ ہوگی۔

دوسری بیوی کو جاننا چاہیے کہ اگر وہ عام معاملات میں اپنی سگی اولاد کا بظاہر کم لحاظ کرے تو اس سے اس کی اولاد کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اولاد کے لیے سب سے بڑی چیز ماں ہوتی ہے اور وہ زندہ حالت میں پوری طرح اسے حاصِل ہے۔ مگر پہلی بیوی کی اولاد اپنی ماں کی وفات کی وجہ سے احساسِ محرومی میں مبتلا رہتی ہے۔ اس لیے ظاہری معاملات میں اگر اس کا کچھ کم لحاظ کیا جائے تو اس کو فوراً اس کا احساس ہوگا۔ اس کی یہ نفسیاتی حالت اس کو ذلت کے احساس میں مبتلا کردے گی، اور اجتماعی زندگی میں کسی شخص کا احساس ذلت میں مبتلا ہونا ہمیشہ فساد پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

یہاں میں ایک عملی مثال دیتا ہوں، مولانا سید سلیمان ندوی (1884-1953ء) کی اہلیہ سلیمہ خاتون (1905-1987) مولانا مرحوم کی دوسری بیوی تھیں۔ 1923ء میں جب وہ شادی کے بعد مولانا مرحوم کے یہاں آئیں تو پچھلی بیوی سے ان کے یہاں ایک صاحبزادے تھے جن کا نام ابوسہیل تھا۔ سلیمہ خاتون جب کسی کو خط لکھتیں تو قدیم روایت کے مطابق اپنا نام نہ لکھتیں، بلکہ ''والدہ ابوسہیل'' لکھتیں۔

یہاں تک کہ خود ان کے یہاں اولاد ہوئی۔ وہ چار لڑکیوں اور ایک لڑکے کی ماں بن گئیں۔ مگر ان کی سابقہ وضع میں فرق نہیں آیا۔ وہ اپنی تحریروں میں بدستور ''والدہ ابوسہیل''

لکھتی رہیں۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سلمان ندوی بذات خود ایک مشہور شخصیت ہیں، مگر سلیمہ خاتون صاحبہ نے کبھی اپنے آپ کو ''والدہ سلمان'' نہیں لکھا۔ بلکہ ہمیشہ ''والدہ ابوسہیل'' لکھا۔ مرحومہ ایک دین دار خاتون تھیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات کے بعد وہ دنیا میں 34 سال تک رہیں مگر ان کی اس وضع داری میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اگست 1987، ''شذرات'')۔

سلیمہ خاتون مرحومہ کا وضع داری کا یہی رویہ گھر کی عام زندگی میں تھا۔ ہر ماں کی طرح انھیں بھی قلبی طور پر اپنی سگی اولاد سے زیادہ محبت ہوگی۔ مگر عام رویے میں انھوں نے کبھی اپنی اس قلبی حالت کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابوسہیل صاحب اپنے سوتیلے بہن بھائی کے ساتھ بالکل سگے بھائی کی طرح رہے اور گھر کے اندر کبھی کوئی نزاکت پیدا نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام مسائل جن کو گھریلو مسائل کہا جاتا ہے، وہ 99 فی صد محض نفسیاتی ہوتے ہیں۔ وہ ایک نفسیات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور دوسری نفسیات کے تحت انھیں ختم کیا جاسکتا ہے۔ ان کا حقیقی کے بجائے نفسیاتی ہونا نہایت آسانی کے ساتھ اس طرح معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ایک ساس کو جب اپنی بہو سے کوئی شکایت پیدا ہو تو وہ سوچے کہ یہی کام اگر اس کی بیٹی کرتی، کیا تب بھی اس کو اس پر شکایت ہوتی۔ اسی طرح جب ایک بہو کو اپنی ساس سے کسی معاملہ میں شکایت ہو تو وہ سوچے کہ یہی معاملہ اگر ماں کی طرف سے پیش آیا ہوتا، کیا تب بھی وہ اس پر رنجیدہ ہو کر بیٹھ جاتی۔

ساس اور بہو اگر اس اعتبار سے غور کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ ان کی شکایت سراسر بے بنیاد تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے تمام مسائل ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور ذہن ہی میں انھیں ختم کیا جاسکتا ہے۔ ذہن سے باہر نہ ان کا کہیں وجود ہے اور نہ ذہن سے باہر کہیں ان کو حل کرنے کی ضرورت۔

تعدّدِ ازواج

قرآن میں اجتماعی زندگی کے بارے میں جو احکام دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک حکم وہ ہے جو تعدد ازواج (چار عورتوں تک نکاح کرنے) کے بارے میں ہے۔ اس سلسلے میں آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (4:3)۔ یعنی، اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو (بیوہ) عورتوں میں جو تم کو پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔ اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔

یہ آیت غزوۂ احد (شوال 3ھ) کے بعد اتری۔ اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ اس جنگ میں 70 مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ سے مدینہ کی بستی میں اچانک 70 گھر مردوں سے خالی ہو گئے۔ نتیجۃً یہ صورت حال پیش آئی کہ وہاں بہت سے بچے یتیم اور بہت سی عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اس معاشرتی مسئلہ کو کس طرح حل کیا جائے۔ اس وقت قرآن میں مذکورہ آیت اتری اور کہا گیا کہ جو لوگ استطاعت رکھتے ہوں وہ بیوہ عورتوں سے نکاح کر کے یتیم بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیں۔

اپنے الفاظ اور اپنے شانِ نزول کے اعتبار سے بظاہر یہ ایک وقتی حکم نظر آتا ہے۔ یعنی اس کا تعلق اس صورت حال سے ہے جب کہ جنگ کے نتیجے میں آبادی کے اندر عورتوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی اور مردوں کی تعداد کم۔ مگر قرآن اپنے نزول کے اعتبار سے زمانی ہونے کے باوجود، اپنے اطلاق کے اعتبار سے ایک ابدی کتاب ہے۔ قرآن کے اعجاز کا ایک

پہلو یہ بھی ہے کہ وہ زمانی زبان میں ابدی حقیقت بیان کرتا ہے۔ اس کا یہ حکم بھی اس کی صفتِ خاص کا مظہر ہے۔

زیادہ شادی کا معاملہ صرف مرد کی مرضی پر منحصر نہیں۔ اس کی لازمی شرط (inescapable condition) یہ ہے کہ معاشرہ میں زیادہ عورتیں بھی موجود ہوں۔ اگر زمین پر ایک ہزار ملین انسان بستے ہوں، اور ان میں 500 ملین مرد ہوں اور 500 ملین عورتیں، تو ایسی حالت میں مردوں کے لیے ممکن ہی نہ ہوگا کہ وہ ایک سے زیادہ نکاح کریں۔ ایسی حالت میں ایک سے زیادہ نکاح صرف جبراً کیا جا سکتا ہے، اور جبری نکاح اسلام میں جائز نہیں۔ اسلامی شریعت میں نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ہر حال میں ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس طرح عملی طور پر دیکھیے تو قرآن کے مذکورہ حکم کی تعمیل صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ سماج میں وہ مخصوص صورت حال پائی جائے جو اُحد کی جنگ کے بعد مدینہ میں پائی جا رہی تھی، یعنی مردوں اور عورتوں کی تعداد میں نابرابری۔ اگر یہ صورتِ حال نہ پائی جا رہی ہو تو قرآن کا حکم عملاً ناقابل نفاذ ہوگا۔ مگر انسانی سماج اور انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قدیم مدینہ کی صورت حال محض وقتی صورت حال نہ تھی، یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جو اکثر حالات میں زمین پر موجود رہتی ہے۔ مذکورہ ہنگامی حالت ہی ہماری دنیا کی عمومی حالت ہے۔ یہ قرآن کے مصنف کے عالم الغیب ہونے کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں ایک ایسا حکم دیا جو بظاہر ایک ہنگامی حکم تھا، مگر وہ ہماری دنیا کے لیے ایک ابدی حکم بن گیا۔

تعداد کی نابرابری

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ باعتبار پیدائش عورت اور مرد کی تعداد تقریباً یکساں ہوتی ہے، یعنی جتنے بچے تقریباً اتنی ہی بچیاں۔ مگر شرح اموات (mortality) کے جائزے سے

معلوم ہوا ہے کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے درمیان موت کی شرح زیادہ ہے۔ یہ فرق بچپن سے لے کر آخر عمر تک جاری رہتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984) کے مطابق، عمومی طور پر، موت کا خطرہ عمر کے ہر مرحلہ میں، عورتوں کے لیے کم پایا گیا ہے اور مردوں کے لیے زیادہ:

In general, the risk of death at any given age is less for females than for males (VII/37)

اکثر حالات میں سماج کے اندر عورتوں کی تعداد کا زیادہ ہونا اور مردوں کی تعداد کا کم ہونا مختلف اسباب سے ہوتا ہے۔ مثلاً جب جنگ ہوتی ہے تو اس میں زیادہ تر صرف مرد مارے جاتے ہیں۔ پہلی عالمی جنگ (18-1914) میں آٹھ ملین سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ شہری لوگ جو اس جنگ میں ہلاک ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ یہ زیادہ تر مرد تھے۔ دوسری عالمی جنگ (45-1939) میں ساڑھے چھ کروڑ آدمی ہلاک ہوئے یا جسمانی طور پر ناکارہ ہو گئے۔ یہ سارے لوگ زیادہ تر مرد تھے۔ عراق۔ایران جنگ (88-1979ء) میں ایران کی 86 ہزار عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ عراق میں ایسی عورتوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے جن کے شوہر اس دس سالہ جنگ میں ہلاک ہوئے۔

اسی طرح مثال کے طور پر جیل اور قید کی وجہ سے بھی سماج میں مردوں کی تعداد کم اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ امریکا کو موجودہ زمانہ میں دنیا کی مہذب ترین سوسائٹی کی حیثیت حاصل ہے۔

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ امریکا میں ہر روز تقریباً 13 لاکھ (1,300,000) آدمی کسی نہ کسی جرم میں پکڑے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تعداد وہ ہے جو لمبی مدت تک کے لیے جیل میں ڈال دی جاتی ہے۔ ان سزا یافتہ قیدیوں میں دوبارہ 97 فی صد مرد ہی ہوتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، 1102/14)

اسی طرح جدید صنعتی نظام نے حادثات کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ موجودہ زمانے میں حادثاتی موتیں روزمرہ کا معمول بن گئی ہیں۔ سڑک کے حادثے، ہوائی حادثے، کارخانوں کے حادثے اور دوسرے مشینی حادثے ہر ملک میں اور ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ جدید صنعتی دور میں یہ حادثات اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں کہ اب سیفٹی انجینئرنگ (safety engineering) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آ گیا ہے۔ 1967 کے اعداد وشمار کے مطابق، اس ایک سال میں پچاس ملکوں کے اندر مجموعی طور پر 175000 حادثاتی موتیں واقع ہوئیں۔ یہ سب زیادہ تر مرد تھے۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، 137/16)

صنعتی حادثات کی موتوں، سیفٹی انجینئرنگ کے باوجود، پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر، ہوائی حادثات جتنے 1988 میں ہوئے، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح تمام صنعتی ملکوں میں مستقل طور پر اسلحہ سازی کے تجربات ہو رہے ہیں۔ ان میں برابر لوگ ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ ان ہلاک شدگان کی تعداد کبھی نہیں بتائی جاتی، تاہم یہ یقینی ہے کہ ان میں تمام تر صرف مرد ہی ہیں جو ناگہانی موت کا شکار ہوتے ہیں۔

اس طرح کے مختلف اسباب کی بنا پر عملی صورت حال اکثر یہی ہوتی ہے کہ سماج میں عورتوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہو، اور مردوں کی تعداد نسبتاً کم ہو جائے۔ امریکا کی سوسائٹی نہایت ترقی یافتہ سوسائٹی سمجھی جاتی ہے، مگر وہاں بھی یہ فرق پوری طرح پایا جاتا ہے۔ 1987 کے اعداد وشمار کے مطابق، امریکا کی آبادی میں مردوں کے مقابلے میں تقریباً 71 لاکھ (7.8 million) عورتیں زیادہ تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امریکا کا ہر مرد شادی شدہ ہو جائے تو اس کے بعد بھی امریکا میں تقریباً 71 لاکھ عورتیں ایسی باقی رہیں گی جن کے لیے ملک میں غیر شادی شدہ مرد موجود نہ ہوں گے جن سے وہ نکاح کرسکیں۔

دنیا کی آبادی میں مرد اور عورت کی تعداد کے فرق کو بتانے کے لیے یہاں کچھ مغربی ملکوں کے اعداد وشمار دیے جارہے ہیں۔ یہ اعداد وشمار انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) سے لیے گئے ہیں:

COUNTRY	MALE	FEMALE
1. Austria	47.07%	52.93%
2. Burma	48.81	51.19
3. Germany	48.02	51.89
4. France	48.99	51.01
5. Italy	48.89	51.11
6. Poland	48.61	51.39
7. Spain	48.94	51.06
8. Switzerland	48.67	51.33
9. Soviet Union	46.59	53.03
10. United States	48.58	51.42

عورت کی رضامندی

ایک سے زیادہ نکاح کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آبادی کے اندر عورتیں زیادہ تعداد میں موجود ہوں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ جس عورت سے نکاح کرنا مطلوب ہے وہ خود بھی اپنی آزادانہ مرضی سے اس قسم کے نکاح کے لیے پوری طرح راضی ہو۔ اسلام میں عورت کی رضامندی مسلّمہ طور پر نکاح کے لیے شرط ہے۔ کسی عورت سے زبردستی نکاح کرنا جائز نہیں۔ اسلام کی نمائندہ تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسی مثال نہیں ہے جب کہ کسی مرد کو یہ اجازت دی گئی ہو کہ وہ کسی عورت کو جبراً اپنے نکاح میں لے آئے۔

حدیث میں آیا ہے کہ کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت نہ

لے لی جائے: لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6567؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1419)۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ ایک لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کر دیا ہے۔ آپ نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے تو نکاح کو باقی رکھے اور چاہے تو اس کو توڑ دے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ جَارِيَةً بِكْرًا أَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَتْ أَنَّ أَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ فَخَيَّرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 2096)۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ زَوْجَ بَرِيرَةَ كَانَ عَبْدًا يُقَالُ لَهُ مُغِيثٌ، كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ يَطُوفُ خَلْفَهَا يَبْكِي وَدُمُوعُهُ تَسِيلُ عَلَى لِحْيَتِهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَبَّاسٍ: يَا عَبَّاسُ، أَلَا تَعْجَبُ مِنْ حُبِّ مُغِيثٍ بَرِيرَةَ، وَمِنْ بُغْضِ بَرِيرَةَ مُغِيثًا؟، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَوْ رَاجَعْتِهِ. قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، تَأْمُرُنِي؟ قَالَ: إِنَّمَا أَنَا أَشْفَعُ، قَالَتْ: لَا حَاجَةَ لِي فِيهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5283)۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ بریرہ کا شوہر ایک سیاہ فام غلام تھا۔ اس کا نام مغیث تھا۔ گویا کہ میں مغیث کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ مدینہ کے راستوں میں بَریرہ کے پیچھے چل رہا ہے۔ وہ رو رہا ہے اور اس کے آنسو اس کی داڑھی تک بہہ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس سے کہا کہ اے عباس، کیا تم کو بریرہ کے ساتھ مغیث کی محبت اور مغیث کے ساتھ بریرہ کی نفرت پر تعجب نہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے کہا کہ کاش تم اس کی طرف رجوع کرلو۔ بریرہ نے کہا کہ کیا آپ مجھ کو

اس کا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ صرف سفارش کر رہا ہوں۔ بریرہ نے کہا: مجھے اس کی حاجت نہیں۔

تعدد ازواج کا ایک واقعہ ہے جو حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانے میں پیش آیا۔ ایک بیوہ خاتون ام ابان بن عتبہ کو چار مسلمانوں کی طرف سے نکاح کا پیغام ملا جو سب کے سب شادی شدہ تھے۔ ان چار حضرات کے نام یہ ہیں۔ عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب ،زبیر اور طلحہ۔ ام ابان نے طلحہ کا پیغام قبول کرلیا اور بقیہ تینوں کے لیے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ام ابان کا نکاح طلحہ سے کر دیا گیا۔

یہ واقعہ مدینہ (اسلامی دار السلطنت) میں ہوا۔ جن لوگوں کے پیغام کو رد کیا گیا، ان میں وقت کے امیر المومنین کا نام بھی شامل تھا۔ مگر اس پر کسی نے تعجب یا بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ اس بنا پر وہاں امن وامان کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام میں عورت کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ عورت کا ایک ایسا حق ہے جس کو کوئی بھی اس سے چھین نہیں سکتا، حتیٰ کہ وقت کا حکمراں بھی نہیں۔

ان احکام اور واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں چار کی حد تک نکاح کرنے کی اجازت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی مرد چار عورتوں کو پکڑ کر اپنے گھر میں بند کرلے۔ یہ دوطرفہ رضامندی کا معاملہ ہے۔ وہی عورت کسی شادی شدہ مرد کے نکاح میں لائی جاسکتی ہے جو خود اس کی دوسری یا تیسری بیوی بننے پر بلا اِکراہ راضی ہو۔ اور جب یہ معاملہ تمام تر عورت کی رضامندی سے انجام پاتا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق۔ موجودہ زمانے میں آزادی انتخاب (freedom of choice) کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اسلامی قانون میں یہ قدر پوری طرح موجود ہے۔ البتہ "مساواتِ نسواں" کے علَم بردار آزادیِ انتخاب کے ہم معنی بنا دینا چاہتے ہیں۔

مسئلہ کا حل نہ کہ حکم

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عورت اور مرد کی تعداد میں نابرابری ہماری دنیا کا ایک مستقل مسئلہ ہے۔ وہ جنگ کی حالت میں بھی پایا جاتا ہے اور جنگ نہ ہونے کی حالت میں بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب دونوں صنفوں کی تعداد میں نابرابری ہے تو اس نابرابری کے مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے۔ یک زوجگی کے اصول پر عمل کرنے کے نتیجے میں جن بیوہ یا غیر بیوہ عورتوں کو شوہر نہ ملیں، وہ اپنی فطرت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کیا کریں۔ وہ سماج میں کس طرح اپنے لیے ایک باعزّت زندگی حاصل کریں۔

ایک طریقہ وہ ہے جو ہندستان کی روایات میں بتایا گیا ہے۔ یعنی ایسی (بیوہ) عورتیں اپنے آپ کو جلا کر اپنے وجود کو ختم کرلیں۔ تاکہ نہ ان کا وجود رہے اور نہ ان کے مسائل۔ یا پھر ایسی عورتیں گھر سے محروم ہو کر سڑکوں کی بے کس زندگی گزارنے پر راضی ہو جائیں۔ اس اصول پر عمل کرنے کی بنا پر ہندو سماج کا کیا حال ہوا ہے، اس کی تفصیل جاننا ہو تو انڈیا ٹوڈے (15 نومبر 1987) کی 8 صفحات کی باتصویر رپورٹ ملاحظہ فرمائیں جو اس بامعنی عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے — بیوائیں، انسانیت کا برباد شدہ ملبہ:

Widows: Wrecks of Humanity

اس حل کے بارے میں یہاں کسی مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ مجھے یہ امید نہیں کہ موجودہ زمانے میں کوئی باہوش آدمی اس طریقہ کی وکالت کرسکتا ہے یا کسی بھی درجہ میں وہ اس کو مذکورہ مسئلہ کا حل سمجھ سکتا ہے۔

دوسری صورت وہ ہے جو مغربی ملکوں کی ”مہذب سوسائٹی“ میں رائج ہے۔ یعنی کسی ایک مرد کی دوسری منکوحہ بیوی بننے پر راضی نہ ہونا، البتہ بہت سے مردوں کی غیر منکوحہ بیوی بن جانا۔

دوسری عالمی جنگ میں یورپ کے کئی ملک لڑائی میں شریک تھے۔ مثلاً جرمنی، فرانس، انگلینڈ وغیرہ۔ ان میں مرد بڑی تعداد میں مارے گئے۔ چنانچہ جنگ کے بعد مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں میں جنسی بے راہ روی عام ہوگئی۔ یہاں تک کہ بہت سی بے شوہر عورتوں کے گھروں کے سامنے اس قسم کے بورڈ لکھے ہوئے نظر آنے لگے — رات گزارنے کے لیے ایک مہمان چاہیے:

Wanted an Evening Guest.

یہ صورت حال مغرب میں جنگ کے بعد بھی مختلف صورتوں میں بدستور باقی ہے۔ اب اس کو باقی رکھنے کا سبب زیادہ تر صنعتی اور مشینی حادثات ہیں جس کی تفصیل اوپر درج کی گئی۔

غیر قانونی تعدد ازواج

جن قوموں میں تعدد ازواج کو ناپسند کیا جاتا ہے، ان کو اس کی یہ قیمت دینی پڑی کہ ان کے یہاں اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ایک چیز رائج ہوگئی جس کو مسٹریس (mistress) کہا جاتا ہے۔ ان قوموں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس فطری عمل کو روک سکیں جس کے نتیجے میں اکثر معاشرہ میں عورتوں کی تعداد زیادہ اور مردوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ ایک طرف آبادی کے تناسب میں یہ فرق اور دوسری طرف تعدد ازواج پر پابندی، اس دوطرفہ مسئلہ نے ان کے یہاں مسٹریس کی برائی (بالفاظ دیگر، غیر قانونی تعدد ازواج) کو پیدا کر دیا۔

مسٹریس (mistress) کی تعریف ویبسٹرس ڈکشنری (Webster's Dictionary) میں یہ کی گئی ہے کہ وہ عورت جو کسی مرد سے جنسی تعلق رکھے، اس کے بغیر کہ اس سے اس کا نکاح ہوا ہو:

"A woman who has sexual intercourse with and, often, is supported by a man for a more or less extended period of time without being married to him: paramour."

(*Webster's New Twentieth Century Dictionalry*, 2nd Edition, "Mistress")

مسٹریس کا یہ طریقہ آج ، بشمول ہندستان ، تمام ان ملکوں میں رائج ہے جہاں تعدد ازواج پر قانونی پابندی ہے یا سماجی طور پر اس کو برا سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تعدد ازواج کو اختیار کیا جائے یا نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آبادی میں عورتوں کی غیر متناسب تعداد کو کھپانے کے لیے قانونی تعدد ازواج کا طریقہ اختیار کیا جائے یا غیر قانونی تعدد ازواج کا۔

اسلامی طریقہ

اس کے بعد وہ طریقہ ہے جو اسلامی شریعت میں اس مسئلہ کے حل کے لیے بتایا گیا ہے۔ یعنی مخصوص شرائط کے ساتھ کچھ مردوں کے لیے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت۔

تعدد ازواج کا یہ اصول جو اسلامی شریعت میں مقرر کیا گیا ہے، وہ دراصل عورتوں کو مذکورہ بالا قسم کے بھیانک انجام سے بچانے کے لیے ہے۔ بظاہر اگر چہ یہ ایک عام حکم ہے، لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھیے کہ عملی طور پر کوئی عورت کسی مرد کی دوسری یا تیسری بیوی بننے پر ہنگامی حالات ہی میں راضی ہوسکتی ہے، نہ کہ معمول کے حالات میں، تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ حکم دراصل ایک سماجی مسئلہ کے حل کے طور پر وضع کیا گیا ہے۔ وہ فاضل عورتوں کو جنسی آوارگی سے بچا کر معقول اور مستحکم خاندانی زندگی گزارنے کا ایک انتظام ہے۔ بالفاظ دیگر یہ یک زوجگی کے مقابلہ میں تعدد ازواج کو اختیار کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ تعدد ازواج اور جنسی بربادی کے درمیان انتخاب کا مسئلہ پیدا ہونے کی صورت میں تعدد ازواج کو اختیار کرنا ہے۔

تعدد ازواج کے حکم کو اگر مجرد طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک ایسا حکم معلوم ہوگا جو مردوں کی موافقت میں بنایا گیا ہو۔ لیکن اگر اس کو سماج کی عملی صورت حال کے اعتبار سے دیکھیے تو

وہ خود عورتوں کی موافقت میں ہے۔ وہ عورتوں کے مسئلہ کا ایک زیادہ معقول اور فطری بندوبست (arrangement) ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسلام میں تعدد ازواج کی اجازت مردوں کی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک مسئلہ کو حل کرنے کی عملی تدبیر ہے۔ مردوں کے لیے ایک سے زیادہ نکاح کرنا اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ آبادی میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ تعداد میں پائی جارہی ہوں۔ اگر عورتوں کی تعداد نسبتاً زیادہ نہ ہو تو اس حکم پر عمل کرنا سرے سے ممکن نہ ہوگا۔ پھر کیا اسلام مردوں کی خواہش کی تکمیل کے لیے ایک ایسا اصول بتا سکتا ہے جو سرے سے قابل حصول اور قابل عمل ہی نہ ہو۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ تعدد ازواج کے اصول کو اختیار کرنے کی ایک وجہ جنسی تناسب میں عورتوں کی زیادتی (surplus of women) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں تعدد ازواج کی اجازت دیتی ہیں یا اس کو پسند کرتی ہیں، ان میں بھی مردوں کی بہت بڑی اکثریت فاضل عورتوں کی محدود تعداد کی وجہ سے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتی ہے:

> "Among most people who permit or prefer it, the lare majority of men live in monogamy because of the limited number of women."
>
> (*Encyclopedia Britannica,* VIII/97)

اسلام میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت بطور آئیڈیل نہیں ہے۔ یہ درحقیقت ایک عملی ضرورت (practical reason) کی وجہ سے ہے، اور وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آبادی میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس زیادہ تعداد کے باعزت حل کے لیے تعدد ازواج کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔ یہ ایک عملی حل ہے، نہ کہ نظریاتی آئیڈیل۔

خلاصۂ کلام

اوپر جو بحث کی گئی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت اگرچہ یکساں تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر بعد کو پیش آنے والے مختلف اسباب کی بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاشرے میں مردوں کی تعداد کم ہوجاتی ہے اور عورتوں کی تعداد زیادہ۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو۔ جنسی نابرابری کی ناگزیر صورت حال میں دونوں جنسوں کے درمیان صحت مند تعلق کس طرح قائم کیا جائے۔

یک زوجگی (ایک مرد، ایک عورت) کے اصولِ نکاح پر عمل کرنے کی صورت میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی عورتیں باقی رہتی ہیں جن کے لیے معاشرے میں ایسے مرد موجود نہ ہوں جن سے وہ نکاح کا تعلق قائم کرکے باعزّت زندگی گزار سکیں۔ یک زوجگی کا مطلق اصول کسی کو بظاہر خوشنما نظر آسکتا ہے، مگر واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا میں وہ پوری طرح قابل عمل نہیں۔ گویا ہمارے لیے انتخاب (choice) ایک زوجہ اور متعدد زوجہ کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ خود متعدد زوجہ کی ایک قسم اور دوسری قسم کے درمیان ہے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ یہ "فاضل" عورتیں جنسی آوارگی یا معاشرتی بربادی کے لیے چھوڑ دی جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی آزادانہ مرضی سے ایسے مردوں کے ساتھ ازواجی رشتے میں وابستہ ہوجائیں جو ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ عدل کر سکتے ہوں۔

مذکورہ بالا دو ممکن صورتوں میں سے اسلام نے دوسری صورت کا انتخاب کیا ہے۔ اور غیر اسلام نے پہلی صورت کا۔ اب ہر شخص خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ دونوں میں سے کون سا طریقہ زیادہ باعزّت اور زیادہ معقول ہے۔

حرف آخر

جدید طبقہ مسلسل یہ مطالبہ کررہا ہے کہ اسلام کے قانون معاشرت میں تبدیلی لائی جائے۔ دیندار طبقہ جب اس مطالبہ کونہیں مانتا تو یہ کہا جانے لگتا ہے کہ اسلام زمانے کی ترقی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ کیوں کہ اس کے قانون میں تبدیلی قبول کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں یہاں ہم ایک مثال نقل کریں گے۔ مسٹر موہن گروسوامی کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس (6 اپریل 1987) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"Islam, instead of being a religion which is open to popular opinion, seems to have become a religion of laws impervious to change. The recent controversy on the payment of alimony and the rigid attitude displayed by most Islamic leaders in this country is yet another instance of this imperviousness to change."

(*The Hindustan Times,* New Delhi, April 6, 1987)

اسلام، بجائے اس کے کہ وہ ایک ایسا مذہب ہو جو عوامی رائے کے لیے کھلا ہوا ہو، وہ بظاہر ایسا مذہب بن گیا ہے جس کے قوانین تبدیلی کو قبول نہ کریں۔ (مطلقہ کو) گزارہ دینے کے مسئلہ پر حالیہ نزاع اور اس ملک کے اکثر اسلامی رہنماؤں کا جامد نقطۂ نظر اختیار کرنا ایک اور مثال ہے کہ اسلام میں تبدیلی کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں (صفحہ 9)

جو لوگ اس قسم کی باتیں لکھتے ہیں، ان کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ محض سطحی طور پر ایسا لکھ دیا کرتے ہیں اس سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ کون سی دلیل ہے جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسلام کے قانون معاشرت میں تبدیلی لائی جائے۔

یہ دلیل صرف دو ہو سکتی ہے۔ ثابت شدہ علم یا تجربہ۔ زیر نظر کتاب میں جو تفصیلی مواد جمع کیا گیا ہے اس سے دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مذکورہ دعوے کے حق میں نہ حقیقی معنوں میں کوئی علم ہے اور نہ کوئی قابلِ لحاظ انسانی تجربہ۔ اس کے برعکس، علم کے تمام متعلقہ شعبے اسلام کے قانون کی نظریاتی صحت ثابت کر رہے ہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں جو معاشرتی تجربہ کیا گیا ہے اس کے نتائج غیر اختلافی طور پر بتا رہے ہیں کہ اسلام کے قانونی تصورات عین درست ہیں اور ان کے بالمقابل جو نظریات موجودہ زمانے میں اختیار کیے گئے وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے سخت ہلاکت خیز ہیں۔ ایسی حالت میں تبدیلی کا مطالبہ دوسروں سے کیا جانا چاہیے، نہ کہ اسلام سے۔

اصل مسئلہ باشعور بنانا

ایک مصنف کے بارے میں اگر کہا جائے کہ وہ انسانیت کی زیادہ بڑی خدمت اس وقت انجام دے سکتا ہے جب کہ اس کو مطالعہ کے کمرہ سے نکال کر اکھاڑے کے میدان میں لایا جائے تو یہ ایک احمقانہ بات ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک صاحب شعور ہستی ہے۔ انسان کی ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اپنے کو کتنا زیادہ باشعور بناتا ہے۔ نہ یہ کہ جسمانی طور پر وہ کس میدان میں اپنے آپ کو دوڑا رہا ہے۔

یہی بات مرد کے بارے میں صحیح ہے اور یہی بات عورت کے بارے میں بھی درست ہے۔ افریقہ میں کئی ملک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر عملاً وہاں کی سیاست اور تجارت پر عیسائی چھائے ہوئے ہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ عیسائی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ قوم ہیں اور مسلمان ابھی تک تعلیم میں آگے نہ بڑھ سکے۔

عورت کو ترقی دینے کا اصل راز یہ نہیں ہے کہ اس کو زندگی کے ہر میدان میں داخل کیا جائے۔ بلکہ اس کا اصل راز یہ ہے کہ عورت کو صاحب علم اور صاحب شعور بنایا جائے۔ عورت

جتنا زیادہ باشعور ہوگی اتنا ہی زیادہ بڑا کام وہ اس دنیا میں انجام دے سکے گی۔ عورت اگر حقیقی معنوں میں باشعور ہو تو گھر کے اندر رہ کر بھی وہ انتہائی بڑے بڑے کام انجام دے سکتی ہے۔ اور اگر وہ بے شعور ہو تو وہ کوئی بھی بڑا کام نہیں کر سکتی خواہ اس کو سب سے بڑے چوراہے پر کیوں نہ کھڑا کر دیا گیا ہو۔

تاریخ میں ایسی بہت سی عورتیں گزری ہیں جو عملاً گھر کے اندر رہیں مگر باہر کی دنیا پر انھوں نے اپنے زبردست اثرات ڈالے۔ انھیں میں سے ایک نور جہاں ہے جو مغل حکمراں جہاں گیر کی بیوی تھی۔ جہاں گیر نے اس کے بیوہ ہونے کے بعد 1611ء میں اس سے شادی کی۔ قدیم رواج کے مطابق نور جہاں زیادہ تر شاہی محل کے اندر رہتی تھی۔ مگر تمام مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ اس نے محل کے باہر کے امور میں جہاں گیر کے واسطے سے زبردست اثرات ڈالے۔

نور جہاں نے اگر چہ کئی حماقتیں کیں، اس کی سب سے بڑی حماقت یہ تھی کہ اس نے یہ کوشش کی کہ اس کا داماد (شہر یار) جہاں گیر کے بعد مغل تخت کا وارث ہو۔ جہاں گیر کے تین لڑکے تھے۔ ان میں شہزادہ خرم (شاہ جہاں) نہایت لائق تھا۔ چنانچہ جہاں گیر اسی کو اپنا سیاسی وارث بنانا چاہتا تھا۔ مگر نور جہاں نے سازش کی کہ جہاں گیر کا چھوٹا لڑکا شہر یار (جو نور جہاں کا داماد تھا) وہ جہانگیر کا وارث بنے۔ اس کے نتیجے میں آپس میں لڑائی ہوئی اور زبردست خرابیاں پیدا ہوئیں۔

تاہم اس خاص پہلو سے قطع نظر، نور جہاں کی مثال یہ ثابت کرتی ہے کہ عورت اگر لائق ہے تو وہ باہر کے امور پر کتنا زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہے۔ نور جہاں کے بارے میں یہ ثابت شدہ ہے کہ وہ خاتونِ خانہ تھی، اس کے باوجود اس نے بیرونی کارنامے انجام دیے۔

نور جہاں کے بارے میں مورخین نے جو کچھ لکھا ہے، ان میں سے صرف ایک اقتباس ہم یہاں نقل کریں گے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"Nur Jahan enjoyed great influence and authority and became a power behind the throne. Nur Jahan exercised a strong influence on her husband and looked after him with unparalleled care and devotion. Under her influence Jahangir restrained himself from excessive drinking. She relieved him of much of the drudgery of administrative routine and anxiety. She enhanced the splendour of the Mughal court and ably seconded the efforts of her husband in patronizing learning and art and disbursing charity."

(*Encyclopedia Britannica*, 9/383)

نور جہاں کو زبردست اثر اور اقتدار حاصل تھا۔ وہ تخت کے پیچھے ایک طاقت بن گئی۔ نور جہاں نے اپنے شوہر (جہاں گیر) پر زبردست اثر ڈالا اور بے مثال توجہ اور جاں نثاری کے ساتھ اس کی خبر گیری کرتی رہی۔ نور جہاں کے زیر اثر جہاں گیر نے اپنی شراب نوشی میں کمی کر دی۔ اس نے جہاں گیر کو بہت سی انتظامی مشقتوں اور پریشانیوں سے نجات دے دی۔ اس نے مغل دربار کی عظمت بڑھائی اور علم اور آرٹ اور خیراتی امور میں اپنے شوہر کی کوششوں کی نہایت قابلیت کے ساتھ مدد کی۔

تاریخ ساز کارنامہ

اسلام کی تاریخ اس الزام کی تردید ہے کہ عورتیں گھر کے اندر رہ کر بڑے بڑے کام نہیں کر سکتیں۔ اگرچہ گھر کے اندر کا جو کام ہے وہ بھی بلا شبہ بڑا کام ہے۔ تاہم باہر کے جن کاموں کو معروف طور پر بڑا کام سمجھا جاتا ہے وہ بھی یقینی طور پر عورتیں انجام دے سکتی ہیں، بغیر اس کے کہ وہ مردوں کی طرح باہر نکل آئی ہوں۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ان میں سے ایک مثال وہ ہے جس کا ذکر پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ نے کیا ہے۔

یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں تاتاریوں (منگولوں) نے اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اور اس کو آخری حد تک تباہ و برباد کرڈالا۔ مگر اس کے بعد ایک تاریخی معجزہ پیش آیا۔ وہی لوگ جو اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے وہ اسلام قبول کرکے اس کے پاسبان بن گئے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) میں تاریخ اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"Ghazan Khan (reigned 1295-1340) was able to embrace Islam amid general acceptance by his army, and his successors were all Muslims. Within less than 40 years after Hulagu's terrible invasion. his descendants had become patrons of Muslim culture."

(*Encyclopedia Britannica*, 9/933)

منگول حکمراں غازان خاں (زمانہ سلطنت 1295-1304) نے اسلام قبول کرلیا اور اس کے ساتھ اس کی تمام فوج نے بھی۔ اس کے بعد اس کے تمام جانشین مسلمان تھے۔ ہلاکو کے دہشت ناک حملہ کے 40 سال سے بھی کم عرصہ میں اس کی اولاد مسلم تہذیب کی سرپرست بن گئی۔

پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ منگول اور وحشی قبیلے جو ان کے ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے آخر کار انھیں مسلمانوں کے مذہب کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا جن کو انھوں نے اس سے پہلے اپنے پیروں کے نیچے ڈالا تھا:

"The Mongols and the savage tribes that follwed in their wake were at length brought to submit to the faith of those Muslim peoples whom they had crushed beneath their feet."

(Arnold, *The Preaching of Islam*, 1976, p. 229)

پروفیسر آرنلڈ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ دراصل عورتیں تھیں جو ان کے قبول اسلام کا سبب بنیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام کی اشاعت کا کام صرف مردوں ہی نے نہیں کیا ہے، بلکہ مسلمان عورتوں نے بھی اس مقدس کام میں حصہ لیا ہے کئی تاتاری شہزادے ایسے ہیں جنھوں نے اپنی مسلمان بیویوں کے اثر سے اسلام قبول کیا۔ غالباً یہی صورت بہت سے بت پرست ترکوں کے ساتھ پیش آئی جب کہ انھوں نے مسلم ملکوں پر حملہ کیا:

> "It is interesting to note that the propagation of Islam has not been the work of men only, but that Muslim women have also taken their part in this pious task. Several of the Monglo princes owed their conversion to the influence of a Muslim wife, and the same was probably the case with many of the pagan Turks when they had carried their raids into Muhammadan countries."

(Arnold, *The Preaching of Islam*, 1976. p. 415)

اس تاریخ ساز واقعہ کو ظہور میں لانے میں نہایت اہم حصہ مسلم خواتین نے ادا کیا ہے۔ تاتاریوں نے اسلامی خلافت کو برباد کیا تو انھوں نے پہلے قتل وغارت گری کی۔ اس کے بعد انھوں نے کثیر تعداد میں عورتوں کو گرفتار کرلیا اور ان کو اپنے گھروں میں بیویاں بنا کر رکھا۔ چنانچہ اس واقعے کے بعد اکثر تاتاری فوجیوں یا ان کے سرداروں کے گھروں میں مسلم عورتیں موجود تھیں۔

یہ مسلم عورتیں مذہبی جوش سے سرشار تھیں۔ اسلام کی حمایت کا جذبہ ان کے اندر شدت سے بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے تاتاری مردوں پر خاموشی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تارتاریوں کے دل اسلام کے حق میں نرم ہو گئے۔ اس کے بعد وہ یا تو گھر کی تبلیغ ہی سے مسلمان ہو گئے۔ یا ان کا حال یہ ہوا کہ باہر جب ان کا سابقہ

مسلمانوں سے پڑتا تو معمولی تلقین سے وہ اسلام قبول کر لیتے۔ کیوں کہ ان کے دل میں پہلے ہی سے اسلام کا بیج پڑ چکا تھا۔

یہی اکثر تاتاریوں (منگول) کا حال ہوا۔ ان کا پہلا فرماں روا جو مسلمان ہوا وہ بر کہ خان تھا۔ اس کا زمانہ حکومت 1256 سے لے کر 1267 تک ہے۔ بر کہ خاں کی ماں غالباً مسلمان تھی۔ اور اس نے بر کہ خاں کی تربیت بچپن ہی سے ایک مسلمان کی طرح کی تھی۔ تخت نشینی کے بعد بر کہ خاں کی ملاقات ایک مسلمان تاجر سے ہوئی۔ اس نے تاجر سے اسلام پر کچھ گفتگو کی اور پھر مسلمان ہو گیا۔ غازان خاں کا بھائی الجائتو 1340 میں اس کا جانشین ہوا۔ اس کی بیوی مسلمان تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا۔ یہی صورت اکثر تاتاری سرداروں اور ان کے عام فوجیوں کے ساتھ پیش آئی۔ کسی تاتاری کی بیوی مسلمان تھی اور کسی تاتاری کی ماں مسلمان۔ ان مسلم خواتین نے تاتاریوں کے دلوں میں اس طرح اسلام کی عظمت بٹھائی کہ دھیرے دھیرے سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

تقسیم کار کے اصول کے تحت اگرچہ عورت جسمانی طور پر زیادہ تر گھر کے دائرہ میں رہتی ہے۔ مگر ذہنی اور قلبی طور پر وہ اس مرد کی شریک کار ہوتی ہے جو گھر کے باہر نکلتا ہے اور باہر کے دائرہ کے کام انجام دیتا ہے۔ عورت کا تعلق مرد سے نہایت گہرا ہوتا ہے۔ وہ اس کی ساتھی، اس کی مشیر اور اس کی غم خوار ہوتی ہے۔ اس طرح وہ ہر لمحہ مرد کے تمام کاموں کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ عورت اگر گھر کے کاموں کی خود نگراں ہوتی ہے تو باہر کے کاموں کی وہ مرد کے واسطے سے نگرانی کرتی ہے۔

عورت کا تعلق دنیا کے ہر کام اور زندگی کی تمام سرگرمیوں سے ہے، 50 فی صد معاملات میں براہِ راست طور پر اور بقیہ 50 فی صد معاملات میں بالواسطہ طور پر۔ زندگی میں عورت کے رول کا معاملہ بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ مرد کا معاملہ۔ اس کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ

عورت کو جسمانی طور پر کہاں کھڑا کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا انحصار اس پر ہے کہ اس کو کتنا زیادہ باشعور بنایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کا فرق مقام عمل کے اعتبار سے ہے، نہ کہ خود عمل کے اعتبار سے۔

عورت اپنی ذات میں ایک کمزور جنس ہے۔ مگر وہ طاقت ور جنس کی طاقت ہے۔ عورت کی اسی حیثیت میں اس کی طاقت کا راز چھپا ہوا ہے۔

معیار کی غلطی

عورت اور مرد کے معاملہ کو اگر "تقسیم کار" کے عنوان کے تحت دیکھا جائے تو دونوں ایک دوسرے کے مساوی نظر آئیں گے۔ اس کے برعکس، اگر عورت اور مرد کے معاملہ کو "یکسانیت کار" کے عنوان کے تحت دیکھا جائے تو مرد برتر نظر آئے گا اور عورت کمتر کیوں کہ حیاتیات کے اعتبار سے دونوں کے درمیان یکسانیت ممکن نہیں۔

موجودہ زمانے میں مساوات مرد وزن کے حامیوں نے جب یہ دیکھا کہ عورت اور مرد کے درمیان حیاتیاتی فرق ہے اور اس بنا پر عورت کا یکساں عمل کے معیار پر پورا اترنا ممکن نہیں، تو انھوں نے اپنے معیار پر نظر ثانی کرنے کے بجائے یہ کیا کہ اپنی ناکامی کی بے اصل توجیہات تلاش کرنے لگے۔ اگر وہ اپنے معیار پر نظر ثانی کرتے تو صرف ان کے مفروضہ معیار پر زد پڑتی۔ مگر جب انھوں نے اپنے معیار پر نظر ثانی نہیں کی تو اس کا شکار خود عورت کو ہونا پڑا۔ مثلاً ایک گروہ وہ ہے جو اس واقعے کی توجیہ ڈارونزم کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے — عورتیں ارتقاء کے عمل میں ابتدائی درجہ پر باقی رہ گئیں۔ جیسا کہ ڈارون نے کہا ہے کہ مرد بالآخر عورت کے اوپر فائق ہو گیا:

"Women remained at a more primitive stage of evolution. As Darwin himself put it, "Man has ultimately become superior to woman."

(*Time*, 3 March 1987, p. 42)

مرد کے مقابلے میں عورت کا فرق فطری بندوبست کا نتیجہ تھا، مگر مذکورہ توجیہ نے اس فرق کو عورت کی فطری پسماندگی کے ہم معنی ٹھہرایا۔ اور اس طرح عورت کو ایک مستقل احساس کمتری میں مبتلا کردیا۔ جدید نسوانی نظریہ کا یہ انجام اس کے غیر حقیقی ہونے کا ایسا ثبوت ہے جس کے بعد کسی مزید ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں۔

خاتونِ اسلام

عزت اور احترام کے جو احکام ایک صِنف کے لیے ہیں، وہی دوسری صِنف کے لیے بھی ہیں۔ دنیا کے حقوق اور آخرت کے انعامات میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں، البتہ اسلام کے نزدیک مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ زندگی کا نظام چلانے میں دونوں برابر کے شریک ہیں، تاہم فطری فرق کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام نے دونوں کے درمیان تقسیمِ کار کا اصول رکھا ہے، نہ کہ یکسانیتِ کار کا اصول۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN 978-81-7898-727-9

9 788178 987279

₹ 85